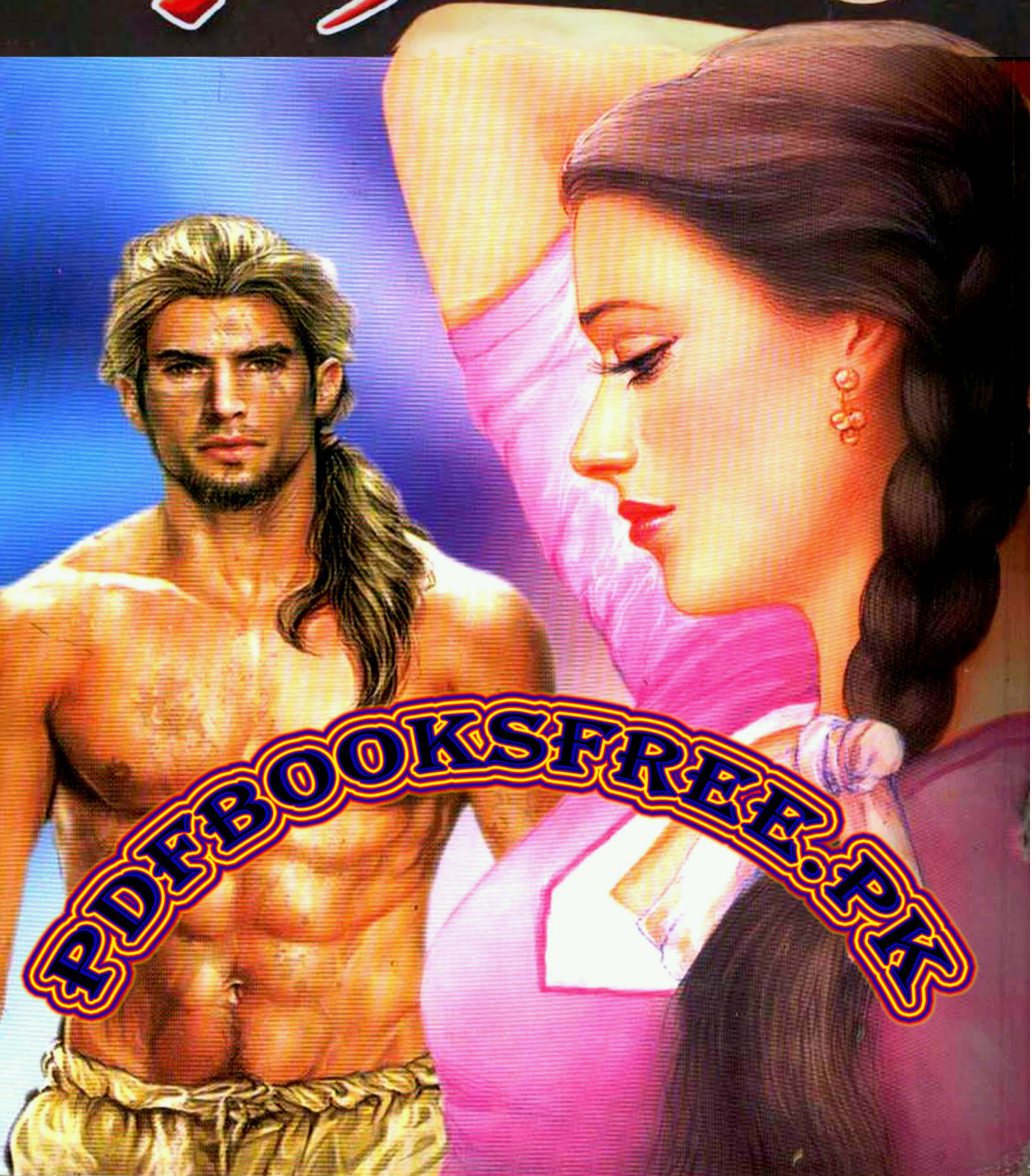


ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

19

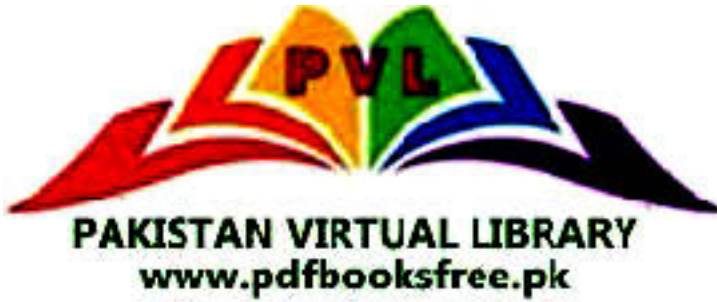


ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تھلکہ خیز کہانی

سراب

انیسواں حصہ

راوی: شہباز ملک



احباب ادب پبلشرز
اردو بازار لاہور

اے اللہ ہمارے علم میں اضافہ فرما آمین!

خوبصورت اور معیاری کتابیں.....

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اشاعت ————— اول
مطبع ————— یو این ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ————— میزان کمپوزنگ۔ لاہور
قیمت ————— 250 روپے
بیرون ملک ————— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر

ملنے کے پتے

اشرف بک ایجنسی اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
سعید بک بینک جناح سپر مارکیٹ، اسلام آباد
مختار برادرز امین پور بازار، فیصل آباد
کلاسک بکس اندرون بوہریٹ، ملتان
علی بک سٹال نسبت روڈ، چوک میوہ پتال، لاہور

خزینہ علم و ادب الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
دعا پبلشرز الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
رشید نیوز ایجنسی فریئر مارکیٹ، فریئر روڈ۔ کراچی
ویکم بک پورٹ مین اردو بازار، کراچی
فرید پبلشرز مین اردو بازار، کراچی

ہم اس غار سے نکل کر قلعہ کی جانب چلنے لگے۔ اب سامیر معمول کے مطابق قدم اٹھا رہی تھی۔ جلد بازی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن خاموشی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی چپ چاپ چل رہی تھی۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے قلعہ تک پہنچے۔

اندر داخل ہوئے تو راجا صاحب منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا۔ ”کیا رہا؟ برف والے سے بات ہوئی؟“

”جی ہاں ہوئی۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے اس علاقے سے نکل جانا ہے۔ اب یہ بتائیں کہ عبداللہ کو چھوڑ جاؤں یا ساتھ لے جاؤں۔“

”ابھی میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ اس سے پوچھ لو اگر وہ رہنا چاہتا ہے تو بتا دینا کہ تمام عمر یہیں گزارنی ہوگی۔ تمہیں برف والے نے خود بلایا تھا۔ تمہارا سہارا لے کر میں بھی آ گیا لیکن اب کوئی اور نہ یہاں آ سکے گا اور نہ باہر جاسکے گا۔“

”جی میں بتا دوں گا۔ ویسے یہ بتا دوں وہاں کوئی اس کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ ایک لڑکی جس سے اس نے خاموش زبان سے شادی کا وعدہ کیا ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ تب تو اسے ہر حال میں چلے جانا چاہیے۔“ راجا صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

”اچھا تو مجھے اجازت دیں۔ میں وسیم وغیرہ کو بھی خوش خبری سنا دوں۔“

”ٹھیک ہے جاؤ لیکن جانے سے قبل مجھ سے مل ضرور لینا۔“

”جی اچھا۔“ کہہ کر میں باہر آ گیا۔ اور سیدھا اس کمرے میں پہنچا جہاں سفیر، وسیم اور عبداللہ سو رہے

تھے۔

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ تینوں بے خبر سو رہے تھے۔ شاید یہ

تھکن کا نتیجہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے عبداللہ کو اٹھایا۔

”ہم رات کے آخری پہر میں یہاں سے نکل رہے ہیں۔ راجا صاحب اب یہیں رہیں گے وہ ہمارے

ساتھ نہیں جا رہے۔ اب وہ تا عمر یہیں رہیں گے۔ تم اپنا ارادہ بتاؤ کہ تم یہاں رہو گے یا ساتھ چلو گے؟“

”راجا صاحب کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔“

”ان کا ارادہ میں نے بتا دیا۔ اب اگر یہاں ٹھہرو گے تو پھر کبھی بھی اپنی دنیا میں جا نہیں پاؤ گے۔ اچھی طرح غور کر لو۔“

”راجا صاحب کا کیا کہنا ہے؟“

”انہوں نے فیصلے کا کلی اختیار تمہیں دیا ہے۔ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ زندگی بھر کے لیے یہاں رہو گے یا میرے ساتھ چلو گے۔“

عبداللہ سوچ میں ڈوب گیا۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ وسیم جو نہ جانے کب بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے چٹکی لی۔ ”یہ بھی یاد رکھنا کہ کوئی تمہارے انتظار میں وہاں بیٹھا گھڑیاں گن رہا ہے۔ پھر گانے کے انداز میں بولا۔ ”دناں دناں میں گنوں کب آئیں گے سانوریا۔ پھر آنکھ دبا کر کہا یہ گانا بھی کوئی گارہا ہوگا۔“

”ہاں میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا لیکن ایک بار راجا صاحب سے میں خود بھی پوچھ لوں۔“

”بالکل جاؤ..... وہ تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“

عبداللہ کمرے سے نکل گیا۔

میں نے وسیم سے کہا۔ ”اب تم بھی تیاری کر لو۔ آج اگر ہم یہاں سے نہیں نکلے تو پھر یہیں زندگی گزارنی پڑے گی۔“

”بھائی میاں میں اپنی اکلوتی بیوی کا اکلوتا شوہر ہوں۔ تمہاری محبت میں اس پر اسرار وادی میں آیا تھا۔ میرا بس چلے تو ابھی جا کر سادی سے کہوں کہ یہ تمہارے شہباز بھائی نے مجھے تم سے دور کر رکھا تھا۔“ وسیم چہکا۔

”کچھ تیاری کرنا ہے کیا؟“

”تیاری کیا کروں گا؟ یہاں کی ایسی کوئی مٹھائی ہے نہیں جو بطور تحفہ لے جاؤں۔ تم نے ہارن بھی لینے نہیں دیا ورنہ میرا ارادہ تو تھا کہ ایک دو ہارن لے جاؤں گا۔“

”ہارن کی ابھی خون آشامی دیکھی نہیں ہے نا۔ وہ انسان کو درمیان سے چیر دیتا ہے۔ کاغذ کی طرح پھاڑ کر ٹکروں میں بانٹ دیتا ہے۔“

”ڈراؤ نہیں۔ اب تو یوں بھی وہ ملنے سے رہا اس لیے خوشگوار یادیں ہی رہنے دو۔“

”خوشگوار یادوں کا بستہ لپیٹو اور چلنے کی تیاری کرو۔“ کہہ کر میں نے سفیر کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے کہا۔ ”لیکن یہاں سے نکلا کیسے جائے گا؟“

”اس کا انتظام کر لیا ہے۔“

”کیا اسی بے ہنگم جانور کی پیٹھ پر بیٹھ کر چلنا ہے؟“ سفیر نے انگڑائی لے کر کہا۔

”جی نہیں..... اللہ تعالیٰ نے دو پیر دیئے ہیں انہی کے سہارے چلتے ہوئے اپنی دنیا میں جائیں گے۔“

”اُف یا آتے وقت جتنی پریشانیاں جھیلی ہیں ان سب کو تم نے یاد کرا دیا۔“ سفیر نے پیشانی پر ہاتھ

مارتے ہوئے کسی بوڑھی بیوہ کے لہجے میں جواب دیا۔

”تو پھر ایک کام کرو۔ تم یہیں ٹھہر جاؤ میں وہاں پہنچ کر مونا سے کہہ دوں گا کہ وہ حضرت ایک لڑکی کے ساتھ چہل قدمی میں مصروف تھے۔ میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”پھر کیا ہوگا جانتے ہو۔ وہ کے ٹوپر جا کر کھڑی ہو جائے گی اور اتنی زور سے آواز دے گی کہ تمام گلیشیر پھٹ کر وادی کا راستہ دکھا دیں گے۔ اور وہ وادی میں اترنے کے ساتھ سامیرا کے ساتھ تمام خواتین کو گولی مار دے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کی افزائش نسل رک جائے اس لیے جیسا تم کہو میں تیار پاؤں گے۔“

”تو پھر تیاری شروع کر دو۔“ کہہ کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔

باہر نکل کر دیکھا کہ ایرٹ۔ ریک، ایزارٹ، ایمار اور رائیون اور ویر جمع ہیں۔ ان سب کے چہرے سے ہوتے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کیا بات ہے۔ تم لوگ اس طرح افسردہ کیوں کھڑے ہو؟“

رویر آگے بڑھی اور پھر وہ کسی امرتیل کی طرح مجھ سے چمٹ گئی۔ اس نے زور زور سے رونا بھی شروع کر دیا تھا۔ میں نے گھبرا کر اسے الگ کیا پھر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ اس طرح رو کیوں رہی ہو؟“

”ملکہ عالیہ کا ایک ہرکارہ آیا تھا اس نے ہر ایک کو یہ خبر سنائی ہے۔ ہم سب جو بھی جہاں تھا دوڑتا چلا آیا ہے۔“

”ایسی کون سی خبر سنائی؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”اس نے بتایا ہے کہ..... کہ آپ جا رہے ہیں۔“ اس نے پھر رونا شروع کر دیا تھا۔

”عقل سے کام لو رو ویر..... میری دنیا اور ہے۔ میرا ایک گھر ہے۔ میرے ماں باپ ہیں۔ بھائی بہن ہیں۔ میں ان سب کو چھوڑ کر یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ میرے ساتھی کیوں آئے۔ دراصل میرے دل میں اپنوں کی یاد جگانے کے لیے ہی برف والے نے ان کو بلایا ہے۔ تبھی تو برف والے نے اتنی جلدی واپس جانے کا انتظام کر دیا۔“ میں نے دانستہ برف والے کا نام لیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ برف والے کا نام آنے کے بعد کوئی بھی کچھ نہیں بولے گا اس لیے کہ وہ سب جانتے ہیں کہ اگر برف والے کے کسی کام میں مداخلت کی گئی تو گناہ عظیم ہوگا۔ انہیں غیب سے سزا ملے گی۔ وہ اسی لیے کچھ نہ بولے لیکن ان کی اداسی کم نہ ہوئی۔ میں نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر رویر سے کہا۔ ”تم میری ایک بات مانو گی؟“

”بولیں، ضرور مانوں گی۔“

”ایرٹ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اسے اپنالو۔“

ایرٹ نے اپنی جھکی ہوئی نم آنکھیں اٹھا کر رویر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی شمع جل اٹھی تھی۔ اسی وقت رویر نے اسے دیکھا اور دو قدم آگے بڑھی پھر اس نے ایرٹ کا ہاتھ تھام لیا۔ رویر کے اس فیصلے نے مجھے خوش کر دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ہمارے ہاں اسی طرح سے دعا دی جاتی ہے۔ تم تا عمر خوش رہو۔ میں تمہیں کبھی بھی بھول نہ سکوں گا۔“

رویر اب بھی سسک رہی تھی میں نے اس کے آنسو پونچھ کر کہا۔ ”اب اگر روئی تو مجھے چوٹ پہنچے گی۔“

میں ایک ہوا کا جھونکا تھا جو آیا اور چلا گیا۔ اب یہ تم لوگوں کی زندگی ہے اسے ہنسی خوشی گزارو۔ میں جانتا ہوں تم لوگوں کو بھول نہیں پاؤں گا لیکن مجبوری ہے اس لیے جانا ہی پڑے گا۔“

ان سب کو الوداع کر کے میں راجا صاحب کے پاس آیا۔ انہوں نے ایک چیک بک مجھے دے کر کہا۔ ”یہ میں لے کر آیا تھا لیکن اب میرے لیے بیکار ہے۔ اس اکاؤنٹ میں دو کروڑ سے زیادہ کی رقم ہے۔ مجھے امید ہے اسے تم اچھی جگہ خرچ کرو گے۔ تمام بیج پر دستخط کر دیئے ہیں، تم تھوڑا تھوڑا کر کے نکال لینا لیکن یہ کام جلد کرنا ایسا نہ ہو کہ میرے غائب ہونے کی خبر پھیلے اور بینک اکاؤنٹ سیز کر دے۔“

میں نے چیک لے لیا۔ سامیرا نے دو قیمتی ہیرے دیئے کہ اسے تم میری طرف سے اپنی دلہن کو دینا۔ اس سے کہنا ایک اجنبی دنیا میں تمہیں یاد کرنے والی کوئی ہے۔“ وہ منہ پھیر کر رونے لگی۔ وہ لاکھ بہادر سہی پوری وادی کی ملکہ سہی مگر عورت کی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس پر بلک اٹھتی ہے۔ میں اس سے نظر ملائے بغیر باہر نکل آیا۔

سفیر وغیرہ تیار ہو کر کھڑے تھے۔ ہم چاروں اسی غار کی طرف چلنے لگے۔ راستے بھر ہم سب خاموش رہے۔ اگر میں بولنا بھی چاہتا تو بول نہیں پاتا۔ قدم کہیں اٹھ رہے تھے ذہن کہیں تھا۔ ان معصوم لوگوں کی محبت کا سرمایہ میرے ساتھ تھا۔ ان سب کے چہرے نظروں میں تھے۔ ان سب کو یاد کرتا ہوا میں اس غار کے نزدیک پہنچ گیا۔ پھر غار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی وہ راستہ ہے جس سے گزر کر ہمیں اپنی دنیا میں جانا ہے لیکن کیسے یہ مجھے بھی پتا نہیں۔“

وہ سب بھی میرے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ ابھی رات کا پہلا پہر ختم ہوا تھا۔ برف والے نے کہا تھا کہ پچھلے پہر آنا۔ ہم آگئے تھے اس لیے ان سب کے ساتھ اس غار کے صاف ستھرے فرش پر بیٹھ گئے۔ ”ہم تو آگے جانے کے لیے آئے ہیں اور تم بیٹھ گئے۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی؟“ سفیر نے کہا۔ ”ہمیں آگے جانا ہے اور راستہ یہیں سے ہے لیکن اس غار میں کہاں ہے یہ مجھے پتا نہیں۔ اس لیے ہمیں یہاں بیٹھ کر انتظار کرنا ہے۔“

”کس کا؟“ سفیر نے دوسرا سوال کیا۔ عبد اللہ اپنی عادت کے مطابق خاموش تھا۔

میں نے عبد اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمارا مددگار برف والا ہے۔ اس پر اسرار وادی سے نکلنے کا راستہ وہی بتائے گا۔ اس نے کہا تھا کہ رات کے آخری پہر میں آنا اور ہم بہت پہلے آگے ہیں۔ اس لیے آرام کر لیتے ہیں۔“ کہہ کر میں دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ باقی دوستوں نے بھی فوراً اپنے اپنے تھکے ہوئے جسم کو زمین پر ڈال دیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ ابھی میں نیم دراز ہوا ہی تھا کہ آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں سو گیا۔

پتا نہیں کتنا وقت گزرا تھا کہ مجھے سردی کا احساس ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں پٹپٹائیں اور پھر پوری طرح کھول دیں۔ سفیر، وسیم اور عبد اللہ بے خبر سو رہے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ وہ غار نہیں تھا جہاں ہم سوئے تھے۔ یہ غار کسی بر فیلے علاقے کا تھا اس لیے کہ زبردست سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوا جسم کو چھید رہی تھی۔ غار صاف ستھرا ضرور تھا لیکن ویسا نہیں جیسا ہم دیکھ آئے تھے۔ حیرت کی ایک بات اور تھی۔ ایک کونے میں کپڑے کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا۔ میں اس ڈھیر کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچتے ہی حیرت دوچند ہو گئی اس لیے کہ

یہ میرے وہ کپڑے تھے جو میں ڈیوڈ شا کے ساتھ آتے ہوئے کھو بیٹھا تھا۔ کپڑوں کے نیچے میرا موبائل اور اسلحہ بھی تھا۔ کچھ اور کپڑے بھی تھے۔ میں نے ان سب کا جائزہ لے کر گرم جیکٹ اور شوز پہن لیے۔ اسلحہ اور موبائل قبضے میں لیا پھر جا کر سفیر کو اٹھایا۔ اٹھتے ہی اس کی حالت بھی میرے ایسی تھی۔ وسیم کو اٹھایا تو وہ بھی ایسے ہی حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ ہوا کا سرد جھونکا آیا تو میں نے ان سے کہا۔ ”اس کو نے میں کپڑے ہیں۔ وہ پہن لو ورنہ سردی مزاج پوچھنے لگے گی۔“

”پوچھنے گی..... وہ پوچھ رہی ہے کہ یہاں کیوں آ گئے۔ اب آ ہی گئے ہو تو سردی کا مقابلہ کرو۔“ سفیر نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔

”مجھے کیا پتھر کا سمجھ لیا ہے۔ میرے کپڑے کہاں ہیں..... یہ والا کوٹ ادھر بڑھاؤ..... یہ تو وہی کوٹ ہے جو ہم جاتے ہوئے پہنے ہوئے تھے۔“ وسیم نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

”کپڑے پہن کر باہر کا جائزہ لو۔ ہمیں دیکھنا ہو گا کہ ہم کہاں ہیں۔“ میں نے ان لوگوں سے کہا اور باہر کی سمت بڑھا۔

باہر نکل کر دیکھا۔ دور دور تک برف کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ حدنگاہ تک برف پوش پہاڑ تھے۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے یہ علاقہ پہچانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ ایسی کوئی نشانی نظر نہیں آرہی تھی جس سے پتا چلتا کہ یہ علاقہ کون سا ہے اس لیے کہ برف پوش پہاڑوں پر ہر جگہ ایک سا منظر رہتا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں ایسے علاقوں سے گزر چکا ہوں۔ نیپال سے چین میں داخل ہوا تھا۔ وہ ابھی ایسے ہی پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ انڈیا سے جب واپس پاکستان آ رہا تھا اس وقت بھی ایسے ہی پہاڑوں سے ہو کر گزرا تھا۔ ڈیوڈ شا کے ساتھ جب اس سفر پر آ رہا تھا تو بھی ایسے ہی علاقوں سے ہو کر آیا تھا، اس لیے کہا نہیں جاسکتا تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ ابھی میں باہر کھڑا ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ سفیر بھی اندر سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”واہ کیا کہنے تمہارا برف والا تو کمال کا جادوگر ہے۔ ایک رات میں ہمیں پاکستان پہنچا دیا۔“

”تم نے کیسے پہچانا کہ یہ پاکستانی علاقہ ہے۔ یہاں ایسی کوئی نشانی بھی نہیں ہے کہ اس سے سمجھ لیا جائے کہ یہ پاکستانی علاقہ ہے۔“

”میرا دعویٰ ہے کہ یہ بلتستان کا علاقہ ہے۔ جاتے وقت ہم اسی راستے سے گئے تھے۔ ادھر دیکھو وہ دور تین پہاڑ پاس پاس نظر آرہے ہیں نایہ تینوں تبت کے علاقے میں ہیں۔ یہ بات راجا صاحب نے بتائی تھی۔ ان پہاڑوں کی شکل کچھ ایسی ہے کہ یاد رہے گی۔“ سفیر نے کہا۔

”ہاں مجھے بھی یاد آ رہا ہے کہ یہ تین پہاڑ میں نے بھی دیکھے تھے۔“ عقب سے وسیم کی آواز آئی تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ وسیم اور عبداللہ بھی اسی کوٹ میں لپٹے کھڑے تھے۔

”میری سمجھ میں نہیں آیا، کہ یہ برف والا ہے کیا چیز..... اس کا ہر کام منفرد ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی بہت پہنچا ہوا بابا ہے۔ اس کے قبضے میں کوئی جن بھوت ہے..... کاش میں اس سے کوئی تعویذ لے لیتا۔“ سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”واقعی میں خود بھی سمجھ نہیں پایا کہ وہ ہے کیا چیز۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ کس بھیس میں کون ہے کوئی

نہیں جانتا..... ہماری دنیا میں بھی ایسے بہت سے کردار ملیں گے جو اپنے آپ میں الجھا ہوا سوال ہوتے ہیں۔“
میں نے جواب دیا۔“ ایسی ایسی کرامت والی ہستیاں ہوتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔“
”آپ کے خیال میں وہ برف والا کیا چیز ہے؟ کوئی ولی اللہ یا کوئی جادوگر؟“
”اس بارے میں میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ جس کا علم نہ ہو اس پر میں بحث نہیں کرتا۔“ کہہ کر میں نے بات ختم کر دی۔

”اگر حضور والا اس لایعنی بحث سے فارغ ہو چکے ہیں تو اب اس بات پر بھی غور کر لیں کہ ہمیں آگے بھی جانا ہے۔ اگر ہم یہاں سے نکلتے ہیں تو کس رخ پر آگے بڑھنا ہے۔ اس لیے کہ یہاں سے وہاں تک صرف میدان ہی میدان نظر آرہا ہے اور کون سی سمت میں ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ یہ میرا ہمزاد نہیں بتانے والا۔“ وسیم نے دخل دیا۔

”وسیم صاحب کی بات میں دم ہے۔“ عبد اللہ بولا۔ ”ہمارا خیال ہے کہ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ یہاں بیٹھے رہنے سے فائدہ کچھ نہیں۔“

”عبد اللہ کی بات صحیح ہے۔ سورج نکلنے ہی والا ہے۔ ہمیں آگے چل دینا چاہیے۔“ میں نے عبد اللہ کی تائید کر دی۔

”تو پھر اپنے سامان اٹھالوں.....؟“ وسیم نے پوچھا۔

”سامان کی تلاشی لے لو۔ ہمارے خیال سے اس میں رستی آنکھیں، ہتھوڑے وغیرہ بھی ہوں گے۔“ میں نے کہا تو اس نے سامان کی تلاشی لی۔ واقعی وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو میں اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔ ڈیوڈ شنا نے ہی وہ چیزیں دی تھیں۔ میں نے سیاہ شیشے کی عینک لگا کر دوسری سفیر کی طرف بڑھادی۔

”محترم جناب یہ گوگلز میرے سامان میں بھی ہونی چاہیے۔“ کہہ کر وسیم نے اپنے بیگ کو ٹٹولا۔ اس میں سے عینک نکال کر پہنتے ہوئے عبد اللہ سے بولا۔ ”تم بھی اپنے بیگ میں دیکھ لو..... یہ برف والا ایماندار ثابت ہوا ہے۔ ہمارے بیگ کی ایک ایک چیز لوٹادی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ بیگ کھو گئے ہیں لیکن وہ کھوئے نہیں تھے، برف والے نے امانت رکھ لیے تھے۔“

عبد اللہ نے اپنے بیگ سے ضروری چیزیں نکالیں پھر رستی کا گچھا نکال کر بولا۔ ”ہم آتے وقت اس رستی سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ اب بھی آگے بڑھنے کے لیے ان کا سہارا لینا ضروری ہے۔“
”تمہاری بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں قدم قدم پر کھائیاں اور غار ہیں جو برف تلے دبے ہوئے ہیں۔ وزن سے اس پر جمی برف ٹوٹتی ہے تو موت اپنے پنجے بڑھا دیتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
”اب کرنا کیا ہے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”عبد اللہ کی بات پر عمل کرنا ہے۔ آگے بڑھتے ہیں، کوئی نہ کوئی بستی تو مل ہی جائے گی۔“ میں نے کہا اور عبد اللہ کے ہاتھ سے رستی کا گچھا لے کر ایک سرا اپنی کمر میں باندھا اسی سے سفیر نے خود کو منسلک کیا، سفیر کے بعد عبد اللہ نے اپنے بلٹ کو رستی سے جوڑ دیا۔ آخر میں وسیم نے خود کو اس رستی سے جوڑا گویا ہم سب ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے تھے۔ سب نے اپنے اپنے ہاتھوں میں کلبھاڑی پکڑ لی تھی۔ ہم نے بیگ سے آہنی میخیں بھی

نکال لی تھیں۔ ہم سب نے اپنے درمیان چار چار فٹ کا فاصلہ رکھا تھا۔ اپنے اپنے بیگ سب نے پیٹھ پر لاد لیے تھے اس طرح ہم سب آگے پیچھے سیدھ میں بڑھنے لگے گویا اس طرح ہمارا سفر شروع ہوا۔

برف نرم اور بھر بھری تھی۔ بوٹ بار بار برف کے ذرات والی زمین میں دھنس رہے تھے۔ ہم سب اسی حالت میں آگے بڑھے۔ سب سے آگے میں تھا اس لیے خطرہ بھی مجھے زیادہ تھا کہ جگہ جگہ برف تلے گڑھے ہو سکتے تھے جس پر پیر پڑتے ہی برف کی تہہ ٹوٹی اور اس میں دفن ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہا تھا۔ ہم نے دور نظر آنے والے تین پہاڑوں کی چوٹیوں کو نظروں میں رکھ کر سفر کا آغاز کیا تھا تا کہ ہم اس کے داہنے جانب بڑھتے رہیں اس طرح ہم پامیر تک پہنچ سکتے تھے۔ لیکن یہ راستہ اس لیے بھی خطرناک تھا کہ آئس سلائیڈنگ کا خطرہ بنا ہوا تھا۔ کسی بھی وقت برف کا طوفان بھی اٹھ سکتا تھا۔ ہم سب آگے پیچھے قطار میں آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ ایک جگہ مجھے برف کچھ زیادہ ہی نرم نظر آئی اور میں نے جلدی سے قدم آگے بڑھا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ سب کو ہوشیار کیا کہ یہاں کوئی کھائی یا غار کا دہانہ ہے لیکن دیر ہو چکی تھی۔ سفیر تو پار کر گیا لیکن وسیم لڑکھڑایا۔ ہم کچھ سمجھتے کہ کیا ہوا ہے اس سے پہلے ہی اس کے کمرے میں لگی بیلٹ ٹوٹی۔ رسی ڈھیلی پڑی اور وہ برف میں دھنستا چلا گیا۔



حد نظر برف ہی برف تھی۔ اس برف کے میدان میں چلتے ہوئے پیر دھنس رہے تھے۔ ہم سب نے خود کو ایک رستی سے منسلک کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ رستی دراز کرتا ہے تو بندہ بھکنے لگتا ہے اور یہاں رستی دراز نہ کی جاتی تو کوئی آگے بڑھ نہ پاتا اس لیے کہ سب ایک ہی رستی سے بندھے ہوئے تھے۔ سب سے آگے میں تھا۔ میرے پیچھے عبداللہ۔ اس کے پیچھے سفیر اور آخر میں وسیم۔ اس طریقہ کار کو تمام کوہ پیما پسند کرتے ہیں کہ ایک سے دوسرے کو سہارا ملتا ہے۔ یہاں تو سہارے کی زیادہ ضرورت تھی۔ اس لیے کہ یہ خطہ حد سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہاں وہاں ہر طرف کھڈے تھے۔ غار تھے جن کے منہ پر برف جمی ہوئی تھی اور اگر غلطی سے کسی ایسی غار کے دہانے پر پیر پڑ جاتا تو پھر ملک عدم کا ٹکٹ بہ آسانی کٹ جاتا۔ ایسے خطروں کی پہچان میں بہ آسانی کر لیتا تھا اسی لیے میں سب سے آگے تھا۔ بغور زمین کا جائزہ لے کر قدم رکھتا تھا۔ میرا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کے مصداق تھا۔ ابھی میں نے قدم آگے بڑھائے تھے کہ مجھے احساس ہو گیا کہ اس جگہ کی برف کچھ زیادہ ہی نرم ہے۔ اور ایسا تبھی محسوس ہوتا ہے جب نیچے کوئی غار ہو یا گہری کھائی کا سرا ہو۔ اسی لیے میں نے اس جگہ کو چھلانگ لگا کر پار کرتے ہوئے دوسروں کو بھی ہوشیار کیا مگر دیر ہو چکی تھی۔ عبداللہ اور سفیر نے تو دیکھا دیکھی چھلانگ لگا کر پار کیا مگر وسیم سنبھل نہ سکا اس کا پیر بھر بھری برف پر پڑا، پیر پڑتے ہی پوری پرت پھٹی اور وہ گرتا چلا گیا۔ گرتے ہوئے اس نے چیخ ماری تھی گو کہ اس کی چیخ اتنی تیز نہیں تھی پھر بھی سب دہل گئے تھے۔ اس پرستم یہ کہ رستی بھی روک نہ سکی تھی کیوں کہ جھکا لگنے سے وہ رستی تنی تھی اور بیلٹ کا کنڈا نکل گیا تھا۔ شاید اسے صحیح طور پر وسیم نے لگایا نہیں تھا ورنہ بیلٹ کی پکڑ بہت مضبوط ہوتی ہے، اسے اسی لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ گرنے والے کو گرنے نہ دے۔

جھکے سے ہم تینوں ہی لڑکھڑا گئے تھے۔ مگر فوراً ہی سنبھل گئے۔ میں نے زوردار آواز میں اسے پکارا۔

”وسیم.....وسیم۔“

جواب بھی فوراً آ گیا۔ ”میں یہاں ہوں محفوظ ہوں، کوئی چوٹ و وٹ بھی نہیں لگی ہے..... شاید یہ کوئی غار ہے۔“

اس گڑھے میں جھانکنے کے لیے میں نے اوندھے منہ لیٹ جانا مناسب سمجھا اور سینے کے بل ریگتا ہوا اس گڑھے کے قریب پہنچا پھر نیچے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

وہ گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ وسیم اس گڑھے میں کھڑا اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں رستی پھینک رہا ہوں تم اس کے سہارے اوپر آنے کی کوشش کرنا۔“ کہہ کر میں نے اپنے کمر سے رستی نکال کر دوسروں کو بھی ہک نکالنے کا اشارہ کیا۔ سفیر اور عبداللہ نے فوراً تعمیل کی۔ میں نے رستی اندر لٹکائی تھی کہ وسیم نے کہا:

”ایک منٹ مجھے دیکھنے دیں۔ یہ غار سیدھا آگے بڑھ رہا ہے۔ میں ذرا آگے تک کا جائزہ لے لوں۔“ کہہ کر وہ سیدھے ہاتھ بڑھا۔

میں نے سفیر کی طرف رخ کر کے کہا۔ ”غار کتنا لمبا ہے یہ وہ دیکھنے گیا ہے۔“

”اوپر آسمان کی طرف دیکھیں۔“ سفیر نے میری توجہ مبذول کرائی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شمال کی جانب سے سیاہ بادل اٹھ رہے تھے۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں چین کی طرف جانے کے لیے نیپال سے چلا تھا تو میتو کی محبوبہ نے ایسے ہی بادل دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ایک خطرناک بات ہے۔ ایسے سیاہ بادل آئیں تو سمجھ لینا کہ کوئی غلط بات ہونے والی ہے۔ ایسا طوفان آنے والا ہے جو تباہی پھیلاتا ہے۔ برف کے ذرات ہی نہیں اڑاتا، بڑے بڑے تودے بھی اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اسی بات نے مجھے فکر میں ڈال دیا تھا کہ اگر طوفان آ گیا تو کیا ہوگا؟ یہاں ایسی کوئی جگہ بھی نظر نہیں آرہی تھی جہاں ہم پناہ کی خاطر بیٹھ سکتے۔ میں فکر کے گرداب میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ سفیر کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

”وسیم کا کوئی جواب آیا۔ بادل گہرے ہو رہے ہیں۔“

”میں خود پریشان ہو گیا ہوں اس لیے کہ جنہیں تو بادل سمجھ رہا ہے یہ بادل نہیں ہیں۔ یہ برف کے ذرات ہیں اور دور تک اوپر اٹھ رہے ہیں اس لیے پہاڑ کی چوٹیوں پر سایہ سا آ رہا ہے جس کی وجہ سے وہ سیاہ دکھائی دے رہے ہیں۔ ہمیں جلد از جلد کوئی پناہ گاہ ڈھونڈنی پڑے گی۔“

”اتنی جلدی کوئی اور پناہ گاہ ملنے سے رہی۔ کیوں نا ایسا کیا جائے کہ ہم بھی اس غار میں اتر جائیں اور جب طوفان گزر جائے تو باہر نکل آئیں۔“ عبداللہ نے مشورہ دیا۔

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ اتنی جلدی اور کوئی پناہ گاہ ملنے سے رہی۔ وسیم کے بقول، یہ غار سرنگ نما ہے اور دور تک جارہا ہے۔ غار کے دہانے سے زمین تک زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے ہم باہر نکل سکتے تھے۔

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ طوفان جس رفتار سے بڑھ رہا تھا یہ اب تب میں ہم تک پہنچ جاتا اس لیے کہ اب سیاہی معدوم ہو چکی تھی اور ہوا میں اڑتے ذرات صاف نظر آرہے تھے۔ دیر کرنا مناسب بھی نہیں تھا اس لیے میں نے غار میں چھلانگ لگا دی۔ اندر گرتے ہی میں نے منہ اوپر کر کے کہا۔ ”اب تم دونوں میں سے کوئی ایک

کودے۔ پہلے عبداللہ کو دا پھر سفیر۔ ہم تینوں نے اس جانب بڑھنا شروع کر دیا جس طرف ایک سرنگ نظر آرہی تھی۔ رہ رہ کر میں وسیم کو آوازیں بھی دیتا جا رہا تھا۔ لیکن ابھی تک جواب سنائی نہیں دیا تھا۔ تین چار بار کے بعد اس کی ہلکی سی آواز آئی جیسے وہ کافی دور ہو۔

”کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سیدھے سیدھے بڑھتے چلے آئیں۔ راستے ٹیڑھے میڑھے ہیں۔“

ہم تینوں اسی جانب بڑھتے چلے گئے۔ کافی دور آنے کے بعد احساس ہوا کہ دوسری طرف سے بھی راستہ کھلا ہوا ہے جہاں سے صاف ہوا آرہی ہے ورنہ گھٹن کا احساس ہوتا۔ میں نے وسیم کو آواز دی کہ اب وہ کہاں ہے۔ ادھر سے جواب آیا کہ میں نے آپ لوگوں کو دیکھ لیا۔ بس آپ آگے بڑھتے چلے آئیں۔ ہم تینوں آواز کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ چلتے چلتے عبداللہ نے پوچھا۔ ”یہ اتنی لمبی سرنگ بنائی کس نے ہوگی؟“

”شاید تم بھول رہے ہو کہ یہ پورا علاقہ لائم اسٹون یعنی چونے کے پتھر سے بنا ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ جب یہ سخت ہوا اور کمپریس کے عمل سے گزرا تو ایسے غار وجود میں آ گئے۔ غور سے دیکھو اس میں ذیلی سرنگیں بھی ہیں اور ہوا بھی پاس ہو رہی ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس سرنگ کے کئی چھوٹے بڑے دہانے ہیں۔“

”اوہ.....؟“ عبداللہ کے لہجے میں تعجب کا عنصر زیادہ تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں وسیم کھڑا غار کی چھت کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے بھی نظر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ یہاں سے وہاں تک چھت پر رنگین پتھروں کے بڑے بڑے ڈھیلے چپکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔ ”یہ تو قیمتی پتھر ہیں۔ لاکھوں روپے مالیت کے پتھر صرف اس غار میں ہیں۔ یقیناً آس پاس کے علاقوں میں بھی ایسے پتھر ہوں گے۔“

”جی ہاں یہ پورا علاقہ قیمتی پتھروں سے بھرا ہوا ہے۔ چین اور انڈیا تو اپنے علاقوں سے پتھر اور دیگر معدنیات نکال کر کام میں لارہے ہیں۔ ایک ہم ہی ہیں جو اپنی دولت کو نظر انداز کر کے دوسروں سے امداد مانگ رہے ہیں۔ پورا شمالی علاقہ جات، بلوچستان اور پنجتون خواقد رتی امداد سے لالاب بھرا ہے لیکن ہمیں فرصت نہیں کہ ہم کھدائی کریں۔ بھلے چوری سے کوئی لے جا رہا ہو تو کوئی بات نہیں۔“

میری بات پر سفیر کھلکھلا اٹھا۔ ”خوب، چور کو روکنے کی اجازت نہیں۔ واہ۔“

”بھائی میاں..... ان پتھروں کی فکر چھوڑو یہ دیکھو کہ باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے۔“ میں نے وسیم کو مشورہ

دیا۔

وسیم نے ہنس کر کہا۔ ”یہ ہماری قومی پہچان بن گئی ہے کہ کام کی بات کوئی نہ کرے جو کرے اسے ٹوک دو۔“ پھر وہ آگے بڑھنے لگا۔ اب ہم سب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دائیں بائیں بھی سرنگ مڑ رہی تھی لیکن ادھر اس لیے نہیں جا رہا تھا کہ ادھر سے تازہ ہوا اندر نہیں آرہی تھی۔ پھر جب کچھ آگے بڑھے تو سرنگ کا دہانا نظر آیا۔ ہم سب تیزی سے دہانے پر پہنچے۔ باہر جھانکا تو ادھر بھی وہی منظر تھا۔ درودور تک برف زار۔ کہیں کوئی آبادی نہیں۔ لیکن ایک فرق نظر آیا کافی فاصلے پر پیڑوں کے کچھ جھنڈ نظر آئے۔ درختوں کو دیکھ کر میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ ادھر آبادی ہو۔“

”لیکن ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں ہے کہ ہم پاکستانی حدود میں ہیں، تبت میں ہیں یا انڈیا میں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آبادی میں پہنچتے ہی کوئی نیا فساد کھڑا ہو جائے۔“ عبداللہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اب جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔ ہمیں آگے تو بڑھنا ہی ہے۔“ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ جس پہاڑ کے سرگ نما غار میں ہم کھڑے تھے اس کے پیچھے سے برف کے ذرات سیلاب کی صورت میں امنڈ امنڈ کر گرنے لگے۔ وہ طوفان جس کے آثار ہم نے دیکھے تھے وہ آچکا تھا۔ اب ہم شکر ادا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بروقت محفوظ رکھا اگر ہم اس غار میں نہ آتے تو اس طوفان کا شکار ہو چکے ہوتے۔ یعنی زندہ برف میں دفن ہو چکے ہوتے۔ ایسے طوفان کو کولانچ کہتے ہیں اور کولانچ کا مطلب ہے برف میں دفن ہو جانا۔

کافی دیر تک آکس سلائیڈنگ ہوتی رہی اور ہم سب اس غار میں بیٹھے قدرت کی کارسازی دیکھتے اور اس آفت سے محفوظ رہ جانے پر شکر خدا کرتے رہے۔ ہوا کے تھیرے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو ہوا کے ساتھ برف کا کوئی چھوٹا ٹکڑا بھی اڑ کر اندر آ جاتا جو چہرے سے ایسے ٹکراتا جیسے بڑی سی کنکری ٹکرائی ہو۔ جس کے بھی چہرے سے برف کا ٹکڑا ٹکراتا وہ چوٹ والی جگہ کو سہلاتا اور خجل انداز میں مسکرا دیتا۔

طوفان تو آدھے گھنٹے میں گزر گیا لیکن ہم اس ڈر سے باہر نہیں نکلے کہ کہیں آکس سلائیڈنگ نہ شروع ہو جائے۔ اس لیے کہ طوفان سے چھوٹی چھوٹی چٹانیں اپنی جگہ سے کھسک جاتی ہیں اور برف کے ذرات کی وجہ سے ڈھلان پر ہی جم جاتی ہیں۔ اگر تیز ہوا چلی تو وہ چٹان پھسل سکتی ہے۔ اتنا موقع دینا ضروری تھا کہ اگر ایسی کوئی چٹان ہو تو پھسل جائے۔ اس لیے بھی کہ ایک بھی چٹان پھسلتی تو ساتھ میں دھکے سے دوسری چٹانیں بھی گرتی ہیں اور پھر ایک خطرناک صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

جب کافی دیر انتظار کر لیا اور کسی چٹان کے پھسلنے کی آواز نہیں آئی اور نہ دکھائی دی تو ہم ڈرتے ڈرتے باہر نکلے۔ ہر طرف ایک گمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تا حد نظر برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھے۔ بڑھنے سے پہلے ہم دوبارہ ایک دوسرے سے اسی رستی سے منسلک ہو گئے تھے مگر اس بار سب نے اپنی اپنی بیلٹ کو کھینچ کر چیک کر لیا تھا تاکہ اگر کوئی حادثہ پیش آئے تو دوسرا اس کا سہارا بن جائے۔ پورا میدان بھر بھری ریت جیسا ہو رہا تھا۔ برف کے ذرات میں پیر دھنس رہے تھے۔ ہم سب بغیر کسی نشان منزل کے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ تین چوٹیاں جنہیں دیکھ کر کہا گیا تھا کہ وہ تبت میں واقع ہیں، اس سے بائیں طرف بڑھ رہے تھے۔ اس طرح ہم پاکستانی علاقے کے قریب ہوتے جاتے۔ کچھ آگے بڑھے تو ہمیں وہی پیڑوں کے جھنڈ نظر آئے جس طرف ہم نے جانے کا سوچا تھا۔ ہم انہی پیڑوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

پہلے ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جھنڈ دو ڈھائی کیلومیٹر کی دوری پر ہوں گے مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہمارا اندازہ غلط ہے۔ اس جھنڈ تک پہنچتے پہنچتے آدھا پہر گزر گیا تھا۔

بالآخر کسی نہ کسی طرح ہم اس جھنڈ تک پہنچ ہی گئے۔ جھنڈ میں داخل ہوتے ہی ایک خوشگوار احساس ہوا۔ اس لیے کہ جھنڈ کے درمیان ایک عارضی جھونپڑی نظر آئی جو شاید شکاریوں کی تیار کردہ تھی۔ لومڑیوں کے شکاری

اپنے ٹھہرنے کے لیے ایسی ہی پناہ گاہیں بنا لیتے ہیں۔ وہ جھونپڑی بھی کسی شکاری کی بنائی ہوئی ہوگی جو شکار کے موسم میں ان کے کام آتی ہوگی۔ ہم سب اس جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس جھونپڑی میں کچھ خوراک بھی موجود تھی۔ ہم نے رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ عبد اللہ نے ادھر ادھر تلاش کے بعد چقماق پتھر بھی ڈھونڈ لیے تھے۔ اس نے چقماق کو رگڑ کر آگ جلائی۔ باہر کے سرد ترین موسم کے بعد آگ کی حدت نے بہت مزہ دیا۔ ایک طرف کچھ سوکھے ہوئے پھل تھے اور اناج کی کچھ مقدار۔ گوشت کے دھوپ میں سکھائے ہوئے کچھ پارچے بھی تھے مگر ہم نے گوشت کو ہاتھ نہ لگایا کہ پتا نہیں کس جانور کا گوشت ہو۔ چنے کو آگ پر بھون کر ہم سب نے تھوڑا تھوڑا کھایا اور پھر آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس جھونپڑی نے خاموش زبان سے بتا دیا تھا کہ انسانی آبادی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے امید بندھ گئی تھی کہ ہم جلد کسی انسانی آبادی میں پہنچ جائیں گے۔

ہم نے کچھ دیر آرام کے بعد پھر سے سفر شروع کر دیا۔ اب ہم ڈھلان پر چل رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ سورج اپنا سفر کرتے ہوئے مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا کہ ہمیں دور بہت دور سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً کوئی آبادی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور ہم چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے آبادی صاف نظر آرہی تھی۔ مگر وہ کافی دور تھی۔ درمیان میں شاید کھائی یا کوئی بڑی وادی تھی اس لیے کہ ہر فیملی میدان کے بعد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا پھر وہ آبادی تھی۔ اتنی دور ہوتے ہوئے بھی اس آبادی نے ہمارے اندر ایسی خوشی بھردی تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسی خوشی محسوس ہو رہی تھی جیسے ہم اسلام آباد پہنچ گئے ہیں۔ میں نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔ ”آبادی میں پہنچ کر ہمیں انتہائی چالاکی سے کام لینا ہوگا۔ باتیں کم سے کرنا ہوں گی۔ اس لیے کہ ابھی یہ پتا ہی نہیں ہے کہ یہ علاقہ ہمارا ہے یا دشمن ملک کا۔ یہاں تین ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ پاکستان، چین اور انڈیا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم انڈیا کے حدود میں ہوں اور یہ تمہارے علم میں بھی ہے کہ انڈین ”را“ میرے پیچھے ہے۔ ان کو میں نے کئی بار شکست دی ہے اس لیے وہ مجھے کتوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایسے میں اگر میں ان کے حدود میں پایا گیا تو وہ خوشی سے نہال ہو اٹھیں گے۔“

”لیکن جب تک ہم آبادی میں پہنچیں گے نہیں تو پتا کیسے چلے گا کہ ہم کس ملک میں کھڑے ہیں۔“

”سیدھے آبادی میں گھسنے سے اچھا ہے کہ ہم پہلے کہیں پناہ گاہ ڈھونڈ لیں پھر کوئی ایک جا کر پتا کرے۔ ایک ساتھ جانے کا مطلب ہے کہ سب ایک ساتھ پھنسیں۔“

”شہباز کی بات میں دم ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”اس طرف اونچے نیچے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں غار بھی ہوں۔ ہم پہلے ان ٹیلوں کی طرف چلتے ہیں۔“

سفیر کا مشورہ میں نے مان لیا اور اس طرف بڑھنے لگا۔ پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور و نزدیک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جسے ہم پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکتے۔ ہم چاروں نے پھیل کر پہاڑی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وسیم آہستہ آہستہ اس پہاڑی کے اوپر چڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر اس نے آواز دی۔

”شہباز اوپر آ جائیں۔“

میں سمجھ گیا کہ اس نے کوئی غار یا چھجہ ڈھونڈ لیا ہے اور اس خوشی میں مجھے بلا رہا ہے۔ میں تیزی سے اوپر

چڑھتا چلا گیا۔

اب تک ہم میدان میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن اس پہاڑی پر چڑھتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس لیے کہ اب تک ہم غلط سمت میں بڑھ رہے تھے۔ پہاڑی کی دوسری طرف بھی میدان تھا۔ برف سے بھرا میدان اور اس میدان کے پار ایک ندی بہہ رہی تھی۔ اس ندی کے کنارے بہت سارے مکان نظر آرہے تھے۔ جس آبادی کی طرف ہم بڑھ رہے تھے یہ آبادی اس سے چھوٹی تھی۔ مکانات کچے تھے۔ ان مکانوں کی بناوٹ بالکل ایسی تھی جیسی بلتستان کے علاقوں میں دیکھ چکا تھا۔ میرے اندر خوشی کی ایک تیز لہری اٹھی کہ ہم اپنے ہی علاقے میں ہیں لیکن فوراً ہی خیال آ گیا کہ بلتستان ہو یا چین یا انڈیا ان تمام علاقوں کے مکانات کی تعمیر میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

”یہ آبادی نزدیک تو ہے لیکن ہم فوراً ادھر نہیں جائیں گے۔ پہلے یہاں کوئی پناہ گاہ ڈھونڈیں گے۔“ میں نے کہا تھا کہ ہوا کے دوش پر سوار سفیر کی آواز آئی:

”لو بھائی میں نے ایک ایئر کنڈیشنڈ غار ڈھونڈ لیا۔“

سفیر کی آواز پر ہم دوبارہ نیچے آ گئے۔ سفیر نے واقعی ایک غار ڈھونڈ لیا تھا لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ غار قدرتی ضرور ہے لیکن اس میں انسانی کاریگری بھی شامل ہے۔ پہاڑی کو کھود کر غار کو آگے تک بڑھایا گیا تھا۔ اس کا ایک دہانہ ادھر سے تھا اور دوسرا دہانہ دوسری طرف تھا۔ ادھر سے آنے والی ہوا ادھر سے نکل رہی ہوگی اسی لیے سفیر نے اسے ایئر کنڈیشنڈ کہا تھا۔ میں بھی اس طنز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر میں نے کہا۔ ”ایسا کرو تم تینوں یہاں بیٹھو میں اس آبادی کا چکر لگا کر آتا ہوں۔ اگر میں ایک گھنٹے میں نہ لوٹوں تب تم میں سے کوئی ایک جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لے گا۔ اندھی چال کوئی نہ چلے۔ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہے۔“

ان کو ہدایت دے کر میں نکل کھڑا ہوا۔ میں اس آبادی کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر یہ انڈیا کا حصہ ہوا تو میں چین کی طرف رخ کر لوں گا پھر وہاں سے پاکستان پہنچنا کم خطرے کی بات ہے۔

ابھی میں برف کے میدان سے اتر کر پتھر لیے راستے پر آیا ہی تھا کہ سامنے سے دو آدمیوں کو آتے دیکھا۔ وہ دونوں کسی بات پر بحث کر رہے تھے اس لیے کہ مسلسل دونوں کے ہونٹ بل رہے تھے۔ آواز مجھ تک پہنچ نہیں پا رہی تھی اسی لیے ان کو بغور دیکھتے ہوئے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ دراصل میں ان کے چہرے سے علاقے کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس علاقے کے لوگوں کے چہرے عام طور سے چھپے ہوتے ہیں۔ تپتی نقش و نگار والے لیکن ان کے چہرے واضح ہوئے تو میں خوش ہو گیا کیونکہ ان کے چہرے کی ساخت پختونوں سے مل رہی تھی۔ لباس بھی پختونوں والا تھا۔ بڑی سے گھیردار شلوار۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ میں پاکستانی علاقے میں پہنچ چکا ہوں۔ میں خوشی سے سرشار انداز میں ان کی طرف بڑھا۔ اب ان لوگوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور حیرت بھری نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ دونوں رک گئے تھے مگر میں رکا نہیں تھا اور ان کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نزدیک پہنچنے کے بعد میں نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے میرے اندازے کی تائید کر دی۔ سلام کا جواب دیتے ہی پشتو لب و لہجے میں پوچھا گیا۔ ”تم کون ہو؟ کہاں سے آرہے ہو؟“

میں نے جواب دینے کی بجائے پوچھا۔ ”اس علاقے کا کیا نام ہے؟“

”یہ بلتر گلیشر کے نزدیک کا علاقہ ہے؟ کیا تم ہیکنگ کے لیے آئے ہو؟ تمہاری پارٹی کہاں ہے؟“
 ”تم ہمارے لیے خوراک کا انتظام کر سکتے ہو؟“ اس بار پھر میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔
 ہماری گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی۔ اس نے کہا:

”آپ ایسا کرو کہ ہمارے ساتھ ہمارے ڈیرا پر چلو۔ وہاں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔“
 ”کیا تم یہاں کے مقامی نہیں ہو؟“

”نہیں جناب ہم ایک ضروری کام سے یہاں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ اور بھی لوگ ہیں۔ ہم سب اس طرف ایک بڑے سے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے آبادی کی طرف اشارہ کیا۔
 میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پتا نہیں کیوں میری چٹھی حس کہہ رہی تھی کہ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ کیونکہ بلتستان کے لوگ امن پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ہوتے ہیں۔ لڑائی بھڑائی سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ جب کہ ان میں سے ایک کی کمر میں اڑے ہوئے پستول کے ابھار کو میں نے دیکھ لیا تھا۔ پستول ساتھ رکھنا پختون کلچر کا حصہ ہے۔ لیکن اس علاقے کے لوگ معیوب سمجھتے ہیں۔ پھر یہاں غربت بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہاں والے جتنے پیسوں میں یہ پستول خریدیں گے اس میں کچھ اور ملا کر پاک خرید لینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کہ پاک ان کی زندگی کا جزا لاینفک ہے۔ اس سے کھیت جوت لیتے ہیں۔ اس پر سواری کرتے ہیں۔ اس کے دودھ سے بھوک مٹاتے ہیں، گویا پاک ہی ان کی پہلی ترجیح ہے۔ ایسے پر امن علاقے کا کوئی باشندہ پستول رکھ ہی نہیں سکتا۔ یقیناً یہ کوئی اسمگلر یا غیر قانونی کام کرنے والا ہے۔ میں ہوشیار ہو چکا تھا پھر بھی ان پر آشکار نہیں کیا تھا کہ میں ان کی اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہوں۔ بس ان کی تقلید میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دونوں ایک مکان کے تسامنے جا کر رک گئے۔ وہ مکان کچا تھا لیکن اچھا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ان میں سے ایک نے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازے کی دوسری جانب کسی کی چاپ ابھری۔ شاید اندر سے کسی نے جھانک کر دیکھا تھا پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے نے حیرت بھری نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”سامنے سے ہٹ۔ اندر تو جانے دے۔“ کہہ کر اس نے ہاتھ سے اسے ہٹایا اور مجھے لے کر اندر داخل ہوا۔ اندر دو آدمی بیٹھے تھے۔ ان دونوں نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا پھر استفسار یہ انداز میں میرے ساتھ آنے والے سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

بولنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سندھ کے علاقے کا ہے۔ اب مجھے سو فیصد یقین آچکا تھا کہ میں وطن کی سرزمین پر ہوں اور مجھے ساتھیوں کو بھی بلا لینا چاہیے۔

”اللہ ڈینو، یہ صاحب ٹریک کرنے آیا ہے۔“ مجھے لانے والے نے ہنستے ہوئے عجیب انداز میں کہا۔

”ریاست خان۔ تم اسے ادھر کیوں لے کر آیا؟“ سوال کرنے والا ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔

”اس سے پوچھو اس کا پارٹی کہاں ہے؟“ مجھے لانے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔ وہ

زبردستی کرنا چاہ رہا ہے۔ لیکن اسے میری پارٹی سے کیا لینا دینا، یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب جاننا ضروری تھا۔

”اس کی پارٹی سے کیا کرنا ہے۔ ہمارے پاس وقت کم ہے جس کام کے لیے آئے ہیں اسے کرو اور واپس چلو۔ مجھ سے اب اس سرد جہنم میں رہنا نہیں جا رہا۔“ پہلے سے موجود شخص نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے سے بے زاری عیاں تھی۔ شاید وہ یہاں کی سردی سے گھبرایا ہوا تھا۔

”تم سمجھا نہیں۔ یہ اسی طرف سے آ رہا ہے، جہاں سے وہ آئے گا۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔ اس کا انداز مجھے حد درجہ مشکوک لگا۔

ریاست خان کی بات سنتے ہی اللہ ڈینو کے تیور بدل گئے۔ اس نے میرا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے سن لیا خان کیا بولا۔ اب بتاؤ تمہارے ساتھی کہاں ہیں اور تم ادھر کیا کرنے گئے تھے۔ اس لیے کہ اس طرف کوئی ٹریک نہیں ہے۔“

”ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔“ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس لیے کہ اب مجھے تجسس ہو گیا تھا کہ یہ کس سمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور ان سے ملنے کون آنے والا ہے۔

”جھوٹ مت بولو..... ہم لوگ جھوٹ برداشت نہیں کرتے۔ اگر تم نے سچ نہیں بولا تو انجام بہت برا ہوگا۔“ اس نے کڑے تیور سے کہا۔

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں۔ میں جس ٹیم کے ساتھ تھا وہ لوگ طوفان میں پھنس کر پتا نہیں کدھر چلے گئے۔ میں طوفان سے بچنے کے لیے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں دوڑا تھا۔ دوڑتے دوڑتے پتا نہیں ان لوگوں کو کہاں چھوڑ آیا۔ طوفان رکا تو میں سامنے والی پہاڑی پر تھا۔ آبادی دیکھ کر ادھر چلا آیا۔“

”بالکل جھوٹ اس لیے کہ ہم یہاں ایک ہفتے سے ہیں اور ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ادھر کوئی ٹریکنگ پارٹی آئی ہے۔ سچ بتاؤ تم کون ہو اور تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ اس طرف کیا کرنے گئے تھے۔“

”میں نے کہا نا کہ میں اکیلا ہوں میرے ساتھی پھٹ گئے ہیں۔“ میں نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

”تمہارے ساتھی کس ملک کے ہیں اور تم کس شہر کے ہو؟“

”میں پنڈی کا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”پنڈی کے کس علاقے کے ہو..... اس لیے کہ میں بھی راولپنڈی کا ہوں۔“ اللہ ڈینو کے ساتھ بیٹھے شخص نے پوچھا۔

اس کے لہجے نے چغلی کھادی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس لیے کہ پنڈی والے کبھی راولپنڈی نہیں کہتے ہمیشہ پنڈی کہتے ہیں۔ اس کے بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کراچی کا ہے۔ کراچی کے اولڈ ایریا کے لوگ اس انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ گویا یہاں پورا پاکستان جمع تھا لیکن یہ سب منہ ذہن والے تھے۔ اچھے برے ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی اچھوں کے ساتھ کچھ برے لوگ بھی ہیں۔ اور ان سب کا تعلق برے لوگوں سے تھا۔ اس کا مجھے اندازہ ہی نہیں سو فیصد یقین ہو چکا تھا۔

”میں ڈھوک چراغ دین کا ہوں۔ نالالائی کے قریب میرا گھر ہے۔ آپ کسی کو بھی فون کر کے میرے گھر سے تصدیق کرا سکتے ہیں۔“ میں نے جواب دینے کے ساتھ اس بات کا اندازہ بھی لگانا چاہا تھا کہ ان کے پاس فون ہے۔ اگر فون ہے تو یہاں سگنل آتا ہے یا نہیں۔ اگر سگنل آتا ہوگا تو میرا فون بھی کام کرے گا۔ جواب بھی تک

بیک کے اندر پڑا اپنی قسمت پر رورہا ہے۔

”ریاست خان اپنا فون دینا ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ ریاست خان نے قیص کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ اللہ ڈینو بولا:

”تمہارا نام کیا ہے۔ اپنا اور اپنے باپ کا نام بتاؤ ہم ابھی چیک کرتے ہیں۔“

”میرا نام شاہد بٹ ہے۔ باپ کا نام ارباب بٹ۔“ میں نے جھوٹ کا ریکارڈ قائم کرنا شروع کر دیا۔

”ہاں مجھے یاد آگیا۔ ارباب بٹ وہی ناجن کی بڑی سی داڑھی ہے۔“

”جی ہاں۔ میرے والد کی داڑھی ہے لیکن بڑی سی نہیں، عام سی۔“

”تب تو تم میرے گرائیں ہوئے۔ اب یہ بھی بتا دو تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔“ وہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے جواب اگلوانے کے لیے نیا طریقہ اپنایا تھا مگر اسے خبر نہ تھی کہ ایسے چوہے جیسے لوگ میرے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اگر میں چاہوں تو ان سب کو دھنک کر رکھ دوں لیکن میں خاموشی سے حقیقت جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں کیوں جمع ہیں۔ اس لیے کہ یہ ایسی جگہ بھی نہیں ہے کہ لوگ لوٹ مار کے ارادے سے آئے ہوں۔ غربت زدہ علاقے میں کوئی اتنی دور سے واردات کرنے نہیں آ سکتا یقیناً یہ لوگ کسی اہم کام سے آئے ہیں۔ وہ کام کیا ہے یہ جاننا ضروری تھا۔ اور مجھے موقع مل نہیں رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر پرانی کہانی کو آڑ مانا چاہا:

”بھائی بہت بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو ہے تو دے دو۔“

”اللہ ڈینو اسے کھانے کو دے۔“ کراچی والے بندے نے کہا۔

”یار صغیر تو بھی نا..... خود ہی اٹھ کر دے دے۔“ اللہ ڈینو نے منہ بنا کر کہا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان میں کوئی بھی اہم بندہ نہیں ہے۔ پانچوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ ڈینو خود اٹھا اور دوسرے کمرے سے بھنا ہوا مرغ اور روٹی لے آیا۔

”لے بھائی صرف دو روٹی بچی ہوئی ہے، اس سے کام چلا۔ دوپہر کا کھانا پک جائے تو پیٹ بھر کر کھا لینا۔“ اللہ ڈینو نے پلیٹ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

واقعی بھوک تھی پھر ان کو دکھانا بھی تھا کہ میں بھوکا ہوں اس لیے میں نے کئی روز کے فاقہ زدہ انداز میں کھانا شروع کر دیا۔ وہ سب مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کھانا کھا کر میں نے ڈکاری اور کہا۔ ”اچھا بھائیو اب مجھے اجازت دو میں اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ پتا نہیں وہ سب طوفان سے بچے بھی یا نہیں۔ اس لیے کہ میں الٹی طرف بھاگا تھا۔ اگر وہ لوگ بھی ادھر گئے ہوں گے تو بچ جائیں گے ورنہ آئس سلائیڈنگ میں دب دبا گئے ہوں گے۔“

”اب تم ادھر سے جانیں سکتا۔ جب ہم لوگ چلا جائے گا تو شوق سے باہر نکل جانا۔“ ریاست خان نے

اکھڑ لہجے میں کہا۔ ”اب تم ادھر ہی رہے گا۔“

”لیکن میرے ساتھی۔“

”ہم ان کو ڈھونڈے گا اگر وہ لوگ مل گیا تو ان کو بھی یہیں لائے گا۔ ادھر باہر کا کوئی آدمی نہیں آتا تم کیسے

آگیا۔“ ریاست خان کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ اس نے اللہ ڈینو سے کہا۔ ”منہ کیا دیکھتا ہے اس کا ہاتھ پیر باندھ کر ایک طرف ڈال دے۔“

وہ چارتھے اور میں اکیلا پھر میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی کمر میں پستول بھی ہے۔ معاملہ نازک تھا۔ اگر میں اپنی قوت آزماتا تو معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا۔ میں نے آرام سے اپنے ہاتھ پیر بندھوا لیے۔ انہوں نے مجھے باندھتے وقت عام انداز سے باندھا تھا جسے کھولنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ انہوں نے مشکلیں کس کے مجھے فرش پر ڈال دیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو اپنے ہاتھ دکھا سکتا تھا پھر بھی میں لاچار سا ایک جانب پڑا رہا۔ ریاست خان میری طرف سے مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔ جاتے وقت وہ اپنے ساتھ جیدے کو لے گیا تھا۔ پتا نہیں کس چکر میں وہ بر فیلے میدان کی طرف گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اللہ ڈینو دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں صرف ایک بندہ رہ گیا تھا صغیر جو مجھے ہیروئن چھی سا لگا تھا اس لیے کہ وہ جاگتے میں بھی سوتا ہوا لگ رہا تھا۔ اب میں نے اپنی کار سازی دکھانے کی سوچی اور ہاتھ کو اوپر اٹھانے لگا۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو باندھا ضرور تھا لیکن پشت کی طرف نہ باندھ کر سامنے کی طرف باندھا تھا جسے کھولنا آسان تھا۔ میں نے کروٹ بدل لی اور بیٹھے ہوئے بندے کی طرف پیٹھ کر لی۔ اب ہاتھ کو اٹھا کر منہ تک لانا آسان ہو گیا تھا۔ میں نے دانتوں کی مدد سے رستی کی گانٹھ کھولنا شروع کر دیا۔ دو منٹ میں مجھے کامیابی مل گئی۔ بندھن کھلتے ہی میں نے آواز دی۔ ”اللہ ڈینو بھائی بات سنیں۔“

”اوائے شور نہ کر اللہ ڈینو آرام کر رہا ہے۔“ ہیر ونچی جیسے شخص صغیر نے جواب دیا۔

”تو بھائی تم ہی ادھر آ جاؤ۔“ میں نے اسے ہی پھانسنے کا سوچا۔

”کیا ہے۔“ وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا اور اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ میں یہی تو چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا میں نے اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی اور منہ پر بانیاں ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اگر آواز نکلی تو گردن ٹوٹ جائے گی۔“

مجھے اس کی گردن پر دباؤ ڈالنے کی بھی ضرورت نہ پڑی، وہ ہلکے سے دباؤ سے ہی انشا غفیل ہو گیا۔ اسے دھکا دے کر میں نے اس کمرے کا رخ کیا جدھر اللہ ڈینو گیا تھا۔ اس کمرے میں بستر بچھا ہوا تھا اور اللہ ڈینو لیٹا ہوا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دن کے وقت سونے کی کیا تک ہے لیکن وجہ بھی نظر آ گئی۔ اس کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بو میرے لیے نئی نہیں تھی۔ جسے میں ہیر ونچی سمجھ رہا تھا وہ ہیر ونچی نہیں تھا۔ ہیر ونچی اللہ ڈینو تھا جو ہیر ون کا مزہ لے کر سویا تھا۔ میں نے قریب پہنچتے ہی اس کے گلے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور زور ڈالنے لگا۔ وہ نشے میں چور تھا لیکن گلے پر دباؤ پڑا تو پھڑ پھڑانے لگا۔ جھپٹانے لگا۔ جکڑ سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اس کی کوشش کہاں کامیاب ہونے والی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی انشا غفیل ہو گیا۔ اس کا جسم جھول گیا۔

ان دونوں پر میں نے اتنی آسانی سے قابو پالیا تھا جیسے وہ دونوں ننھے بچے ہوں۔ شاید اس لیے کہ یہ لوگ سڑک چھاپ تھے۔ معمولی درجے کے بدمعاش اگر ٹرینڈ ہوتے تو شاید معرکہ سر کرنے میں دیر لگتی۔

ان سے نمٹ کر میں نے اپنا بیگ اٹھایا۔ اس میں میرا موبائل تھا۔ مجھے یہ علم نہیں تھا لیکن اندازہ تھا کہ وسیم اور سفیر کے پاس بھی موبائل ہے۔ میں نے اپنا موبائل نکالا۔ اسے آن کیا لیکن یہ دیکھ کر آہ بھرنے پر مجبور ہو گیا۔

سگنل نہیں تھا۔ اس وقت میں نے سوچا کاش میرے پاس سیٹ لائٹ فون ہوتا۔ موبائل کو واپس بیگ میں رکھ کر میں نے بیگ کو دوبارہ کندھے پر لٹکایا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ باہر نکل کر اطراف کا جائزہ لیا۔ دور بہت دور۔ اسی برف کے میدان میں دو نقطہ سے نظر آنے والے بندے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس مسئلے کو ابھی چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں اس غار کی طرف چل پڑا جس میں سفیر وغیرہ ٹھہر گئے تھے۔ چلتے وقت میرے ذہن میں ایک بات بار بار آ رہی تھی۔ میری قسمت بھی عجیب ہے۔ زندگی نے مجھے ٹینس کی گیند بنا دیا ہے کہ اچھالتی ہے۔ ٹپا کھاتا ہوں پھر اچھال دیتی ہے۔ کتنی عام سے زندگی تھی۔ ایک سویرا کی خاطر گھر چھوڑا تو زندگی کیسی اچھل کود سے بھر گئی۔ پورے پاکستان کی خاک چھنوا دی۔ نیپال انڈیا اور چین تک پہنچا دیا۔ ابھی ابھی جس سرزمین سے آیا ہوں اس کا ذکر کسی سے کروں تو کون یقین کرے گا؟ لوگ اسے من گھڑت کہانی قرار دیں گے۔ یکا یک میرے ذہن میں ایک بات ابھری، کہیں یہ سب کچھ ایلوایشن تو نہیں تھا۔ میں نفسیاتی بیمار تو نہیں ہو گیا تھا؟ کہ خواب مسلسل دیکھتا رہا۔ تبھی دماغ نے انتباہ دیا۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ وسیم، سفیر اور عبداللہ بھی تو اس عجیب و غریب سرزمین سے آرہے ہیں۔ کیا وہ بھی خواب دیکھتے رہے ہیں؟ میں اپنے ہی خیال پر مسکرا اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس غار کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

میری نظریں بار بار ادھر بھی اٹھ رہی تھیں۔ اس جانب جہاں دور دور تک پھیلا برفیلا میدان تھا اور اس میدان میں کسی نقطے کی طرح نظر آنے والے وہ دونوں بندے۔ انہوں نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا یا اگر دیکھا تھا تو توجہ نہیں دی تھی بس وہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

غار کے نزدیک پہنچ کر دیکھا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا۔ ان کے موجود رہتے ایسی خاموشی چہ معنی دارد۔ واقف حال ہونے کے لیے اندر داخل ہوا تو اطمینان کی سانس نصیب ہوئی۔ سامنے پتھر لیے فرش پر وہ سب بے خبر سو رہے تھے۔ شاید یہ تھکن کا نتیجہ تھا۔

ایک تھکن ہی تو ایسی چیز ہے جو انسان کو ہر غم سے عاری کر کے نیند کی پرسکون وادیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ وہ سب بھی ہر خطرے کو بھول کر بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی آواز دی۔ پہلی ہی آواز پر سفیر نے آنکھ کھول دی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”سرمنڈاتے ہی او لے پڑ گئے؟“

”کیا مطلب؟“ وسیم بھی بیدار ہو گیا تھا۔ ”یہ کیسی پہیلیاں بھجوا رہے ہیں؟“

میں نے بغور اس کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مطلب یہ کہ یہاں سے نکلتے ہی اجنبی دشمنوں سے سامنا ہو گیا اور وہ میری خاطر داری پر اتر آئے۔ زبردستی ایک گھر میں لے جا کر قید کر دیا۔“

”کیا..... تم قید میں تھے؟“ سفیر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”ایسا کون سو رہا تھا؟“

”یہی تو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کون لوگ تھے..... بڑی محبت سے لے گئے اور لے جا کر قید کر دیا۔ میں ابھی

قید سے چھوٹ کر آ رہا ہوں۔ پتا نہیں وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔“

”بغیر کسی وجہ کہ انہوں نے آپ کو قید کر لیا تھا؟“ وسیم نے اٹھ کر انگڑائی لی اور پیر کے انگوٹے کو عبداللہ کی

پیٹھ میں چبھاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کہاں کی شرافت ہے۔ اگر میں نے نیند میں ہاتھ چلا دیا ناں۔“ عبداللہ نے کسمسا کر کروٹ بدلتے

ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے جملہ پورا کیا:

”یہی تو حیران کن بات ہے۔ پتا نہیں کیا چکر ہے۔ وہ لوگ کسی کے انظار میں ہیں اور آنے والے کو سب کی نظروں سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں اسی لیے مجھے قید کر لیا تھا کہ میں اسی طرف سے آیا ہوں جدھر سے اسے آنا تھا۔“

”میری آنکھ دیر سے کھلی۔ آپ کیا کہہ رہے تھے۔“ عبداللہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اجی جناب یہ فرما رہے تھے کہ ہمارے لیے کام تلاش کر لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔ بیکار بیٹھنے سے ہاتھ بیروں میں زنگ لگ جائے گا۔“ وسیم نے شوخ لہجے میں کہا۔ پھر اس نے مختصر انداز میں میری بتائی ہوئی باتوں کو دوہرایا۔

”وہ کون لوگ ہیں؟“ عبداللہ نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں خود بھی سمجھ نہیں پایا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ میں یہاں سے نکلا تو دو آدمی نظر آئے.....“ میں نے اسے بھی پورا احوال سنایا۔ سب کچھ سننے کے بعد عبداللہ بولا:

”یہ علاقہ اسمگلنگ کے لیے بھی استعمال نہیں ہوتا کہ کہا جائے کہ وہ لوگ اسمگلر ہیں۔ ان دشوار گزار پہاڑیوں، برف زاروں میں عام طور پر صرف ٹریکنگ کے شوقین آتے ہیں۔ کلیمر آتے ہیں ورنہ یہ علاقہ تو غربت کی کوکھ میں پلنے والا ہے۔ مجھے لگتا ہے کوئی غیر معمولی بات ہے جس کی پردہ داری ہے۔“

”ایسی کیا بات ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ یہاں سے چین بھی نزدیک ہے اور انڈیا بھی، ادھر اس طرف وہ جو پہاڑ نظر آ رہا ہے۔ پانچویں پہاڑی کے پیچھے ایک ہیولا سا اس طرف سیاچن ہے۔ کہیں کوئی سازش تو نہیں ہو رہی؟ انڈیا والوں کی سازش۔“ سفیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”وہ لوگ ایسی کیا سازش کر سکتے ہیں؟ ان پہاڑوں پر قبضہ کریں گے؟ اگر ایسا ہوا تو ہمارے فوجی ابھی آکر ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ انیس سو پینسٹھ کی بھولی ہوئی مارکویا دہرتے ہوئے بھاگیں گے۔“ عبداللہ بولا۔

”شاید تم بھول رہے ہو۔ سیاچن میں بھی وہ لوگ چوروں کی طرح گھس کر چوکی بنا رہے تھے کہ ایک چرواہے نے دیکھ لیا اور اس نے دوڑ کر دس سے بارہ میل کا فاصلہ طے کیا اور فوج کو خبر دی۔ فوجیوں نے آکر انہیں پیچھے دھکیلا ورنہ وہ قبضہ کیے بیٹھے رہتے۔ کہیں ویسا ہی کوئی ڈراما یہاں بھی نہ کھیلا رہے ہوں۔“ عبداللہ نے سمجھایا۔

”بات سو فیصد سوچنے کی ہے۔ پتا لگانا ضروری ہے کہ وہ لوگ اتنی دور سے کیا کرنے آئے ہیں۔ کسی مقامی آدمی سے پتا نہیں کیا کہ یہ لوگ کب سے یہاں مقیم ہیں؟“ وسیم کی آواز میں فکر کا عنصر در آیا تھا۔

”کوئی مقامی ملا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری بستی خالی پڑی ہے۔ ورنہ ان میں سے ایک آدمی مارکھا کر پوری قوت سے چیخا تھا۔ اس کی چیخ دور تک سنی گئی ہوگی لیکن جب میں باہر آیا تو کوئی بھی نظر نہیں آیا۔“

”ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے مقامی باشندوں کو بھگا دیا ہو۔“

”ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کوئی کھیل کھیلا ہے تو سمجھ لو کوئی بڑی سازش ہے۔“ عبداللہ

نے کہا۔

”مجھے یاد آ رہا ہے کہ ان پہاڑوں کے باشندے موسم کے حساب سے اپنا علاقہ بدلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس موسم میں نیچے کہیں چلے گئے ہوں۔“ سفیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ایسا ممکن ہے۔ پھر بھی ہمیں سراغ لگانا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اگر یہ متروکہ علاقہ ہے تو وہ یہاں کیوں ڈیرا جمائے بیٹھے ہیں۔ مقامی لوگ اس ڈر سے علاقہ تیاگ دیتے ہوں گے کہ یہاں آکس سلائیڈنگ کا خطرہ ہے۔ ایسے خطرناک علاقے میں کوئی یوں ہی نہیں چلا آتا۔ ضرور کوئی بڑی بات ہے، ایسا کرتے ہیں ہم سب اسی گاؤں میں چلتے ہیں۔ تم سب دوسرے جھونپڑوں میں چھپے رہنا۔ مین واپس اسی گھر میں جا رہا ہوں تاکہ ان سے اگلا سکون کہہ کیا کرنے آئے ہیں۔“

”ہاں چلو۔“ کہہ کر سفیر کھڑا ہو گیا۔

”تم سب ایک ایسی جھونپڑی تلاش کرو گے جس میں انہیں لے جا کر ہم تفتیش کر سکیں۔“

”اتنی مشقت ضروری ہے کیا؟ وہیں ڈرائی کلین کر لیتے ہیں۔ کافی دنوں سے کسی کو دھوبی پاٹ دیا نہیں ہے۔ وہاں لڑے بھی تو تیر تلوار سے ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔“ وسیم بولا۔

”ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ ہم سب چلتے ہیں۔ پیر تو ذکر ہاتھ میں دیں گے تو ان کی زبان خود ہی چلنے لگے گی۔“ وسیم نے پھر گل افشانی کی۔

”نہیں، ٹھنڈا کر کے کھانا اچھا ہے۔ صرف ایک بندے کو اٹھاتے ہیں۔ اس سے سوالات کرتے ہیں۔ باقی سب کو اندھیرے میں رہنے دو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”ہاں یہ مشورہ بھی برا نہیں ہے اس طرح یہ بات آسانی سے سامنے آجائے گی کہ وہ لوگ کس لیے یہاں آئے ہیں۔ اللہ نہ کرے کہ کسی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث ہوں۔“ وسیم نے کسی بزرگ خاتون کے انداز میں کہا۔ اس کے لہجے پر مجھے بھی ہنسی آگئی تھی۔

وسیم کی یہی بات مجھے اچھی لگتی تھی کہ وہ ہر حال میں خوش رہنے اور پریشان نہ ہونے والا بندہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہر بات کو مزاح میں اڑا دینے والا تھا۔

”تو پھر دیر کس بات کی۔ چلو ہم سب چلے چلتے ہیں۔“ سفیر نے کہا اور اپنا بیگ اٹھا لیا۔ عبد اللہ نے بھی یہی کیا۔ وسیم نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے پھر سوال داغیا۔ ”لڑائی بھڑائی کا موقع ملے گا نا۔ ہاتھ پیر اٹھنے لگے ہیں۔“

”چلو اسی بہانے تمہارے ہاتھ پیروں کا زنگ دور کر دیتے ہیں۔ سوالات میں کروں گا اور مرمت تم کرنا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر میں نے برفراز کی جانب نظر ڈالی، ادھر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ادھر جانے والے اب تک لوٹے نہیں تھے۔ شاید کہیں دور گئے تھے۔ میں نے اپنے قدم اس گھر کی جانب بڑھا دیئے جہاں ان لوگوں نے مجھے قید کیا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس گھر کا دروازہ کھلا اور اللہ ڈینو باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر میں نے سفیر سے کہا۔ ”یہ ان کا ساتھی ہے۔ اسے چھاپ لو اور سامنے والے گھر میں کھینچ لے جاؤ۔ ہم اس گھر کو نار چروم بنائیں گے۔ تفتیش کے لیے وہ گھر برا نہیں ہے۔“

”باہر ہی سے کافی بڑا نظر آ رہا ہے۔“ عبد اللہ نے جواب دیا۔

اللہ ڈینو نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور واپس اندر جانا چاہتا تھا کہ میں نے دوڑ لگا دی۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اندر گھس کر کہیں دروازہ نہ لگا دے۔ اگر ایک لمحہ کی دیر ہو جاتی تو مجھے دروازہ توڑنا پڑتا۔ میں نے بند ہوتے دروازے کے درمیان پیراڑا دیا تھا۔ میری کوشش کامیاب ٹھہری۔ وہ دروازہ بند نہ ہو پایا اور میں نے اسے زور لگا کر پیچھے دھکیل دیا، پھر اسے باہر کی جانب کھینچ لیا۔ اس افتاد پر وہ چیخا تھا۔ شاید وہ مدد کے لیے اپنے ساتھی کو بلانا چاہتا ہو۔ اس کی چیخ سن کر اندر سے دوسرا بندہ بھی باہر آ گیا۔ جیسے ہی اس نے سر باہر نکالا، باہر کا منظر دیکھنے کو لیکن دیکھ نہ پایا۔ اسے عبد اللہ نے گریبان سے پکڑ کر کھینچ لیا تھا اور اپنے مضبوط بازو کی جکڑ میں اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کی گردن گویا شکنجے میں آ گئی تھی۔ دونوں ہی بے بس ہو چکے تھے اس لیے ہم بہ آسانی ان دونوں کو کھینچتے ہوئے دوسرے والے گھر میں لے آئے۔

اندر لاتے ہی وسیم نے اللہ ڈینو کے پیٹ میں گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ ”یہ ابتدا ہے۔ ابھی میرا ہاتھ کھلنے دو پھر آرام سے خاطر داری کروں گا۔“

وسیم کا کئی پاؤنڈ وزنی گھونسا اس کے پیٹ پر پڑا تو وہ اوع کی آواز نکال کر دوہرا ہو گیا تھا۔ وسیم نے اسی پر بس نہ کیا۔ اس کے ٹخنے پر بوٹ سے ٹھوکر بھی ماری۔ ”یہ بھی ابتدا ہے۔ ابھی ہم تم سے کچھ سوالات کریں گے اگر صحیح جواب نہیں ملتا تو پھر بہت معمولی سا کام کریں گے۔ جانتے ہو کیا؟“ اس نے جملے کے اختتام پر اپنا رخ دوسرے بندے کی طرف کر لیا تھا۔ دوسرا بندہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بغیر پٹے فر فر بوتے لگے گا۔ اسے دھمکانے کے لیے اللہ ڈینو پر تشدد ضروری تھا۔ میں نے وسیم کو آنکھوں سے اشارہ دیا۔ وہ تو گویا منتظر تھا۔ اس نے الٹا ہاتھ گھما کر اس کے گال پر جڑ دیا۔ چٹاخ کی آواز سے کرا گونج اٹھا۔ وہ اپنا گال سہلای رہا تھا کہ وسیم نے دوسرے ہاتھ سے مکار سید کیا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اسے عبد اللہ نے جکڑ رکھا تھا ورنہ وہ چھٹک کر دور جا گرتا۔ تیسرا گھونسا کھا کر وہ بولا۔ ”آخر تم پوچھنا کیا چاہتے ہو؟“

”یہ ہوئی نابات..... زبان کو کام میں لاؤ اور بتانا شروع کر دو کہ یہاں تشریف لانے کا مقصد کیا ہے؟“ کہتے ہوئے وسیم نے اس کے پیٹ میں ایک اور گھونسا مارا۔ وہ منہ سے آواز نکالتے ہوئے دوہرا ہو گیا۔

”ج مجھے۔۔۔ کچھ..... کچھ پتا نہیں ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”ہاں اور تمہیں۔“ وسیم خونخوار نظروں سے دوسرے بندے کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ وہ وسیم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر ہی کانپنے لگا تھا۔

”ہاں بھی شروع ہو جاؤ۔“ وسیم نے اس کی گردن پکڑ کر کہا تھا کہ وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔ ”مجھے کچھ بھی پتا نہیں۔ یہ لوگ مجھے کھانا بنانے کے لیے لے کر آئے ہیں۔“

”نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”صغیر۔“ وہ سچ سچ کانپ رہا تھا۔

”اور تم کیا کہتے ہو..... تمہیں کس لیے لایا گیا؟“ سفیر نے اللہ ڈینو کے سر پر انگلی ٹیڑھی کر کے الٹی طرف سے مارتے ہوئے پوچھا۔

”یقین کریں مجھے بھی نہیں پتا کہ ریاست خان کیا کرنے آیا ہے۔ میں کراچی میں انٹراسٹیٹ بس اسٹینڈ پر بٹنگ کرتا ہوں۔ اس سے میری گہری دوستی ہے۔ ایک دن اس نے کہا کہ چلو ہم لوگ پاکستان ٹور پر چلتے ہیں۔ میں نے بھی سوچا کہ عرصہ ہو گیا ہے کہیں باہر نہیں نکلا۔ اس بہانے آؤ ٹنگ ہو جائے گی۔ اس سے پوچھا کہ کہاں کہاں جانا ہے تو وہ بولا کہ گلگت بلتستان کا فرستان۔ یہ سن کر میں خوش ہو گیا کہ وہ شمالی علاقہ جات جانے والا ہے۔ برف باری دیکھنے کا اپنا مزہ ہے اسی لیے ہم اس کے ساتھ آگئے۔“ اللہ ڈینو نے جواب میں پوری کہانی بیان کر دی۔ شاید یہ خوف کا اثر تھا کہ وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنے لگا تھا۔

”یعنی تمہیں بھی پتا نہیں ہے کہ ریاست خان کیا کرنے آیا ہے؟“ میں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔
 ”جی ہاں..... مجھے کچھ بھی پتا نہیں ہے۔ میں تو صرف اس لالچ میں یہاں آیا ہوں کہ برف باری دیکھوں گا۔“ اس نے معصومانہ انداز میں جواب دیا۔ وہ جس انداز میں بتا رہا تھا اس سے صداقت جھلک رہی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا اس لیے مجھے وسیم کی طرف دیکھنا پڑا۔ اس کی طرف مڑ کر میں نے کہا۔ ”بھائی وسیم ذرا اپنی مہارت دکھانا کہ تم کس طرح پیروں کے جوڑ کھولتے ہو۔ اس کا پیر حاضر ہے۔ کوشش کر کے دکھاؤ نا۔“
 وسیم نے جھک کر اس کے ٹخنے کو چھوا اور پھر کہا۔ ”خاصا مضبوط ہے پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔“ وسیم نے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی جیسے واقعی وہ اس کام میں ماہر ہو۔ وہ اس کے پیر کو مختلف انداز سے معاینہ کرتا رہا پھر اس نے اس کے ٹخنے پر لٹے گھونے کو آڑا کر کہا۔ ”ہاں میں نے اس کے تمام جوڑ کو سمجھ لیا ہے، اس لیے اب میں اسے بہ آسانی کھول لوں گا۔“ اس نے ایک گھونے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ نہایت تیزی سے مختلف جوڑ پر گھونسا مارتے ہوئے بولا تھا۔

درد کی تیز لہر اللہ ڈینو کے چہرے پر تیرتی نظر آئی۔ اس نے درد سہنے کے لیے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا پھر پھنسی پھنسی آواز میں کہا:

”آپ یقین کیوں نہیں کرتے کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔“

”بغیر وجہ کے کوئی گھر سے قدم باہر نہیں نکالتا، میں کیسے یقین کر لوں۔ ویسے اب کچھ ہی دیر ہے جب وسیم تمہارے ٹخنے کی ہڈی کو نکال کر فریہ کہے گا، یہ لیجئے اسے ٹخنے کی ہڈی کہتے ہیں۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔“
 اللہ ڈینو نے خوفزدہ نگاہوں سے وسیم کو دیکھا پھر منمنایا۔ ”مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ یہاں اس کا کوئی قریبی دوست آئے گا اور وہ اسے کچھ دے گا۔ جسے ہمیں پیٹھ پر لاد کر کہیں لے جانا ہے۔“

”وہ کیا چیز ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کوئی بھاری بھر کم چیز ہے جسے ریاست خان اکیلے اٹھا نہیں سکتا، اسے ہم سب کو مل کر اٹھانا ہے اسی لیے وہ ہمیں ساتھ لے کر آیا ہے تاکہ ہم اس کی مدد کریں۔ بدلے میں وہ ہمیں ٹھیک ٹھاک پیسے دے گا۔ اتنے پیسے جو ہم ایک ماہ میں کمائیں سکتے۔“

”ہاں یہ ہوئی نا بات۔“ وسیم بولا۔ ”اب باقی باتیں بھی بتاتے جاؤ۔ وہ چیز کیا ہوگی اور کتنی وزن والی ہوگی۔“ اس نے اللہ ڈینو کو چھوڑ کر صغیر کو کندھے سے پکڑ لیا تھا۔ اس نے اتنی مضبوطی سے اس کا کندھا جکڑا تھا کہ صغیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”اس کا علم ہم میں سے کسی کو نہیں۔ جیدے کو بھی نہیں جو اس کے ساتھ گیا ہے۔“ صغیر نے منمنّا کر جواب دیا۔

”تم لوگ کتنے دن سے یہاں ہو؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت میری آنکھیں اس کی آنکھوں میں سچ تلاش کر رہی تھیں کیونکہ انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دیتیں اور جھوٹ عیاں ہو جاتا ہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اسی لیے مزید کی تمنا میں مسلسل اس پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔

”ہم لوگ پرسوں پہنچے ہیں۔ یہ پورا علاقہ ریاست خان کا دیکھا ہوا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اکثر یہاں آتا رہا ہے۔“

”اس سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ کب سے دوستی ہے؟“ میں نے ایک اور سوال داغا۔

”یقین کریں میں بس اسٹینڈ پر ٹائم کیپر ہوں۔ وہ اکثر اپنی بس لے کر کراچی آتا رہتا ہے۔ وہیں اس سے دوستی ہوئی تھی۔ ایک سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بس کے نیچے غیر قانونی اشیاء لے کر آتا ہے اس لیے اس کی آمدنی خوب ہوتی ہے اور وہ ہاتھ کا بھی کھلا ہے۔ دوستوں پر دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔“

”یہاں آنے سے پہلے اس نے ایسا کیا کہا تھا کہ تم لوگ آنے پر راضی ہو گئے تھے؟“

”اس نے کہا تھا کہ اس کے ایک دوست نے اسے ایک کام دیا ہے۔ اس کام کے اچھے پیسے دے گا۔ گلگت بلتستان کی سیر مفت میں ہو جائے گی اور لوہے وقت جیب میں اچھی خاصی رقم بھی ہوگی۔ کام بہت معمولی ہے۔“

”ایک کی بجائے تین بندوں کو کیوں لے کر آیا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

”اس نے کہا تھا کہ میرا دوست جو دے گا اسے وہیں ایک دوسرے بندے تک پہنچا دینا ہے۔ جو کچھ دے گا وہ وزنی ہے اس لیے اسے مدد کے لیے دو تین آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے ہی اللہ ڈینو کو ساتھ ملایا اور یہاں آ گیا۔“ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے بندے کی طرف اشارہ کیا۔

”ریاست خان کب تک لوٹے گا؟“

”کہہ کر نکلا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جائے گا۔ درمیان میں آپ آگے اس لیے اسے واپس آنا پڑا۔“

”اسے گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اب تو اسے آ جانا چاہیے؟“

”ہو سکتا ہے آ گیا ہو اور ہمیں اس والے گھر میں تلاش کر رہا ہو۔“

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”باہر دیکھنا لیکن احتیاط کے ساتھ۔“

عبداللہ اٹھ کر دروازے تک گیا اور تھوڑا سا اسے کھول کر باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کا اندازہ صحیح ہے۔ وہ دونوں آچکے ہیں اور ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ شاید انہیں ان دونوں کی تلاش ہے۔“

”گویا آپریشن کی شروعات کر دینا چاہیے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ایسا کرتے ہیں ان دونوں کو باندھ کر ڈال دیتے ہیں پھر باہر نکلیں گے۔“ وسیم بولا تھا کہ میں نے آگے

بڑھ کر اللہ ڈینو کی گدی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ چکرا کر نیچے گرا تھا کہ سفیر نے برابر میں کھڑے اس کے ساتھی کی گردن ناپی۔

دونوں نیچے گر چکے تھے۔ انہیں بے ہوش دیکھ کر سفیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ عبداللہ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے کہ ہم پوری طرح سے مطمئن رہیں گے کہ یہ باہر نکل کر شور نہیں کر پائے گا۔“

ان دونوں کو ہوش سے بیگانا کر کے ہم باہر آئیں لیکن اس احتیاط سے کہ فوراً ہی کسی کی نظر میں نہ آجائیں۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت باہر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ شاید وہ دونوں اندر تھے۔ ہم چاروں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے اس مکان تک پہنچے اور دروازے سے اندر جھانکا۔ ریاست خان اور جیداد دونوں فرش پر بیٹھے تھے۔ ریاست خان فکر مند لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ ایک خطرناک بات ہے کہ وہ قیدی غائب ہے، اللہ ڈینو اور صغیر بھی نظر نہیں آرہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ قیدی کسی طرح اپنے بندھن کھول کر بھاگا ہوگا۔ اللہ ڈینو اور صغیر اس کے پیچھے گئے ہیں۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔“ جیدے نے اپنا خیال پیش کیا۔

”ہمیں اب دیر نہیں کرنا چاہیے۔“ سفیر نے سرگوشی میں کہا۔

میں نے لات مار کر دروازہ کھولا۔ آواز سے وہ دونوں چونک گئے۔ میں نے اندر جاتے ہی کہا۔

”ریاست خان تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔“

ریاست خان نے کمر میں اڑسا پستول نکالنے کی کوشش کی تھی کہ سفیر نے اچھل کر اس کے سینے پر نکر ماری۔ وہ فرش پر چت گرا تھا کہ وسیم نے اپنا پیر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پستول کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ اگر وہ ٹریگر دباتا تو گولی دیوار میں لگتی۔ ریاست خان کے دوسرے ساتھی کو عبداللہ نے سنبھال لیا تھا۔ سفیر نے اس کی گردن پر اپنا پیر رکھ کر کہا۔ ”جتنی جلدی بکے گا تیرے حق میں اتنا ہی اچھا ہے۔“

دے۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

”تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“

”نور پر آیا ہوں..... ہر سال آتا ہوں۔ اس موسم میں یہاں کوئی رہتا نہیں ہے۔ ہم آرام سے ان کی

چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں اور دس بارہ دن میں لوٹ جاتے ہیں۔“

”جھوٹ بولنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ صاف پتا چل رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

میں نے اس کی پسلی پر ٹھوک مارتے ہوئے کہا۔

”اگر سچ نہیں بولنا ہے تو پھر موت کے فرشتے کو کہہ دو کہ وہ جلدی آجائے اس لیے کہ اب تم میرے قبضہ

میں ہو۔“ وسیم نے پیر سے اس کی کلائی کو مسلتے ہوئے کہا۔ اس کا دباؤ کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا کیونکہ ریاست خان کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

”ریاست خان ایک بات یاد رکھنا۔ میں اگر ضد پر اتر آؤں تو گوگنکے بھی بولنے لگتے ہیں۔ میں ہاتھ پیر

توڑ کر تمہیں سامنے والے بریلے میدان میں ڈال آؤں گا۔ باقی کام ہوائیں اور برف کے ذرات خود کر دیں گے کیونکہ یہاں کے مکین ایک ڈیڑھ ماہ سے پہلے واپس آنے سے رہے۔“

”آپ کو کیسے میں یقین دلاؤں کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔“

”وسیم ایسا کرو کہ اس کی ایک ایک انگلی توڑنا شروع کر دو۔ جب یہ لولا ہو جائے گا تو میں اس کے پیروں کی انگلیاں توڑ دوں گا۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے پستول چھینتے ہوئے کہا۔ اس نے پستول چھوڑنے کی بجائے ٹریگر دبا دیا تھا۔ دھماکا ہوتے ہی وسیم جیسے پاگل ہو گیا۔ وہ اس کے ہاتھ پر داہنا پاؤں پہلے ہی رکھے ہوئے تھا۔ اب وہ بائیں پاؤں کو مشینی انداز میں اس ہاتھ پر مارنے لگا بھاری بوٹ کی ضرب نے ہاتھ کو تقریباً ناکارہ کر دیا۔

”جلدی زبان کھول ورنہ اب میں انگلیاں توڑنے ہی والا ہوں۔“ کہہ کر اس نے ایڑی اٹھا کر سارا زور پنچے پر ڈالا۔ بوٹ کی ٹو نے انگلی کا بھرتا بنانے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ ریاست خان کا چہرہ تکلیف کی شدت سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس کے ناخنوں سے خون ٹپکنے لگا تھا۔

”ریاست خان اب بھی وقت ہے زبان کھول دو۔ تم کس سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ وہ کون ہے جو آ رہا ہے۔ اگر سچ بول دو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں جان بخش دوں گا ورنہ ایک ایک کر کے میں تمہاری تمام انگلیاں توڑنے کا حتمی حکم دے دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”یقین کرو کون آ رہا ہے مجھے خود پتا نہیں ہے۔ بس مجھے حکم ملا ہے کہ اس علاقے میں پہنچوں اور ان سے ملوں۔ وہ جیسا کہیں اسی مطابق کام کروں۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔

”تمہیں یہ حکم کس نے دیا ہے؟“ وسیم نے ایک بار پھر اپنے پاؤں پر زور ڈالا۔

”میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔“

”اس سے کبھی ملے نہیں؟“

”نہیں۔ اس سے میرا رابطہ فون پر ہوتا ہے۔ اس کا فون نمبر مجھے سرکار کے ایک مرید نے دیا تھا۔“

”یہ سرکار کون ہے؟“

”مرشد سائیں..... حضرت مرشد علی سائیں سرکار۔“

اس کا اتنا کہنا تھا کہ وسیم نے کہا۔ ”شکر الحمد للہ..... ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم..... ہمیں ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ مرشد نے خود ہی رشتی دراز کر دی کہ اسے پکڑ کر چلے آؤ۔“

”بکو اس بند کرو۔“ میں نے وسیم کو خاموش کیا پھر ریاست خان سے بولا۔ ”تم مرشد کو کب سے جانتے ہو؟“

”بہت پہلے سے۔ کئی سال قبل میرے جگر بئی یا رفیع خان سے سنا میں نے کوئی کام لیا تھا۔ اس سلسلہ میں ملنے میں بھی سائیں سرکار کے پاس آیا تھا اور میری دنیا بدل گئی۔“

ریاست خان بڑی عقیدت سے مرشد کا نام لے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پوری طرح مرشد کے ٹرانس میں ہے۔

”گلتا ہے دنیا گول ہے، بالکل گول ہے۔ مرحوم فتح خان سے بھی سلسلہ مل گیا۔“ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے ریاست خان سے پوچھا۔ ”مرشد کا وہ مرید کب سے اس آدمی کے لیے کام کر رہا ہے؟“

”میں سائیں سرکار کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ آفاق نامی وہ مرید مجھے لے کر باہر چلا آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”ریاست خان تم کو ہم ایک کام دینا چاہتا ہے، کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیسا کام؟“ وہ بولا۔ ”ایک چھوٹا سا کام ہے جو آپ کسی سے بھی کرا سکتے ہو۔ کام کے بارے میں معلومات اس فون نمبر سے ملے گی۔ سائیں سرکار نئی خانقاہ کی تعمیر کے لیے فنڈ جمع کر رہے ہیں اور اگر کوئی ایسا دیا کام آجاتا ہے تو یہ سوچ کر لے لیتے ہیں کہ ایک اچھے مقصد کے لیے بظاہر برانظر آنے والا کام کرنا جائز ہے کیونکہ خانقاہ بن گئی تو لاکھوں افراد کی ہدایت کا سامان ہو جائے گا۔ میں خود بھی خانقاہ کی تعمیر کے لیے کچھ دینا چاہتا تھا اس لیے فوراً راضی ہو گیا۔ میں نے اس کو ہاں کر دیا۔ یہ بات تین مہینے پہلے کی ہے۔ اس نے جو کام دیا تھا وہ ایک آدمی تک ایک سوٹ کیس پہنچانا تھا۔ وہ سوٹ کیس یہاں آکر لینا تھا۔ میں نے وہ کام کر دیا۔ اس کا معاوضہ اتنا ملا کہ ایک بڑی رقم میں نے خانقاہ کے لیے دے دی جسے لے کر سرکار خوش ہو گئے۔ اس کے بعد اس بندے سے پھر بات نہ ہوئی۔ میں اسے بھلا بیٹھا تھا کہ ایک ہفتہ قبل فون آگیا۔ اس نے اس بار جو کام بتایا اور ایڈوانس میں پچاس ہزار روپے اسی مرید سے بھجوائے تو میں بھاگتا ہوا کراچی پہنچا اور وہاں سے ان تینوں کو لے کر یہاں آگیا۔“

میں برسر مطلب آگیا۔ ”جس کی تلاش میں گئے تھے وہ کیوں نہیں آیا؟“

”گزشتہ بار جس دن کا بولا تھا وہ اس کے دو دن بعد آیا۔ ہو سکتا ہے اس بار تین روز بعد آئے۔“ ریاست خان نے اپنے زخمی ہاتھ کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہیم نے پیر کا دباؤ کم کر دیا تھا۔“

”گزشتہ بار وہ کیا دینے آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”رقم دینے آیا تھا جو میں دو سوٹ کیس میں بھر کر یہاں سے لے گیا تھا۔“

”اچھا یہ بتاؤ وہ دیکھنے میں کیسا ہے۔ چینی، پاکستانی یا انگریز ہے؟“

”شکل تو بالکل پاکستانیوں جیسی ہے لیکن اردو بہت خراب ہے۔ شین نہیں بولتا اور نہ قاف یا خے بول سکتا ہے۔“

اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ انڈین ہے اس لیے کہ انڈین قاف اور خ بول نہیں پاتے۔ خبر کو کھم کہیں گے۔ لگتا ہے خانقاہ کی بربادی کے بعد مرشد مزید نیچے گر گیا ہے۔ انڈین مذہبی رہنماؤں کی تاک میں رہتے ہیں تاکہ ان کو استعمال کر سکیں۔ اسی لیے ان کے ایجنٹ ایسے لوگوں سے دوستی بڑھا کر اپنا کام نکالتے ہیں گویا وہ انڈین کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا ہے اور یہ بات میرے لیے قابل نفرت تھی۔ میں اسے کسی بھی حالت میں معاف نہیں کر سکتا۔ ملک دشمنوں کو معاف کرنا میری سرشت میں شامل ہی نہیں۔ اب میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔ میں اپنی سوچ میں غلطاں تھا کہ وہیم کی آواز سماعت سے ٹکرائی:

”یاد رکھنا اگر ایک بات بھی غلط ثابت ہوئی تو اپنی تمام انگلیوں سے ہاتھ دھو لو گے۔“ وہیم کی آواز میں ایسی سفاکیت تھی کہ سننے والے کے جسم میں سرد لہر دوڑ جائے۔

”میں جھوٹ نہیں بولتا ماں کی قسم۔“

پختون کتنا بھی غلط کام کر لے لیکن ماں کی قسم نہیں کھاتا۔ وہ واقعی سچ بول رہا تھا اس کا مجھے یقین آ گیا تھا اس لیے میں نے کہا۔ ”وسیم اسے چھوڑ دو۔“

وسیم نے اس کے ہاتھ پر سے پیر اٹھا لیا۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس کے چہرے سے کرب کے آثار مٹ گئے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے زخمی ہاتھ کو اٹھایا اور بغور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ تب میں نے سفیر سے کہا۔ ”اپنے بیگ کو ٹٹو لو اگر فرسٹ ایڈ کا سامان ہے تو اس کی مرہم پٹی کر دو۔“

ریاست خان نے ترحم نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ سفیر نے بیگ سے فرسٹ ایڈ کٹ نکالی اور اس کے ہاتھ پر دو الگا کر پٹی باندھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہاری باتوں پر یقین ہے لیکن سوچ کر دیکھو۔ وطن ہماری ماں ہے۔ اس ماں کی عزت سے کوئی کھیلے تو کیا تم برداشت کر لو گے؟“

اس نے نظر اٹھا کر کہا۔ ”میرا وطن میری جان ہے۔ ہم چور ہے بدمعاش ہے۔ غلط کام بھی کرتا ہے لیکن کبھی وطن دشمنی نہیں کر سکتا۔“

ریاست خان کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اسے استعمال کیا گیا ہے ورنہ یہ آدمی غدار وطن نہیں ہے۔ میں نے گرم لوہے پر چوٹ ماری۔ ”لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو یہ وطن سے غداری ہے۔ تمہیں نہیں پتا کہ جس سے تم ملنے آئے ہو وہ ہمارے ملک میں انتشار پھیلانے کے لیے سازش رچا رہا ہے اور اس کام میں تم ان کے مدد گار بن گئے ہو۔“

میری بات پر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جی نہیں ہم وطن کے خلاف ہونے والا کسی سازش کا شکار بن نہیں سکتا۔“

”مجھے یقین ہے تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے لیکن انجانے میں کچھ لوگ آلہ کار بن جاتے ہیں۔ جیسے تم بن گئے ہو۔“

”اگر یہ بات ثابت ہو گیا تو ہم اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرے گا۔“

”مجھے تم سے یہی امید ہے۔ اس لیے تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔ آنے والے کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس کی اصلیت جان چکے ہو۔ اس سے حقیقت اگلو آنے کی کوشش کرو کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ پھر ہم کوئی لائحہ عمل تیار کریں گے۔“ میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آپ کو یقین ہے یہ سچ بول رہا ہے؟“ سفیر نے انگلش میں پوچھا۔ اس کا انداز اسپیش تھا کہ اگر ریاست خان انگلش جانتا بھی ہو تو مفہوم آسانی سے سمجھ نہ آئے۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اسی لہجے میں کہا:

”انسان کتنا ہی بڑا شاطر کیوں نہ ہو مگر اس کی آنکھیں سچ بولتی ہیں۔ میں پوری گفتگو کے درمیان اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات ہی دیکھتا رہا۔ وہ سو فیصد سچ بول رہا ہے۔ باتوں سے تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ یہ مذہب پرست ہے۔ انتہائی معصوم۔ ایسے لوگ مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے بے وقوف بنا دیئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ یہ مرشد کی وجہ سے بے وقوف بن گیا ہے۔“

”کیا یہ اب ہمارا ساتھ دے گا؟“

”ایسے لوگ وطن کے لیے جذباتی ہوتے ہیں۔ بھول گئے۔ 1947 میں یہ پختون ہی تھے جو ایک آواز پر کشمیر کے برادرانِ ایمانی کو ڈوگر ظلم سے آزاد کرانے کے لیے خود ہی اپنے علاقوں سے نکل کر کشمیر پہنچ کر سری نگر تک گھس گئے تھے۔ ان غیور بہادروں کے بارے میں میرا خیال غلط نہیں ہو سکتا۔ اب یہ اپنے ہاتھوں سے اس بندے کو شوٹ کرے گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ریاست خان اپنا زخمی ہاتھ سنبھالے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بریلے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اندھیرا پھیل گیا تھا۔ سرد ہوائیں مزاج پوچھنے لگی تھیں۔ میں نے اتاری ہوئی جیکٹ کو دوبارہ سے پہن لیا۔ زپ لگا رہا تھا کہ ریاست خان نے کہا۔ ”وہ آگیا؟“

”اس اندھیرے میں بریلے میدان کو پار کر کے وہ آ رہا ہے۔ تعجب کی بات ہے۔“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”گزشتہ بار بھی وہ رات کے وقت آیا تھا۔ یہ بات یاد آیا تو میں کھڑکی پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور واقعی وہ آگیا۔ ٹارچ سے اشارہ کر رہا ہے۔“ ریاست خان کے کہنے پر میں نے ادھر دیکھا۔ سامنے بریلے میدان میں بار بار ٹارچ جل بجھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا:

”اس اشارے کا جواب کیسے دو گے؟“

”اسی طرح ٹارچ کے ذریعہ۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر اشارہ دو۔“ میرے کہنے پر اس نے کمرے کے ریک پر رکھے ٹارچ کو بائیں ہاتھ سے اٹھایا اور کھڑکی پر آ کر جلانے بجھانے لگا۔ ادھر سے تین بار ایک ساتھ جلایا بجھایا گیا اور پھر ٹارچ بند ہو گئی۔

”وہ مجھے بلا رہا ہے۔“ ریاست خان نے کہا۔

”چلے جاؤ مگر احتیاط سے۔ ہم تمہارے قریب ہی ہوں گے مگر کچھ دیر سے نکلیں گے اور ضرورت پڑی تو مدد بھی کریں گے۔“ میرا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ وہ بولا:

”ہماری باتیں کیسے سنیں گے؟“

”واقعی یہ بات اہم ہے۔“ میں نے کہا پھر سفیر کی طرف مڑ کر بولا۔ ”راجا صاحب بغیر تیاری کے تم لوگوں کو لے کر نکلے نہیں ہوں گے۔ یقیناً تمہارے پاس واکی ٹاکی ہوگی؟“

”جی ہاں ہے اور بہت اعلیٰ قسم کی ہے۔“ کہہ کر وہ اپنے بیگ کو کھولنے لگا۔ زپ کھولتے ہوئے بولا۔

”وسیم اور عبداللہ کے پاس بھی ہے۔ سب دیکھ لیں کہ چارج ختم تو نہیں ہوا۔“

وسیم اور عبداللہ نے بھی واکی ٹاکی نکال لیا جو بہت ہی چھوٹا تھا۔ اسے بہ آسانی کار میں لگایا جاسکتا تھا۔

میں نے سفیر والا واکی ٹاکی لے کر ریاست خان کی طرف بڑھا دیا۔ ”اسے اپنے اوپر والی جیب میں رکھو۔ ہم سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف تمہاری باتیں سنیں گے۔ اس لیے اسے نکالنے کی بھی ضرورت نہیں۔“

ریاست خان نے اسے قیص کے گریبان میں رکھا اور پھر بولا۔ ”اس طرح کوئی دیکھ بھی نہیں پائے گا اور رابطہ بھی رہے گا۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے اس کی تعریف کی۔ وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔ ان کے ساتھی جیدے نے ٹارچ ساتھ لے لی تھی جسے وہ جلا کر آگے بڑھ رہا تھا۔ شاید یہ بھی اسے انسٹرکشن دیا گیا تھا۔ وہ دونوں آگے بڑھتے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سفیر سے کہا کہ وہ وسیم اور عبداللہ سے نکل کر دے۔ وسیم پہلے ہی کنکٹ ہو چکا تھا۔ اس نے رسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے کان میں لگا لیا۔ نیر نے بھی عبداللہ والا سیٹ لے لیا۔

”سفیر اور ہم ان کی طرف جا رہے ہیں۔“ کہہ کر میں نے سفیر کو مخاطب کیا۔ ”جھک کر آگے بڑھنا ہے۔ جب فاصلہ بہت کم رہ جائے تو لیٹ کر کروٹ لگ کرتے دئے آگے بڑھنا ہے۔“

”اوکے بوس۔“ سفیر نے ہنس کر کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ہم دونوں آگے پیچھے باہر نکلے اور جھک کر چلنے لگے۔ ہم نے کوشش کی تھی کہ دور سے اگر کوئی دیکھے بھی تو جانور کچھ نظر انداز کر دے۔ میرا پورا دھیان کان میں لگے مائیک پر تھا۔ اب تک صرف سائیں سائیں کی آواز آرہی تھی جو اس بات کی تشریح تھی کہ وہ دونوں ابھی آنے والے سے دور ہیں۔ باتیں ہوتی تو آواز آتی نا۔

ہم آگے بڑھتے ہوئے اب اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی تھی اور پھر بریلا میدان تھا۔ ٹھنڈی ہوا ہڈی میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جیکٹ بھی اس سرد لہر کو روکنے میں ناکام تھی، سینے کے سامنے کا حصہ پوری طرح بھیگ چکا تھا اور برف کی ٹھنڈک سینے کو چھید رہی تھی۔ سامنے سے اڑ کر آتے برف کے ذرات سینے پر جمع ہو رہے تھے اور اس کی ٹھنڈک اندر تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن ہم نہ سیدھے ہو سکتے تھے اور نہ رک سکتے تھے۔ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ابھی ہم نے دو تین قدم ہی بڑھائے تھے کہ کانوں میں آواز گونجی:

”آگے۔ ہمیں پوری امید تھی کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گے۔“ شاید آنے والے نے ریاست خان کو مخاطب کیا تھا۔

”جی ہم وقت پر آگئے تھے۔ صبح بھی ادھر آئے تھے لیکن آپ پہنچے نہیں تھے۔“ ریاست خان کی آواز سنائی دی۔

”ہم پہلے دیکھتے ہیں کہ کوئی اور تو ساتھ نہیں ہے۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو جاتا ہے تب آتے ہیں۔“

”اس موسم میں ادھر کون آئے گا۔ مقامی لوگ جب آبادی خالی کر جاتے ہیں تو یہاں کوئی کیا کرنے آئے گا؟“ یہ آواز جیدے کی تھی۔

”کبھی کبھی کوئی مہم جو آ جاتا ہے۔ ٹریکنگ کے لیے۔“ وہی آواز پھر سنائی دی۔ ”ادھر ہم نے کچھ لوگوں کی آمد محسوس کی ہے۔ کوئی نظر تو نہیں آیا لیکن پیروں کے نشان نظر آئے ہیں۔“

”جی ہاں ایک پارٹی اوپر سے آئی ہے لیکن رکی نہیں۔ نیچے کی طرف چلی گئی۔“ ریاست خان نے کہا۔

”تم نے انہیں نیچے جاتے دیکھا ہے نا؟“

”جی ہاں۔“

”ان کی نظر تم لوگوں پر پڑی؟“

”جی نہیں۔ وہ ہمیں دور سے آتے ہوئے نظر آئے تھے کہ ہم لوگ ایک خالی گھر میں چھپ گئے۔“

”یہ اچھا کیا۔ اب یہ بتاؤ کہ جو سامان میں تم لوگوں کو دوزں گا اسے کیسے لے جاؤ گے؟“

”ہم دوکانی ہیں۔ اسے اٹھالیں گے۔“

”اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سیلج نما گاڑی تیار کرائی ہے۔ اسے بہ آسانی کھینچ لو گے۔“

”کیا اسے شہر تک لے جانا ہے؟“

”نہیں اسے کہیں۔ لے جانا نہیں ہے۔ اس میں جو سامان ہے اسے غاروں میں رکھنا ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر

غاروں کے اندر یہ والا پکٹ رکھنا ہے۔“ شاید اس نے کوئی پکٹ دکھایا تھا۔ ”یہ والا پکٹ نکال نکال کر غار میں رکھنا ہے۔“ اس نے کیا دکھایا تھا یہ میں دیکھ تو نہ سکا لیکن اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی دھماکا خیز مواد ہے۔ تبھی دوسری جانب سے پھر وہی منحوس آواز ابھری۔ ”اور پھر پرسوں عین اس وقت جب برف کا طوفان اٹھے تو یہ ریموٹ دبا دینا ہے۔ لیکن خود کسی محفوظ مقام پر رہنا۔“

اب مجھے اچھی طرح یقین ہو چکا تھا کہ وہ کوئی ٹائم بم ٹائپ کی چیز ہے۔ یہ ایک بہت خطرناک بات تھی۔ میں اندر تک کانپ اٹھا تھا۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو بہت بڑی تباہی پھیلتی۔ غصے سے میرے جڑے بھنج گئے تھے۔ اب ہم ان کے اتنے قریب آچکے تھے کہ ان کی نظر پڑ سکتی تھی۔ اس لیے لیٹ گئے۔ مجھے لیٹنے دیکھ سفیر بھی لیٹ گیا۔ یہ کام مزید اذیت رساں تھا کیونکہ کہنا آسان ہے کہ برف پر لیٹ جاؤ لیکن جب کوئی لیٹتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ بر فیلے میدان میں لیٹنا کتنا مشکل ہے۔

جیکٹ ایک منٹ میں شرابور ہو گئی اور سرد لہر پورے جسم میں دوڑنے لگی۔ جسم کی گرمی بھلے ہی اس سرد لہر کو روکنے میں ناکام رہی ہو لیکن دماغ میں جو گرم لہر اٹھ رہی تھی اس نے میرے اندر بھٹی سی سگاد دی تھی۔ اگر وہ ریموٹ والا جملہ سنا نہ ہوتا تو شاید اتنی دلچسپی سے اس کے قریب پہنچنے کی کوشش نہ کرتا لیکن یہ میرے وطن کا سوال تھا اور جب وطن کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے اور یہ اطلاع مجھ تک پہنچ جائے تو میں آگ کے سمندر میں بھی چھلانگ لگانے کو تیار ہو جاتا ہوں۔ اس وقت تو ثبوت بھی سامنے تھا۔ اس کو سزا دینا ضروری تھا۔ ان آنکھوں کو پھوڑنا تھا جو میرے وطن پر بری نظر ڈال رہی تھیں۔ اس لیے میں پوری دلجمعی سے آگے کی جانب سرک رہا تھا۔

اب وہ مجھ سے بہ مشکل ایک فرلانگ کی دوری پر تھا۔ اگر میں کھڑے ہو کر دوڑ سکتا تو اسے دبوچ چکا ہوتا لیکن مجبوری تھی کہ میں دوڑ نہیں سکتا تھا ورنہ وہ بھی دوڑ لگا دیتا۔

مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہاں سے سرحدی پٹی کتنی دور ہے۔ ”نومین لینڈ“ ایریا کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ عام طور سے ہر سرحدی پٹی پر ایسے نشانات لگا دیئے جاتے ہیں جو سرحد کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن ان پہاڑوں پر کہیں بھی ایسے نشانات نہیں تھے جو بارڈر کی نشاندہی کرتے۔ اسی لیے میں احتیاط برت رہا تھا کیونکہ وہ

دوڑ کر اپنی حدود میں چلا جاتا تو میں بھی اس کے تعاقب میں دوڑ پڑتا اور پھر ایک نئی کہانی شروع ہو جاتی۔ ویسے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ تخریبی کارروائی کے لیے آیا ہے۔ ایسے لوگ معصوم لوگوں کو پھانس کر اپنا کام نکالتے ہیں اور اپنے ہی لوگ نادانستگی میں اپنا نقصان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے بقول ریاست خان کہ گزشتہ بار وہ نوٹوں سے بھرا سوٹ کیس پہنچا گیا تھا جسے ریاست خان نے راولپنڈی کے کسی شخص کو پہنچایا تھا۔ مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ نوٹ جعلی ہوں گے۔ یعنی نادانستگی میں ریاست خان نے ملک کی معیشت کو بری طرح نقصان پہنچا دیا تھا۔ اس بار تو بہت بڑی سازش کرنے آیا تھا جس کے نقصان کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ جو کچھ وہ چاہ رہا تھا ایسا ہو جاتا تو بہت بڑی تباہی پھیلتی۔ ایسی تباہی جس کا زخم برسوں بھلایا نہیں جاسکے گا۔ اس کے پلان کو مکمل کام بھی کرنا تھا اور اسے انجام تک پہنچانا بھی تھا۔ اس نے میرے وطن کی طرف میلی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے اسے سبق دینا ضروری تھا۔

میں نے سرکنے کی رفتار بڑھا دی تھی۔ سانپ کی طرح تیزی سے آگے کی سمت بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میری تیز رفتاری کا مقابلہ سفیر بھی کرنے لگا تھا اس لیے ابھی وہ کافی پیچھے تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ واپس مڑا تھا کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے کھڑے ہوتے ہوئے وہ دیکھ نہ سکا لیکن جب میں دوڑا تو وہ سرعت سے پلٹا تھا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اسے بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا اسی لیے وہ دوڑا تھا لیکن میرے ساتھ میرا جذبہ بھی تھا اس لیے وہ ناکام رہا۔ میں نے ہوا میں اچھل کر سر سے اس کی پیٹھ پر ٹکر ماری تھی۔ وہ ٹکر لگتے ہی گرا تھا کہ میں اس پر سوار ہو گیا۔ اب وہ نیچے اور میں اوپر تھا۔ میں نے اس کی گردن پکڑنے کی کوشش تھی کہ وہ بام مچھلی کی طرح پھسل گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اٹھ کر کھڑا بھی ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی جیکٹ پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ اپنے جیکٹ کو چھڑانے کے لیے جھک مارنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے سامنے کی جانب کھینچ لیا۔ اس کا سر آ کر میرے سینے سے ٹکرایا تھا کہ میں نے گھٹنے سے اس کی ٹانگوں کے بیچ ضرب لگائی۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا دوہرا ہو گیا۔

اس کا ساتھی بھاگنے کی کوشش کرتا کہ اس پر سفیر آ پڑا۔ وہ دونوں بھی گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے مد مقابل کی ناک پر سر سے ٹکر ماری اور ساتھ ہی ساتھ اپنا پسندیدہ داؤ چلا دیا۔ جو ڈوکا یہ داؤ خطرناک تو تھا ہی لیکن اگر مد مقابل بھی اس داؤ کو جانتا ہو اس کے توڑ میں داہنی جانب جھک جائے تو داؤ چلانے والے کے لیے مشکل پڑ جاتی ہے۔ لیکن یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہ تھا۔ میں نے اسے کمر پر لاد کر زمین پر دے پٹھا تھا۔ اس دھوبی پاٹ نے رہی صحیح کسر نکال دی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر رک ماری۔ وہ سنبھلتا کہ اوپر سے میں نے ایک اور بوٹ کی ٹھوک ماری اور پھر مارتا چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کیسا اینٹ تھا جسے اپنے بچاؤ کا بھی علم نہ تھا اور پٹنا چلا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے سر گردا دیا، اسے بے ہوش دیکھ کر میں نے خود کو روک لیا۔ لیکن سفیر اپنے شکار کی مسلسل پٹائی کیے جا رہا تھا۔ اس نے شکار کی بری حالت کر دی تھی۔ کہیں وہ مرنے جائے اس ڈر سے میں نے کہا۔ ”سفیر اب بس کر دو۔“

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے میری پیٹھ پر گر کر پڑا ہو۔ میں جھکتا چلا گیا۔ اسی وقت میری کمر پر بوٹ کی ٹھوک لگی اور میں آگے کی سمت اوندھے منہ گرا تھا لیکن میں گرتے ہی آگے کی سمت پھسلتا چلا

گیا تھا۔ برف کی وجہ سے یہ کام آسان ہوا تھا کیونکہ میں نے خود آگے کی سمت جھکولایا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرے پے در پے وار نے اسے سنہلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے دھوکا دینے کے لیے بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کی اور میں اس کے جھانے میں آگیا جس کی وجہ سے میرے پٹنے کی باری آگئی مگر میں حلو نہیں تھا کہ کوئی بھی کھالے۔ اسی وقت میں نے آگے پھسل کر خود کو سنہالا اور جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہی ایک اور جست بھری۔ اس جست نے مجھے اس سے دور کر دیا۔ اب میں کھڑا ہو چکا تھا۔ پوری طرح سنہل چکا تھا کہ اس نے فلائنگ کلک چلائی۔ اس کا نشانہ میرا سینا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ اس کی لات میرے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے جھکی ہوئی حالت میں ہی فیٹ چلایا تھا جو سیدھا اس کے پیٹ میں لگا۔ اس کی کراہ سنتے ہی میں نے پھرتی سے ٹانگ اوپر کی سمت گھمائی تھی جو نشانے پر لگی۔ شاید اس نے مجھے عام سا فائٹر سمجھا تھا۔ میں جس طرح برف پر قدم جمائے ہوئے اسے ٹھوکروں سے اڑا رہا تھا یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی اسی لیے وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا مگر سنہلنے سے پہلے ہی اس پر میری ٹھوک پڑ جاتی۔ اگر وہ اسی طرح بے ہوش بنا پڑا رہتا تو شاید اس کی بچت ہو جاتی مگر اس نے اٹھ کر غلطی کی تھی۔ یہی نہیں اس نے دوسری غلطی یہ کی تھی کہ اس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ اب یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مسلسل پٹ رہا تھا۔ اگر وہ ایسی غلطی نہ کرتا تو شاید اس کی حالت یہ نہ ہوتی جو اب ہو رہی تھی اندھیرا تھا پھر بھی مجھے یقین تھا کہ اس کے سامنے کا ایک بھی دانت سلامت نہیں ہوگا کیونکہ میرے پیروں میں برف پر چلنے والے بوٹ تھے جس کے تلے میں اور ٹو میں لوہے کی کیلیں تھیں تاکہ برف پر قدم جم سکے۔ اس بھاری بوٹ کی ٹھوکر نے اس کے منہ کا بھرتا بنا دیا ہوگا۔ آخری بار میں نے داہنی ایڑی پر زور ڈال کر بائیں پیر کو اٹھا کر پوری قوت سے چکر پھیری کھائی تھی۔ میری گھومتی ہوئی لات اس کی داہنی پسلی پر پڑی تھی اور وہ برف کی وجہ سے پھسل کر دور جا گرا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اچھال بھری تھی اور اس کے جسم پر کودا تھا۔ یہ وار اس کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوا اور اس کی چیخ دور تک گونجی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے میں پوری طرح دیکھ نہیں پایا کہ اس کی حالت کیا ہے۔ میں نے ریاست خان کو آواز دی۔ ”نارچ جلاؤ۔“

اب تک وہ خاموش تماشا بنی ہوا تھا۔ میری آواز پر وہ ایسے چونکا جیسے خواب سے جاگا ہو۔ اس نے پھرتی سے نارچ روشن کر دی۔ نارچ کی روشنی اس پر پڑی تو میں چونک اٹھا۔ دشمن وطن کا سر ڈھلکا ہوا تھا اور منہ سے خون جاری تھا جو برف پر دور تک پھیل رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر کو ہلایا لیکن اس کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو میں نے اس کی ناک پر انگلی لگا کر سانس کی آمد و رفت محسوس کرنے کی کوشش کی پھر دل کی دھڑکن محسوس کی لیکن تمام علامات نفی کر رہے تھے۔ میں نے سراٹھا کر سفیر سے کہا۔ ”یہ تو گیا کام سے۔“

”خس کم جہاں پاک..... اچھا ہوا ایک دشمن تو کم ہوا۔“ پھر اس نے اپنے شکار کو ٹھوکر مار کر کہا۔ ”اس کا انجام دیکھ لیا نا اب تیری باری ہے۔“

”ہم آپ کے پیر پڑتے ہیں ہمیں جانے دیں۔“

”ضرور جانے دیں گے لیکن پہلے اپنے بارے میں بتاؤ۔“

”یہاں نہیں اسے کھینچ کر اپنے جھونپڑی نما ہیڈ کو ارٹھ لے چلو وہاں عبداللہ زیادہ آسانی سے معلومات اگلو

لے گا۔“ میں نے کہا تو ریاست اور جیدے نے پھرتی دکھائی اور اسے ڈنڈا ڈولی کے انداز میں اٹھالیا اور پھر ہم

سب واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اس بار راستہ تیزی سے طے ہوا اور ہم سب جلد اپنے مرکز پر پہنچ گئے۔ عبداللہ نے قیدی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ہم اسے کیوں لے کر آئے ہیں۔ اس نے ریاست خان سے کہا۔ ”اسے وہاں لٹا دو اور میرے بیگ سے پلاس نکال کر لاؤ تاکہ میں اس کا ایک ایک دانت نکال کر دیکھوں۔ کہیں کسی طرف جھوٹ تو چھپا نہیں رہ گیا ہے۔“ اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ اچھے اچھے کی ہوا سرد ہو جائے۔ وہ جلاد کی نظر سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ سفیر کی مارنے اسے پہلے ہی ادھ موا کر دیا تھا رہی سہی کسر اس کے ساتھی کی موت نے پوری کر دی تھی۔ اب جو اس نے سنا کہ عبداللہ اس کے دانت نکالے گا۔ وہ باضابطہ رونے لگا۔ وہ کسی بیوہ عورت کی طرح بکین کر رہا تھا۔ ”میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے ہیں۔ بوڑھی ماں ہے، مجھے جانے دیں اب ہم کبھی پاکستان نہیں آئے گا۔“

”ابے چپ ورنہ تیری بوڑھی ماں پر بھی ہمیں رحم نہیں آئے گا۔“ وسیم نے جھلا کر کہا۔ ”پہلے یہ بتا کہ تُو یہاں کیا کرنے آیا تھا۔“

”سرکار ہماری ڈیوٹی سنگھ صاحب کے ساتھ لگائی تھی۔ ہم کو ان کی سہایا کرنا تھا۔“

”اچھا وہ سنگھ تھا۔ اس کا پورا نام کیا تھا؟“

”اکھیلیشو سنگھ نام تھا ان کا۔ بہوت بہادر مٹی تھے۔ ہمیشہ بجے ہوتے رہے ہیں۔ پتا نہیں کیسے وہ آپ

سے مار کھا گئے۔“

”تمہارے بوس کا نام کیا ہے؟“ سفیر نے پوچھا۔

”جی ہم نہیں جانتے سنگھ صاحب ہمیں حکم لا کر دیتے ہیں۔“

”ابے تم سب نام تو خوب رکھتے ہو۔ سنگھ یعنی شیر اور دل چو ہے جیسا، ہماری قوم کا معمولی آدمی بھی کبھی

ایسے روتا نہیں ہے۔“

”ہم کو پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ آپ لوگن کا آئی ایس آئی جس کو پکڑ لیتا ہے اس کا بھرتہ بناتا ہے۔“

”فکر نہ کرو ہم تمہارا بھرتا نہیں بنائیں گے اگر تم نے صحیح جواب نہیں دیا تو چٹنی ضرور بنائیں گے۔“ وسیم

نے پلاس ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہ سرکار نہ۔ ہم پر دیا کرو ہمارے بچے جندگی بھر تم کو دعا دیں گے۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیا تھا۔

”اچھا یہ بتاؤ تم لوگوں کا پروگرام کیا تھا؟“

”سرکار ہم کو پوری بات معلوم نہیں صرف اتنا جانے ہیں کہ یہاں ٹائم بم فیٹ کرنا ہے تاکہ بسفوت ہو اور

برف کا سیلاب پورے علاقے کو تباہ کر دے۔“ اس نے روتے ہوئے بتایا۔ ”اور راستہ بن جائے۔“

”یہ علاقہ کون سا ہے؟“ روانی میں میں نے ایک احقانہ سوال کر دیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں

سمجھ گیا کہ وہ شک میں پڑ گیا ہے کہ میں آئی ایس آئی کا ہو کر بھی علاقہ نہیں پہچانتا۔ تیرکمان سے نکل چکا تھا اب

اسے سنبھالنا ضروری تھا۔ میں نے جلدی سے کہا:

”میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو تاکہ تمہیں جانچ سکوں۔“

”او اچھا اچھا..... یہ بلتر گلیشٹر کا علاقہ ہے..... آگے ہو پر ہے۔“

”اچھا..... تو تم اس پورے علاقے کو جانتے ہو پھر کہتے ہو کہ میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔“

”سربات یہ ہے کہ میں کسی ایسے کام کے لیے پہلی بار اتنا اندر آیا ہوں ورنہ گلیشٹر سے نزدیک بھی ایک چھوٹی سی ہستی ہے جہاں گا ہک بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ وہاں میں کئی بار آچکا ہوں۔“

”سامان خریدتے خریدتے پورے علاقے کو تباہ کرنے پر اتر آئے۔“ میں نے غصیلے لہجے میں جواب دیا کیونکہ جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ کوئی معمولی بات نہ تھی میں ہل کر رہ گیا تھا۔ شاید یہ اس صدی کی سب سے بڑی تخریب کاری ہوتی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے بروقت مجھے بھیج دیا اور میں نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ گو کہ یہ اندھے کے ہاتھ بیٹر لگنے والی بات تھی لیکن کام تو ہو گیا۔ میں نے اس کے منہ پر طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔

”اس تخریب کاری کا پروگرام کس نے بنایا تھا؟ ایک ایک کا نام بتا؟“

”مجھے آج صبح ہی حکم دیا گیا، شاید اوپر سے آرڈر آیا ہو۔ مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ ہم پر کرپا کر دیں جیون بھر عدا دوں گا۔“ اس نے گڑ گڑاتے ہوئے میرے پیر پکڑ لیے۔

”تجھے چھوڑ دوں گا یہ میرا وعدہ ہے۔ لیکن تجھے ایک کام کرنا ہوگا؟“

”جی بولیں.....“ وہ اسی طرح روئے جا رہا تھا۔

”جتنے بھی ٹائم ہم ہیں ان کو تم واپس لے جاؤ گے اور اپنے علاقہ میں جا کر فٹ کرو گے۔“

”جی کر دوں گا۔“ اس نے نہایت آسانی سے وعدہ کر لیا۔

”اور اگر نہیں کیا تو؟“

”آپ خود سوچیں..... کوئی آئی ایس آئی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ آئی ایس

آئی والوں کی مدد کرنے کے لیے مسلمان پیر فقیر جا پ کرتے رہتے ہیں۔“

اس بے وقوف کی باتیں سن کر مجھے ہنسی آرہی تھی لیکن میں خاموش رہا۔ یہ تو کمال ہے کہ ہمارے

سرفروشنوں کے ڈر سے دشمن کا پتا پانی ہے اور وہ اپنے تئیں کہانیاں بنا بنا کر خوفزدہ ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے

پوچھا۔ ”یہ تم سے کس نے کہا کہ پیر فقیر چلہ کرتے ہیں؟“

”ہمارے ایک جنرل صاحب تھے۔ وہ 1965ء کی جنگ میں شریک تھے۔ وہ اخبار میں لکھتے تھے کہ ہم

گولہ باری کرتے اور کچھ لوگ سبز کپڑے والے ہوا میں اڑتے ہوئے آتے اور گولہ لے کر اڑ جاتے۔ سب کا کہنا

ہے کہ پاکستانی جا پ بہت کرتے ہیں اس لیے بھگوان کے دوست ان کی مدد کرتے ہیں۔“

”اچھا اچھا..... یہ بات یاد رہے کہ اگر تم نے میرے کہے پر عمل نہیں کیا تو میں تمہارے گھر کے ہر آدمی

کے لیے آپیشل عمل کروں گا اور کوئی بھی نہیں بچے گا۔ اس لیے جو بیگ تم لے کر آئے ہو اسے اٹھا کر لے جاؤ اور

اپنے علاقے میں اسے لے جا کر فکس کر دو۔“

”جی میں ایسا ہی کروں گا۔ بس آپ مجھے چھوڑ دیں۔“ اس کے بین سن سن کر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور

حیران بھی تھا کہ انڈین لوگ میں ایسے بزدل ہوتے ہیں۔ میں نے کہا۔

”اب ایسا کرو کہ سو جاؤ صبح بیگ لے کر نکل جانا۔“

”نہیں جناب..... اگر میں صبح گیا تو کام نہیں ہو پائے گا۔ سب جاگ رہے ہوں گے۔ رات کے

اندھیرے میں کوئی دیکھ نہیں پائے گا کہ میں بیگ لے کر واپس آ گیا ہوں۔“
 پتا نہیں وہ رہائی کے لیے جلدی کر رہا تھا کہ وعدہ نبھانے کی جلدی تھی، اس کی بے تابی دیکھ کر میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تمہیں میں چھوڑ دے رہا ہوں لیکن یاد رکھنا جو وعدہ کر کے جا رہے ہو اسے پورا کرنا ہے۔“
 ”میں بھگوان کی سوگند کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اسکے بعد ریٹائرمنٹ لے لوں گا۔“
 ”کیوں، ریٹائرمنٹ کیوں لو گے؟“

”اس لیے کہ میں ماتری بھونی کو پیار کرتا ہوں۔ اس سے غداری کروں گا تو اس کا پراپتیت تو ہونا چاہیے نا۔“

اس کی باتیں بھی عجیب تھیں مجھے کیا لینا دینا تھا میں نے اس سے کہا۔ ”جو کچھ کرنا ہے کرتے رہنا لیکن مجھ سے جو کہا ہے اسے پورا ضرور کرنا ورنہ گھر میں گھس کے ماروں گا۔ یہ فلمی ڈائلوگ نہیں ہے۔ جیسے کھیم کرن میں گھس کر مارتا دیکھو، وہی دہلی میں گھس کر ماروں گا۔“

”مجھے یقین ہے آپ ایسا ہی کریں گے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ میں وعدہ نبھاؤں گا۔“
 ”اچھا یہ بتاؤ کہ یہاں سے بارڈر کتنی دور ہے؟“

”بارڈر تو بہت دور ہے اگر پیدل چلا جائے تو ایک دن لگ جاتا ہے لیکن یہاں سے ایک ایسا گاؤں ہے جہاں ہم آتے جاتے رہتے ہیں۔ پہلے ہم راجستھان آتے جاتے تھے اب ہم ادھر سے راستہ بنارہے ہیں کیونکہ ادھر چائنا بھی نزدیک ہے اور خطرہ بھی کم ہے چائنا کا مال آسانی سے لاکر ہیلی کاپٹر سے لے جا سکیں گے۔ راستہ بن جائے تو اور آسانی ہو جائے گی۔ یہاں سستل جاتا ہے اس لیے ہم مہینے میں ایک بار آدھا راستہ ہیلی کاپٹر پر اور باقی راستہ برف گاڑی پر پھر پیدل چل کر آتے ہیں۔ ہم میٹ لینے ہی آئے تھے کہ پیچھے سے اکھلیشو رینگھ آگیا۔ اس نے کہا کہ اسے کوئی سامان کسی کو دینا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی ہم غریب لوگوں کو کچھ نہ کچھ دے کر چھوٹا موٹا کام کراتے رہے ہیں اس لیے میں راضی ہو گیا۔“
 ”تم نے ابھی کہا تھا کہ رات میں حکم آیا تھا۔“

”ہم جب ادھر آتے ہیں تو وائرلیس پر بوتھ سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اکھلیشو رینگھ کے آتے ہی ہمارے بوس کا بھی حکم آگیا۔“

میں نے دسیم کی طرف مڑ کر کہا۔ ”اس کی مرہم پٹی کر دینا۔“
 ”نہیں نہیں..... اگر مرہم پٹی کرا کر گیا تو میرے لوگوں کو شک ہو جائے گا۔ بس مجھے ایسے ہی جانے دیں۔“ وہ گڑگڑایا۔

”ٹھیک ہے جاسکتے ہو۔“ میں نے کہا اور اپنے بیگ کی طرف جھک گیا۔ میں اس میں ڈیکٹا فون دیکھ رہا تھا لیکن ملا نہیں اتنے میں اس کی آواز سنائی دی۔ ”میں جاؤں؟“

”ہاں جاؤ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اصل میں اب وہ میرے کسی کام کا نہیں تھا جو پوچھنا تھا پوچھ لیا تھا۔ اب اسے رکھنا بیکار تھا پھر مجھے کوفت بھی ہو رہی تھی کہ ڈیکٹا فون آتے وقت رکھا تھا لیکن اس وقت ملا نہیں، اگر مل جاتا تو میں اس کے لباس میں چھپا دیتا۔ وہاں جتنی باتیں ہوتیں وہ میں بہ آسانی سن لیتا مگر اب

کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ وہ ننھا سا فون ملا نہیں اور قیدی بھی جا چکا تھا، میں نے زپ بند کی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ ایک نقطے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ جو وعدہ کر کے گیا ہے وہ پورا کرے گا مگر بارود تو ہمارے یہاں سے چلا گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ شہر پہنچ کر کسی طرح یہ خبر فوج تک پہنچا دوں گا کہ دشمن اب ایسی سازش کرنے پر اتر آیا ہے جو عام نظر میں قدرتی آفت لگے۔ اب تک وہ دریاؤں میں پانی چھوڑ کر سیلابی ریلے کی صورت میں تباہی پھیلاتا رہا ہے اب اس نے یہ راہ اختیار کی ہے۔ اس پر نظر رکھی جائے۔

”بھائی میاں اب سو بھی جاؤ۔ ہمیں صبح ہی یہاں سے نکلنا ہے۔“ سفیر نے آواز دی تو میں ہوش کی دنیا میں آ گیا۔ اور بستر کی طرف بڑھ گیا۔ تھکن اور پھر اطمینان، اس لیے لیٹتے ہی نیند کی رانی نے ہانہوں میں بھر لیا اور میں بے خبر ہو گیا۔

کتنی دیر سو یا اس کی خبر نہیں۔ جاگا تو رات نے صبح کا چولہ اوڑھ لیا تھا۔ باہر سورج اپنی تابناکی پھیلا رہا تھا۔ سفیر اور وسیم بھی اٹھ چکے تھے۔ ان کی باتوں نے ہی مجھے بیدار کیا تھا۔ عبد اللہ بھی کپڑے تبدیل کر کے کھڑا تھا اور وسیم سے کسی بات پر بحث کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا ارادہ ہے؟“

”ارادہ کیا۔ بس نکل چلتے ہیں۔ پتا نہیں کون کون کس کس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ اب تو ایک ایک پل گزارنا سفیر کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔“ وسیم نے کہا تو سفیر غرا کر پلٹا:

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ سادی کی یاد دہلا رہی ہے کہ جاتے ساتھ وہ مزاج پُرسی کرے گی۔“

”خدا کا خوف کھاؤ۔“ وسیم چہکا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ مونا کا خوف سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ جاتے ہی وہ پوچھے گی۔ کر آئے آوارہ گردی۔“

”اور تب میں مونا باجی سے کہوں گا کہ آپ انہیں کچھ نہ کہیں، یہ تو سویرا بھابی کی دعا کو اثر دینے گئے ہوئے تھے۔ تاکہ جلد سے جلد ملاپ کا منظر سب دیکھ سکیں۔ ہجر کی غزدہ شب کو سحر نصیب ہو اور وصال کا موسم قریب آجائے۔“ عبد اللہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ تو سو فیصد صحیح ہے کہ شہباز کا نام آتے ہی سب عورتوں کا غصہ کا فور ہو جائے گا۔ سوائے مونا کے۔“ سفیر نے کہا۔ ”اس لیے کہ مونا بڑی شد و مد سے کہہ رہی ہے کہ کسی بھی طرح شہباز کو دبی لے کر چلو۔ وہ جب تک پاکستان میں رہیں گے سب پھر کی بنے گھومتے رہیں گے۔“ سفیر نے بیگ کندھے سے لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

”اللہ کے بندوں بھوکے پیٹ کیسے پیدل چلو گے۔ کچھ کھانے پینے کا سامان ہو جاتا تو اچھا تھا۔“ میں نے کہا۔

”حضور کے گوش گزار کردوں کہ صرف چادل پڑے ہیں۔ ان کو پکاتا تو کھاتا کون اس لیے سوچا ہے کہ اب نکل لیا جائے تاکہ جلد از جلد کسی آبادی تک پہنچا جاسکے۔“ سفیر نے کہا۔

”آبادی ہے کتنی دور اس کا پتا نہ تمہیں ہے اور نہ مجھے۔ اور اس آبادی کا بھی حال یہی نکلا تو؟“ میں نے ہدشہ ظاہر کیا۔

”یہ علاقہ گلیشٹر سے متصل ہے اس لیے لوگ گاؤں خالی کر گئے ہیں لیکن نچلے حصے کے لوگ اس خطرے

سے مبرا ہوں گے اس لیے قوی امید ہے کہ وہاں کھانے پینے کا سامان وافر مل جائے گا۔“
”اور اگر نہیں ملا تو؟“

”ہم پانی پی کر گزرا کر لیں گے۔“ اس نے ہنس کر کہا اور قدم بڑھا دئے۔

ریاست خان، جیدے، اللہ ڈینو اور اس کا چوتھا ساتھی صغیر بھی ساتھ تھا۔ وہ سب ایک رات میں ہمارے معتقد ہو گئے تھے۔ انہوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ اب وہ غلط کام کبھی نہیں کریں گے کیونکہ غلط کام کرنے والے ہی ملک دشمن قوتوں کے شکار بنتے ہیں۔ ریاست خان فطرتاً شریف آدمی تھا۔ وہ کسی مجبوری میں ہی غلط لوگوں کے ساتھ شامل ہوا ہو گا اسی لیے اتنی جلدی مان گیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی خوف سے یا عقیدت سے ہماری تعظیم کر رہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

ہم نے صبح کے وقت سفر شروع کیا تھا اور اس وقت سورج سر پر پہنچ گیا تھا لیکن کسی آبادی کا نشان نظر نہیں آیا تھا۔ ہر طرف پتھریلی چٹانیں اور بے آب و گیا میدان مل رہے تھے۔ سورج کی گرمی دماغ کو پکھلا رہی تھی۔ پیاس کی شدت اب پریشان کرنے لگی تھی۔ گو کہ صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا لیکن پانی کی طلب زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ ہم رک بھی نہیں سکتے تھے کہ کہیں بیٹھ جاتے اور کوئی ایک جا کر پانی کی تلاش کرتا۔ ریاست خان کے لیے یہ علاقہ نیا نہیں تھا۔ وہ برابر آتا جاتا رہا تھا اس لیے وہ جدھر کہتا ہم اُدھر مڑ جاتے تھے۔
”اب اور کتنا چلنا پڑے گا؟“ عبداللہ کی کراہتی آواز ابھری۔

”مرکیوں رہے ہو۔ ان شاء اللہ ہم موت کو پیچھے دھکیلنا جانتے ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو ہم شادی کس کی کرائیں گے؟“ وسیم نے اس کی پیٹھ پر دھپ جما کر کہا۔

”اگر اب ہاتھ چلایا تو میں جواب میں کراٹے کا ہاتھ چلا دوں گا۔ مجھے کیا کمزور سمجھ رکھا ہے؟“ اس بار عبداللہ کی آواز زندگی سے بھرپور تھی میں سمجھ گیا کہ وہ ڈراما کر رہا تھا۔

”فضول کی بک بک سے انرجی برباد ہوتی ہے۔ انرجی بچاؤ، اپنے لیے قوم کے لیے۔“ سفیر نے اونچی آواز میں کہا۔ اور اپنے قدم مزید تیز کر دیئے۔

”واقعی یہ راستہ تو شیطان کی آنت بن گیا ہے۔ ختم ہو کر نہیں دیتا اور نہ کوئی بستی نظر آرہی ہے۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا تا کہ ریاست خان بھی سن لے۔ ہم نے اس پر اعتماد تو کر لیا تھا لیکن وہ قابل بھروسہ ہے بھی یا نہیں ابھی اس بارے میں میری حتمی رائے قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لہجے سے تو سچائی جھلک رہی تھی مگر وہ ڈرامے باز بھی تو ہو سکتا تھا۔ ہماری طاقت سے مرعوب ہو گیا اور اس نے ہمیں شکست دینے کے لیے بھٹکا دیا تو ہم بے موت مارے جائیں گے۔ کیونکہ ابھی تک اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ نزدیکی آبادی کتنی دور ہے۔ ہر بار یہی کہتا تھا کہ بس اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔ لیکن اب تک کوئی آبادی نظر نہیں آئی تھی۔ اور پیاس جان مارے دے رہی تھی۔

”اس علاقے کا یہی ایک خرابی ہے۔ بے آباد زمین زیادہ ہے۔ آبادی دور دور ہے۔“ ریاست خان نے

میری بات کا جواب دیا۔

”احقوں کی جنت میں رہنے والو۔ کبھی سوچ کر دیکھنا۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ تھوڑا سا غور کر لو تو وہ

سامنے ہریالی نظر آجائے گی۔ کھیت وہیں ہوتا ہے جہاں نزدیک میں آبادی ہوتی ہے۔ ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں۔“ دسیم کی چہکار سنائی دی تو میں نے بھی اس طرف دیکھا جدھر اس نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ واقعی پہاڑیوں سے پرے دور دور تک کھیت نظر آرہے تھے۔ ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اور کھیتوں سے کافی دور چھوٹے چھوٹے جھونپڑی نما گھر۔ میں خوش ہوا تھا اس لیے کہ اب سفر تمام ہونے والا تھا۔ سورج بھی تو اپنا سفر تمام کر چکا تھا۔ صبح سے ہم مسلسل چل رہے تھے۔ اب جا کر آبادی نظر آئی تھی۔ ہمارے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔

وہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ اس آبادی میں پہنچتے ہی ان لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ ہی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ وہ سب مہمان نواز بھی ہیں۔ انہوں نے یہ تک نہیں پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو۔ کون ہو..... اترا ہوا چہرہ دیکھا اور کھانے کا سامان لے آئے۔ بھوک کے عالم میں میٹھی روٹی اور شہد و مکھن نے بہت مزہ دیا۔ ہم سب نے سیر ہو کر کھایا اور دل بھر کر پانی پیا۔ ذرا ہوش آیا تو پوچھا۔ ”یہ کون سا علاقہ ہے۔ یہاں سے نزدیک کوئی شہر ہے؟“

”نگر ہے نا۔ بس کچھ دور ہے۔ ابھی آرام کریں۔ کل صبح آپ کے لیے نگر جانے کا انتظام ہو جائے گا۔“ جس گھر میں مہمانداری ہو رہی تھی اس کے مالک نے کہا۔

نگر پہنچنے کا مطلب تھا کہ ہم گلگت پہنچ گئے اور گلگت سے پنڈی کے لیے سواری کی کمی نہیں تھی۔ میزبان نے آرام کا پورا بندوبست کر دیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ریاست خان کوکئی بار مہمان ٹھہرا چکا ہے۔ بدلے میں ریاست خان اس کو کچھ رقم دے جاتا تھا۔

میزبان ہمیں آرام کرنے کا کہہ کر باہر چلا گیا تھا۔ جب دشمن کا کوئی واقف کار آرام کا کہے تو اسے شک سے دیکھنا ضروری تھا۔ میں بستر پر لیٹ تو گیا تھا لیکن ہوشیار تھا۔ ریاست خان والی پستول اب میرے پاس تھی۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوتی تو میں مقابلہ کر سکتا تھا۔ تھکن کا اثر سب پر تھا۔ خود میری آنکھیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ باقی سب کے سب سو چکے تھے۔ لیکن میں چاہ کر بھی سو نہیں پا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس اشارہ کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ رہ رہ کر میرا دل زور سے دھڑک اٹھتا تھا۔ اب یہاں آکھن کی بھی کمی نہیں تھی۔ اوپر یہ مسئلہ ہوتا ہے لیکن اب ہم جس علاقے میں تھے وہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے دل کی دھڑکن بے ترتیب کیوں ہو رہی تھیں یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ میزبان آگیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ”ایک بندے کی ہائی روف ہے۔ وہ اپنے ایک رشتے دار کو لے کر گلگت اسپتال جا رہا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس سے بات کروں۔ وہ آپ کو نگر پہنچا دے گا۔“

”اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”چار مع مریض۔“

”اور ہم سات لوگ ہیں اس ہائی روف میں اتنے لوگ کیسے آئیں گے؟“

”آدھے لوگ آسانی سے جاسکتے ہیں۔ مریض کے علاوہ اس کے تمام لوگ پائیدان پر کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ کے آدمی بیٹھ جائیں گے۔“

”آدھے لوگ جا کر کیا کریں گے؟“

”نگر سے کسی سواری کا انتظام کر لائیں گے۔“

بات اس کی معقول تھی۔ میں نے سفیر، عبداللہ اور وسیم سے کہا کہ وہ چلے جائیں۔ وہ لوگ اس ہائی روف میں چلے گئے۔ ابھی انہیں گئے ہوئے آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ میزبان پھر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ابھی ایک سوزو کی گلگت سے آئی ہے۔ وہ واپس جا رہی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس سے بات کر لیں۔ اسے واپس تو جانا ہی ہے۔“

”چلو، بات کر لیتا ہوں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ باہر آیا، میرے ساتھ ریاست خان بھی باہر آ گیا۔ ہم تینوں سامنے والے اس گھر کی طرف بڑھنے لگے جہاں ایک سوزو کی کھڑی تھی۔ بالکل نئی، چمچاتی ہوئی۔ ہم جیسے ہی اس گھر کے دروازے پر پہنچے، ایک شخص باہر نکل کر آیا۔ اس نے پہلے مقامی انداز میں جھک کر سلام کیا پھر مجھ سے بولا۔ ”اندر آ جائیں۔ مہمانوں کے لیے عارف شاہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔“ ہم اس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کو فرش نشست سے سجایا گیا تھا۔ کئی گاؤں تکے لگے ہوئے تھے۔ اندر دو آدمی بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کے بعد بولے۔ ”تشریف رکھیں۔“

ہم ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئے تب وہ بولا۔ ”آپ لوگ شاید اس علاقے میں پہلی بار آئے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں سے آرہے ہیں؟“ اس کا لہجہ بھی پختونوں جیسا تھا۔

”پنڈی سے آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرا نام امداد شاہ ہے۔ باہر جو سوزو کی کھڑی ہے، وہ میری ہے۔ میں عرصہ دو سال سے گلگت میں ہی رہ رہا ہوں۔“ اس نے اپنا مکمل تعارف کرایا۔ ”پہلے میں کراچی میں ٹیکسی چلاتا تھا پھر یہاں آ گیا اور اب گلگت میں رہ کر کرایہ پر سوزو کی چلاتا ہوں۔“

میں نے بھانپ لیا تھا کہ وہ کن اکھیوں سے ریاست خان کو دیکھ رہا ہے۔ گوکہ ابھی تک اس نے ریاست خان کو مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے پہچانتا ہے۔ یہ ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ عرصہ دو سال سے گلگت میں ڈرائیوری کر رہا ہے تو یقیناً کبھی نہ کبھی ریاست خان اس کی ویگن یا سوزو کی میں بیٹھا ہوگا۔

”اور ہاں، یہ بھی بتا دوں۔“ امداد شاہ نے ریاست خان پر ایک نظر ڈال کر کہا۔ ”میں اس علاقے کے چپے سے واقف ہوں۔ اگر آپ مجھ سے رابطے میں رہیں گے تو فائدے میں ہی رہیں گے۔“

”لیکن ہم تو یہاں سے گلگت جائیں گے اور گلگت پہنچتے ہی پنڈی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔“

”آپ کو ہم جانے دیں گے تب ہی تو آپ جائیں گے۔ گلگت میں ہم ایک دو روز تو مہمان رکھیں گے

ہی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کے انداز پر میں چونک پڑا تھا لیکن فوراً ہی اس نے تشریح کر دی تھی ورنہ میں اس کی بات کا کچھ اور مطلب لیتا۔ ”پنڈی، لاہور یا کراچی سے جب کوئی آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کوئی میرے گھر سے آیا ہے میں اسے ایک دو دن مہمان ضرور ٹھہراتا ہوں۔“

”آپ کب تک واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”جس کام سے آیا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اب واپسی کا سوچ رہا ہوں۔“
 ”کتنی دیر میں چلیں گے؟“

”بس یہ سمجھ لیں کہ آپ آئے کہ ہم نکلے۔“ اس کا انداز گفتگو پختون تھا لیکن وہ الفاظ کا ذخیرہ رکھتا تھا۔
 خوب لچھے دار باتیں کرتا تھا۔ شاید یہ کراچی میں وقت گزارنے کا نتیجہ تھا۔
 ”ٹھیک ہے میں اپنا بیگ لے آؤں پھر نکل لیتے ہیں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ
 میزبان بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلے۔ پھر وہاں سے سیدھا اس کے گھر پہنچے۔ جیدے
 وغیرہ کو ساتھ لیا اور واپس اسی گھر میں آ گیا۔ امدادشاہ جیسے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی گھر سے باہر نکل
 آیا۔ اس نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی اور ہم نئے سفر پر نکل پڑے۔ وہی پتھر یلے راستے۔ سانپ کی طرح
 بل کھاتی سڑک۔ میرے ساتھ ریاست خان بیٹھا تھا۔ پیچھے والی سیٹ پر جیدے، اللہ ڈینوار چرسی جیسی شکل والا
 صغیر تھا۔ اس کے پیچھے خالی جگہ پر امدادشاہ کا بندہ اکڑو بیٹھا تھا جیسے وہ اس قسم کے سفر کا عادی ہو۔ وہ بھی بالکل
 خاموش تھا۔ جیدے ریاست وغیرہ تو ایسے ہی مجھ سے مرعوب تھے۔

اب مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ ایک ساتھ عبداللہ، وسیم اور سفیر کو بھیجنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ لوگ ساتھ
 رہتے تو سفر مزید خوشگوار ہو جاتا۔ راستے بھر وہ سب پھل پھڑیاں چھوڑتے، ایک دوسرے سے الجھتے رہتے جس کا
 ایک اپنا مزہ ہے۔ میں وینڈ اسکرین سے باہر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کافی دیر بعد گاڑیاں گزر رہی تھیں۔
 ایسا لگتا تھا کہ ادھر کم ہی گاڑیاں آتی ہیں۔ میں نے امدادشاہ سے پوچھا۔ ”نگر اب کتنی دور ہے؟“
 ”بس تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اس گاؤں سے نگر کا اتنا تو فاصلہ نہیں ہوگا۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔ اتنی دیر میں تو
 ہم گلگت پہنچ جاتے۔“

”ہم گلگت ہی تو جا رہے ہیں۔“ امدادشاہ نے جواب دیا۔

”لیکن مجھے تو نگر جانا ہے۔“

”نگر جا کر کیا کریں گے؟“ امدادشاہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”میرے کچھ ساتھی وہاں سواری کا انتظام کرنے گئے ہیں۔“

”اچھا اچھا۔ تب تو ہمیں نگر کی طرف مڑ جانا چاہیے تھا اور ہم کافی آگے آ گئے ہیں۔ آپ فلزنہ کریں۔ میں
 اگلے موڑ سے اس طرف مڑ جاؤں گا۔“ پھر اس نے ریاست خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ریاست خان مجھے جانتے
 ہو؟“

”نہیں۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔

”اب جان لو گے۔“ پھر امدادشاہ نے سرگھا کر پیچھے دیکھا اور اپنے ساتھی سے بولا۔ ”صاحب جی کا کچھ

خیال ہی کر لو۔“

”میں ابھی دیتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے تھرموس اٹھالیا۔ ”تم گاڑی روک لو بھی تو میں ادھر آؤں گا۔“

امداد شاہ نے گاڑی روک دی۔ وہ تھرموس لے کر پیچھے سے اتر ا اور میری طرف والی کھڑکی پر آیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ کوئی مشروب دینا چاہ رہا ہے۔ میں نے اپنی سائیڈ والی کھڑکی سے سر باہر نکالا ہی تھا کہ اس مردود نے اس گلاس میں بھرا مشروب میرے چہرے پر پھینکا۔ پتا نہیں اس میں کیا چیز تھی کہ میرے چہرے پر جلن ہونے لگی۔ آنکھوں میں تیز مرجیں سی لگیں۔ تبھی ریاست خان کی آواز سنائی دی۔ ”اوئے یہ کیا کیا؟“

”ابھی تجھے بھی اس کا مزہ چکھنا ہے۔ امداد شاہ کی آواز سنائی دی۔ یہی وہ آخری آواز تھی جو میں نے سنی کیونکہ میں ہوش سے بیگانا ہوتا چلا گیا تھا۔

پتا نہیں میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ اس لیے کہ جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اندھیرے کمرے کے فرش پر پایا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کچھ بھی سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ پہلا خیال جو میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ میں کہیں اندھا تو نہیں ہو گیا ہوں۔ مگر نہیں، ہلکا ہلکا سا منظر نظر آیا۔ شاید رات ہو چکی تھی اور کمرے میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تب احساس ہوا کہ میں بندھا ہوا ہوں۔ مضبوط رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ میں نے گردن گھمانی چاہی تو برابر میں کوئی اور بھی تھا۔ اب میں نے بغور دیکھا تو سمجھ آئی کہ وہ ریاست خان ہے جو اب تک ہوش سے بے گنا ہے۔ میں نے کسمسا کر رسی کی مضبوطی کا اندازہ کرنا چاہا تو پتا چلا کہ پلاسٹک کی ڈوری سے باندھا گیا ہے۔ ہاتھ کو دھیرے دھیرے منہ تک لانے کی کوشش شروع کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ دانتوں کی مدد سے رسی کھول لوں گا۔ لیکن یہ کوشش رائگاں گئی۔ ابھی ہاتھ سینے تک ہی پہنچا تھا کہ دروازہ کھلا اور باہر کی روشنی اندر آئی۔ باہر لائٹ جل رہی تھی۔ ساتھ ہی چٹ کی آواز ابھری اور کمراروشنی سے جگمگا اٹھا۔ سامنے امداد شاہ کھڑا تھا اس کے ساتھ دو اور بندے تھے۔ ان میں سے ایک خاصا مضبوط بندہ تھا۔ جسم کسرتی۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی۔ وہ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا تھا کہ امداد شاہ کی آواز سنائی دی۔ ”اچھا تو تم جاگ گئے؟ اب جو پوچھا جائے تو تے کی طرح فر فر شروع کر دینا۔“ اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک نظر ان سب پر دوبارہ ڈالی۔ سب کے چہرے درشت تھے۔ وہ سب ہی چہروں سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے، میں نے جواب میں نیا سوال کر دیا۔ ”آپ پہلے یہ بتائیں کہ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟“

”اس بات کی سزا کہ تم ریاست خان کے ساتھ پائے گئے ہو۔ اور ریاست خان کا جرم بہت بڑا ہے۔“

”وہ مجرم ہے تو ہمیں کیوں سزا دے رہے ہو۔“

”اس لیے کہ اسے جو کام سونپا گیا تھا اس نے وہ پورا نہیں کیا۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔ جو وعدہ کرتا اسے پورا ضرور کرتا۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ اس نے غداری کی اور ایسا اس لیے ہوا کہ تم نے اسے بہکایا۔ ہمیں صغیر نے پوری کہانی سنادی ہے۔ اس لیے ہمارا فیصلہ ہے کہ اس کی سزا دی جائے۔“

”کسی نے کہا اور تم نے یقین کر لیا۔ صغیر تو خود چر سی ہے۔ اس نے چرس کی طلب میں جھوٹ بک دیا اور تم نے یقین کر لیا۔ میں تو اس علاقے میں بالکل نیا ہوں۔ میں تو سیر کے لیے آیا تھا۔ راستہ بھٹک گیا تھا کہ ریاست نے مدد کا وعدہ کر لیا۔“ اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔

”جھوٹ بولتا ہے۔“ کہہ کر اس نے ایک زنانے دارتھپڑ میری گال پر جڑ دیا۔ تھپڑ اتنا سخت تھا کہ منہ کے اندر دانت تک ہل گئے۔ میں پہلے سے تیار نہیں تھا۔ اس نے یکا یک حملہ کیا تھا اسی لیے چوٹ زبردست لگی تھی۔ شاید زبان دانتوں تلے آگئی تھی۔ منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ شاید خون رسنے لگا تھا۔ میں نے کڑواہٹ کم کرنے کے لیے فرش پر تھوکا۔ لالی صاف نظر آئی تھی۔

”صاف صاف بتادے ورنہ یہ چڑی ایسی ہو جائے گی کہ اس پر پیوند بھی نہیں لگے گی۔“ اس نے جملہ ختم کر کے نہایت پھرتی سے جوتے کی نوک سے میرے سینے پر ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر اتنی شدید تھی کہ میں الٹ گیا۔ بستر سے نیچے جا گرا تھا۔ امداد شاہ نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اسے سیدھا کر ورنہ میں اس کے سینے پر کھڑے ہو کر ڈانس شروع کر دوں گا۔ بڑا سوراہن کر آیا ہے نا۔ ابھی ایک ایک ریشہ الگ کرتا ہوں۔“

امداد شاہ کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ اچھے اچھوں کو پسینا آ جائے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہ بندہ ہے جو مجھے گاؤں میں ملا تھا۔ اس وقت وہ درندے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

”میں نے سچ بولا ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اوئے اے اٹھا۔“ امداد شاہ نے اپنے باڈی بلڈر ساتھی سے کہا۔

وہ آگے بڑھا اور اس نے مجھے کپڑوں سے پکڑ کر کھینچا اور اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے پاؤں پر زور ڈالا تاکہ آسانی سے اٹھ جاؤں۔ اس نے کھینچ کر مجھے بٹھا دیا۔

”سیدھے سیدھے بول ٹوکس ایجنسی کا بندہ ہے ورنہ مار مار کر کھال میں بھس بھر دوں گا۔“ وہ اپنے زعم میں بوسلے چارہا تھا۔

”دیکھ بھائی سیدھے سیدھے سب کچھ بول دے۔ استاد کا دماغ پھر گیانا تو سمجھ لے تو ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائے گا۔“ باڈی بلڈر نے مشورہ دیا۔

”میں اب تک سمجھ ہی نہیں پایا ہوں کہ یہ پوچھنا کیا چاہتے ہیں تو میں کیا بتاؤں؟“

امداد شاہ نے اسے ڈانٹا۔ ”اپنے کام سے کام رکھ۔ ایسا کر ریاست خان نے ابھی تک سبق نہیں لیا۔ اسے اٹھا۔ وہ ایسے آنکھیں بند کیے پڑا ہے جیسے میں اندھا ہوں۔ دیکھ نہیں رہا کہ وہ اٹھ چکا ہے۔“

باڈی بلڈر نے ریاست خان کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر غرایا۔ ”سیدھی طرح سے بیٹھ جا۔ اب تیرا نمبر ہے۔“

”مجھے جو کام دیا گیا تھا وہ میں نے پورا کر دیا ہے۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔

”بکواس بند کر۔ رات صاحب جی کا پیغام آیا ہے کہ جس بندے کو بھیجا گیا تھا اسے ایجنسی والوں نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے نکل پایا ہے۔ ایجنسی والوں کو کیسے خبر ہوئی یہ تو بتائے گا۔“

”یہ غلط خبر ہے۔ کوئی بندہ آیا ہی نہیں۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔ میں اس کی ہمت کی داد دے رہا تھا۔ وہ حوصلے سے کام لے رہا تھا۔ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو اسے بزدل یا ٹوٹ جانے کا ثابت کرتا۔

”اگر تو سچا ہے تو پھر صغیر کی بات کو کس خانے میں فٹ کروں۔“ امداد شاہ نے کہا۔
”صغیر جھوٹ بول رہا ہے۔“

”جھوٹ تو بول رہا ہے اور یہ شخص جو تیرے ساتھ ہے یہی ایجنسی کا بندہ ہے۔ اس کی تو میں بوٹی بوٹی الگ کروں گا اور ہر بوٹی ایک ایک بات بتائے گی۔ اگر مجھے نہیں جانتا تو جان لے گا۔ میں ایجنسی والوں کا سب سے بڑا دشمن ہوں۔“

”میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ کوئی آیا ہی نہیں تھا۔ ایک بار صاحب جی سے میری بات کراؤ۔ میں خود ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”صاحب جی اب تجھ سے بات نہیں کریں گے۔“

”تو ٹھیک ہے میری بات مرشد جی سے کراؤ۔“ ریاست خان نے جھنجلا کر کہا۔

”وہ بھی تم سے بات نہیں کرنا چاہتے۔“

”انہیں خبر تو دو کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی میں تمہاری وہ خبر لوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔“ امداد شاہ نے ہنس کر کہا۔

”تمہیں آج تک میں نے حضرت جی کے پاس دیکھا نہیں اور تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم ان کے خاص

مرید ہو۔ لاؤ فون مجھے دو میں خود ان سے بات کر لیتا ہوں۔“

”فون بھی دوں گا۔ رہا سوال تم نے مجھے ان کے پاس دیکھا نہیں تو میں کوئی عام بندہ نہیں ہوں۔ مرشد

جیسے کئی بندے میرے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ مرشد جیسے لوگوں سے ہم کام لیتے ہیں۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ ایک معمولی بندہ مرشد جیسے شخص کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ جو خود میں ایک دنیا تھا۔

سیاست کا بازی گر۔ قوت کا خزانہ۔ شیطانیت میں سب سے آگے..... تو کیا مرشد خانقاہ کی تباہی کے بعد بالکل

صفر بن گیا ہے۔ یا پھر یہ گیم کھیل رہا ہے۔ بات ابھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایسا لگتا

ہے کہ یہ خود ایجنٹ ہے اور مرشد کو فنڈ دے کر کام لے رہا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو اس کے معنی یہ ہے کہ دشمن نے

اندر تک اپنا جال پھیلا رکھا ہے اور اس جال کو توڑنا بہت ضروری ہے۔ کام بہت بڑھ گیا ہے۔

”استاد پہلے اس کو ٹولیں..... یہ مجھے زیادہ اہم لگتا ہے۔“ باڈی بلڈر نے امداد شاہ کو مشورہ دیا تو وہ پھر

میری جانب متوجہ ہو گیا۔ مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”مجھے اندازہ ہے تو بہت اہم بندہ ہے۔ اب جلدی سے شروع

ہو جا۔“

”میں کیا بتاؤں..... جو سچ ہے وہ بتا دیا۔“ میں نے جواب دیا تھا کہ اس نے میری ناک پر بیچ مارا۔ گو کہ

بیچ ہلکا تھا پھر بھی تکلیف کا شدید احساس میرے اندر درد کی لہر سا اٹھا گیا۔ ابھی میں اس درد کو سہہ بھی نہ پایا تھا کہ

اس کی مکروہ آواز ساعت سے ٹکرائی۔ ”ریاست کو لے جا کر الٹا لٹکا دے ایک دو گھنٹے میں اس کا مزاج خود صحیح ہو

جائے گا۔“

باڈی بلڈر نے اسے کسی بیچ کی طرح گود میں اٹھا لیا پھر وہ باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد امداد

شاہ نے کہا۔ ”ہاں بھئی سورا، اب تم بھی شروع ہو جاؤ۔“

”میں اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں اور کیا بتاؤں۔“

”سمجھ گیا۔ ایسے بتاتے ہوئے تمہیں شرم آرہی ہے۔ ابھی علاج کرتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارے سے بلایا۔ ”اسے جہنم کا دروازہ دکھانا پڑے گا..... شابش شروع ہو جاؤ۔“

ان دونوں نے مجھے بستر سے اتارا پھر دیوار تک لے گئے اور اس سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ میرے دونوں ہاتھ اسی طرح جکڑے رہے۔ ان میں سے ایک نے میرے ہاتھوں کی بندش کو ڈھیلا کیا۔ میرے لیے یہ ایک نادر موقع تھا، میں نے بندھے ہوئے پیر کی پروا کیے بغیر ہاتھ چلا دیا۔ مجھے امداد شاہ سے اس پھرتی کی امید نہ تھی۔۔۔ اس نے ہوا میں اچھل کر میرے چہرے پر بوٹ کا بھرپور وار کیا۔ یقیناً میری ناک کا بھرتا بن گیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے اسی تیزی سے میری دونوں کلائیوں میں بندھی رسی کو پکڑا اور کھینچ کر چھت سے لٹکتی رسی سے باندھ دیا جیسے یہ ان کا معمول ہو۔

”ابے رسی کو کھینچ۔“ امداد شاہ نے جھڑکا۔

ان دونوں نے چھت کی رسی کو کھینچنا شروع کر دیا۔ اب میرے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے تھے۔

”ابھی اور اوپر کھینچنا ہے۔ اس کا قد بھی تو دیکھ۔“ امداد شاہ چیخا۔

ان دونوں نے رسی کو مزید اوپر کھینچا۔ اب میرے ہاتھ اتنے بلند ہو چکے تھے کہ بغلوں میں کھنچاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں پوری طرح رسی کے سہارے کھنچا ہوا تھا۔

”پہلے داہنے پیر کو احتیاط سے۔“ امداد شاہ نے ہدایت دی۔ ”یہ پیر چلانے میں ایکسپرٹ لگتا ہے۔“

ایک بندے نے رسی کا پھندا اچھینک کر میرے داہنے پیر کو باندھا پھر پہلے سے بندھی رسی کو کھول دیا۔ اب میرے دونوں پاؤں الگ الگ ہو گئے تھے۔ اس بندے نے داہنے پیر سے بندھی رسی کو لے جا کر بیڈ کے پائے سے باندھ دی۔ اتنے میں دوسرا بندہ جو باہر نکل گیا تھا وہ ایک کنستر کے ساتھ واپس آیا۔ اس کنستر میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ اس نے کنستر کو میرے بائیں جانب رکھ دیا پھر بائیں پیر کی رسی کو اس کنستر سے باندھ دیا۔ اور اسے کھینچ کر فاصلے پر رکھ دیا۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا کہ جس کی اذیت کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ میرے دونوں پیر دوست میں کھینچ گئے تھے۔ ٹانگیں ایسی چری ہوئی تھیں کہ پورا وزن کلائیوں پر پڑ رہا تھا۔ پیر پر وزن ہی نہیں تھا۔ میری حالت دیکھ کر امداد شاہ نے کہا۔ ”ابھی نونج رہے ہیں۔ ہم باہر بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ جب تمہارا دل کرے کہ سچ بتانا ہے تو مجھے آواز دے لینا۔“ وہ گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی باہر نکل گئے تھے۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس دور افتادہ علاقے کا یہ شخص ایذا رسانی کا طریقہ تو خوب جانتا ہے۔ ایسا شخص معمولی نہیں ہو سکتا۔ میرے دونوں پیر سخت تکلیف میں آئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ درمیان سے پیر الگ ہو جائیں گے۔ میں نے تکلیف پر قابو پانے کے لیے پیروں کو قریب کرنا چاہا۔ اس کے لیے جھکنا دینا ضروری تھا مگر پہلی ہی کوشش میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور میرا سارا وزن کلائی پر آ گیا۔ رسی کی جکڑ کلائی پر مزید سخت ہو گئی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے رسی گوشت میں اترنے لگی ہو۔ تکلیف کی شدت سے میں دوبارہ پہلی پوزیشن میں آنا چاہا لیکن اب یہ ناممکن ہو چکا تھا۔ میں عجیب انداز میں جھول گیا تھا۔ اس تکلیف سے گزرتے ہوئے بھی میں سوچے جا رہا تھا کہ

امدادشاہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ ٹرینڈ بندہ بگ رہا ہے۔ کاش میں اپنے ساتھیوں کو ایک ساتھ نہ بھیجتا تو وہ لوگ اپنی کوشش کر لیتے۔ اذیت سے بچنے کے لیے میں مسلسل ادھر ادھر کی سوچ رہا تھا لیکن تکلیف کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس تکلیف سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے آخری کوشش کی ٹھان لی اور پھر میں نے اسے آواز دی۔ ”امدادشاہ!“

آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ سب ایک ساتھ اندر آئے۔
”کیا بات ہے۔ عقل ٹھکانے آگئی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔



”میں سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے مجھے کھولو۔“

”یہ ہوئی نابات۔“ امدادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”احتم خود کو عقلمند سمجھ کر اکڑ دکھاتا ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔ تم نے عقل مند ہونے کا ثبوت دیا ہے ورنہ مار کھاتے رہتے اذیت سہتے رہتے اور پھر ایک وقت وہ آجاتا کہ تم بولنے پر مجبور ہو جاتے لیکن تب تک تم ٹوٹ پھوٹ کا بری طرح شکار ہو چکے ہوتے۔“ پھر وہ اپنے ایک ساتھی طرف مڑ کر بولا۔ ”اسے ہولی کر اس سے اتارو۔“

میری حالت کو ہولی کر اس یعنی صلیب سے تشبیہ دینے والا کوئی عام بندہ نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے سو فیصد یقین ہو چکا تھا کہ یہ بندہ وہ نہیں ہے جو نظر آرہا ہے۔ خاص الخاص بندہ ہے۔ ٹیکسی چلانے والا بندہ ہولی کر اس نہیں بول سکتا۔ یہ تشبیہ ایسا ہی بندہ دے سکتا ہے جو پڑھے لکھے لوگوں یا غیر ملکیوں کے ساتھ تعلقات رکھتا ہو۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس نرالے تشدد نے مجھے اذیت میں مبتلا کر دیا تھا لیکن ابھی مجھ میں اتنی جان ضرور تھی کہ میں اکیلے ان سب کا مقابلہ کر سکتا۔ اس نے جو کچھ میرے ساتھ روا رکھا تھا اس کا حساب کرنا بھی ضروری تھا۔

میں سوچ کے سمندر میں غلطاں تھا کہ امدادشاہ کی آواز نے خیالات کو چور چور کر دیا۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ ”اے اتنی دیر جلدی کر۔ اسے کھول ورنہ یہ لولا لنگڑا ہو جائے گا۔“

اس کے ساتھی نے پہلے میرے دونوں پیروں کی رسی ڈھیلی کی پھر ہاتھوں کو آزاد کیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں بہت ہلکا ہو گیا ہوں لیکن اب تک ہاتھ پیروں پر رسی کی چھن محسوس ہو رہی تھی۔ پیروں اور ہاتھوں میں اکڑن بھی باقی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں دماغی طور پر ابھی تک بندھن سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ جلد پر رسی کا لمس باقی تھا۔ رگوں میں پوری طرح لہو کی روانی جاری ہو نہیں پائی تھی۔ میں نے اس لیے ہاتھ پیروں کو جھٹک کر خون کی روانی درست کی اور پھر کہا۔ ”ہاں اب پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”تم کون ہو۔ کس ایجنسی سے تعلق ہے؟“ امدادشاہ نے پوچھا۔

”یقین کرو کہ میرا تعلق کسی ایجنسی سے نہیں ہے لیکن اتنا سمجھ چکا ہوں کہ تمہارا تعلق ضرور غیر ملکی ایجنسی سے ہے۔“ یہ کہتے ہی میں نے اس کے ساتھی کو گریبان سے پکڑا اور اس پر اچھال دیا۔ یہ وار یکا یک ہوا تھا۔ شاید اسے بھی امید نہ ہو کہ میں جو اس کی مار کھا کھا کر ادھ مرا ہوا چکا تھا اتنی جلدی پہل کر دوں گا۔ جنگ کی ابتدا ہو چکی ہے یہ سمجھنے سے پہلے ہی وہ الٹ کر گرا تھا کہ میں نے تیسرے ساتھی کو گردن سے پکڑا اور اسے بھی امدادشاہ پر اچھال دیا۔ تینوں ابھی اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں نے ان پر چھلانگ لگا دی اور بوٹ سمیت امدادشاہ

کے سینے پر کودا۔ وہ دوبارہ سے چپت ہو گیا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ مشینی انداز میں ان دونوں ساتھیوں پر ٹھوکر مارنے لگا۔ جس طرح سے اسٹن آگے پیچھے ہوتا ہے اسی طرح سے میری لات آگے پیچھے ہو رہی تھی۔ ہر چوٹ پر ان کی کراہ گونجتی۔ درمیان درمیان میں، میں امداد شاہ کو بھی ایک دو ٹھوکر لگا دیتا تھا۔ اس وقت اگر کوئی مجھے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ صحیح بھی تھا۔ اس لیے کہ میں لاکھ برا سہی لیکن جب وطن کی حرمت پر بات آتی ہے تو میں پاگل ہی تو ہوا اٹھتا ہوں۔ اگر میری ٹھوکروں سے وہ مر بھی جاتے تو مجھے افسوس نہ ہوتا اس لیے کہ غیر ملکی ایجنٹ سے زیادہ قابل نفرت مقامی ایجنٹ ہوتے ہیں۔ ان کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے، اس لیے کہ وہ نمک حرام کھلاتے ہیں۔ غدار کہلاتے ہیں اور غداروں کو زندہ رکھنا وطن دشمنی ہے۔ کیونکہ وطن کا سودا کرنے والے سے زیادہ برا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

اسی بات نے میرے اندر بجلی سی بھردی تھی اور میں مشینی انداز میں لات اور گھونسنے کا استعمال کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں امداد شاہ کے تینوں ساتھی انشا غفیل ہو گئے۔ ان کے ناک منہ سے خون جاری ہو چکا تھا۔ ان میں کون زندہ ہے کون مر گیا یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ لیکن ایک بندہ تھا جو اتنی مار کھانے کے بعد بھی بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ وہ تھا امداد شاہ۔ گو کہ وہ بھی زخمی تھا۔ اس کے منہ کا بھرتا بن چکا تھا لیکن اس میں بڑی جان تھی۔ اس نے کئی بار مدافعت کی تھی۔ کئی بار میری لات کو پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو شاید اس وقت میں بھی انہی کی طرح پڑا ہوا ہوتا۔ میں نے اب پوری توجہ اس کی جانب مبذول کی۔

وہ دو آدمیوں کے نیچے تھا۔ یہ سب کچھ بس دس بارہ منٹ میں ہوا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ جس کے ہاتھ پیر اتنی دیر تک جکڑے رہے ہوں وہ اس طرح حملہ کرے گا۔ اس نے اب تک صرف عام لوگوں کو دیکھا اور ان کا سامنا کیا ہوگا جو مرنا مارنا جانتے ہوں گے لیکن میری طرح اذیت سہہ کرکندن بن جانے والے سے وہ پہلی بار مل رہا ہوگا۔ اکرم چشتی سے زیادہ اذیت دینے والا کون ہوگا۔ جب اس کی اذیت میرا کچھ بگاڑ نہ سکی تھی تو یہ کس زمرے میں آتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ بڑی آسانی سے باہر آ گیا لیکن اگلے ہی پل مجھے احساس ہو گیا کہ میں نے اس کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس نے خود کو پھرتی سے سنبھالا تھا اور بام مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل گیا تھا۔ وہ فرش پر پھسلتا ہوا دیوار تک چلا گیا تھا اور نہایت تیزی سے کھڑا ہوا تھا۔ اس کی چستی و چالاکی نے مجھے متاثر کیا تھا مگر یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہی ہوا میں اچھال بھری تھی۔ تیر کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف آیا تھا مگر میں ہوشیار تھا۔ لمحے بھر میں فیصلہ کر لیا اور جیسے ہی اس نے آدھا فاصلہ طے کیا، میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ اڑتا ہوا دوسری جانب کی دیوار سے ٹکرایا اور وہیں پردھپ سے گرا۔ ابھی میں اس کی طرف بڑھتا کہ اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا تھا اگر میں نے خود کو درمیان میں روک نہ لیا ہوتا تو اس کے شکنجے میں آ جاتا۔ مجھے رکتا دیکھ وہ بھی رک گیا تھا۔ اس مظاہرے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس نے اپنے جسم پر بہت محنت کی ہے۔ وہ اپنے جسم پر پوری طرح قابو کر سکتا تھا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ جمناسٹک میں بھی دخل رکھتا ہے تبھی تو وہ اتنی آسانی سے جسم کو موڑ لیتا ہے۔ یقیناً وہ جوڑو کراٹے بھی جانتا ہوگا لیکن ابھی تک اس نے ایسا کوئی وار نہیں کیا تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ کراٹے کا ماہر ہے۔ وہ فلائنگ کلک پر کلک چلا تو رہا تھا لیکن عام سے انداز میں۔ اس

کے لڑنے کی تکتک کو میں باریکی سے جانچ رہا تھا اسی لیے جیسے ہی اس نے فلائنگ کلک چلائی میں نے سر کو ستر کے زاویے سے موڑا اور کچھ آگے سرک کر گھونسا چلا دیا، میرا نشانہ ایسی جگہ تھا کہ وہ پہلے ہی وار پر چوڑیاں بھول گیا۔ دونوں ہاتھوں کو رانوں کے درمیان، چوٹ کی جگہ پر رکھ کر دوہرا ہو گیا تھا۔ تکلیف اس کے چہرے سے ہوید اٹھی۔ اس نے مجھے جس طرح ایذا پہنچائی تھی اس کے مقابلے میں ابھی میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا، صرف پہلا ہاتھ دکھایا تھا۔

عام طور سے یہ وار میں کسی دشمن پر نہیں کرتا کیونکہ اس کی اذیت کئی دن تک بے چین رکھتی ہے لیکن اس نے جس طرح مجھے ستایا تھا وہ اسی کا حقدار تھا۔ پھر اس میں ایک اور خرابی یہ تھی کہ وہ میرے ملک کے خلاف کام کر رہا تھا اور ایسے لوگ میری نظر میں زیادہ سزا کے مستحق ہیں اسی لیے میں متروک قرار دیئے گئے ہتھکنڈے بھی آزمی رہا تھا۔

وہ چوٹ پر ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا کہ میں نے اس کے سر پر ایک اور ہاتھ مارا۔ یہ کھڑی ہتھیلی کا وار تھا۔ اس سے دماغ تک ہل گیا ہوگا۔ عام طور پر میں یہ وار کرتا نہیں ہوں کیونکہ دماغی چوٹ فال کا سبب بن جاتی ہے لیکن میں کیا کرتا۔ وہ مجسم میرے سامنے تھا لیکن پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی جگہ مجھے پاگل کتا نظر آ رہا تھا۔ کتے کا کام ہے حفاظت کرنا لیکن جب وہ پاگل ہو جاتا ہے تو وہ مالک کو ہی کاٹنے دوڑتا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی کتا بن گیا تھا۔ ملک کی حفاظت کرنے کی جگہ وہ دشمنان وطن کی اعانت کر رہا تھا۔ اس لیے اسے معاف کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے مسلسل ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ پیروں میں بھاری بوٹ تھے۔ اس بوٹ کی مار بھی زبردست تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم پر زخموں کا گلشن کھل اٹھا۔ ہر زخم سے خون رس رہا تھا۔ زمین پر بھی جا بجا خون کے دھبے نظر آنے لگے تھے۔ وہ بے جان مجسمے کی طرح ادھر سے ادھر لڑھک رہا تھا۔ جیسے اس میں مدفیت کی ذرا بھی قوت نہ ہو۔ کہیں مروتو نہیں گیا۔ یہ خیال ذہن میں آیا ہی تھا کہ میں نے خود کو روک لیا اور جھک کر سانس کی آمد و شد کی جانچ کی۔ سانس چل رہی تھی۔ لیکن ہوش اس سے روٹھ چکا تھا۔ ایک گدھے کی طرح پٹا تھا۔ اس حالت میں وہ کیسے ہوش میں رہتا؟

اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس کے باقی ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ وہ سب بھی بے ہوشی کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ میں نے اس رتی کو کھولا جس سے مجھے باندھا گیا تھا۔ پھر اسی رتی سے میں نے ان سب کے ہاتھ اور پیر باندھے لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ ہاتھ پیچھے کی طرف ہوں اور بندھن زیادہ سخت نہ ہو۔ وہ اسے آسانی سے کھول بھی نہ سکیں اور انہیں زیادہ تکلیف بھی نہ ہو۔ یہ میری عادت بن چکی ہے کہ جب کوئی مقابلے پر آئے تو اسے چھوڑ نہیں اور جب کوئی لاچار پڑا ہو تو اسے چھیڑ نہیں۔ اس کو تکلیف بھی نہ دو۔

اس کام سے فرصت پا کر میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ پہلے برابر والے کمرے میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ کمرہ کسی عاشق کے دل کی طرح خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس خالی کمرے کا دروازہ بند کر کے دوسرے کمرے کے دروازے کو ہاتھ سے دباؤ ڈال کر کھولا۔ اس کمرے کے منظر کو دیکھتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اس لیے کہ اس کمرے میں ایک لائین سے صغیر، جیدے اور اللہ ڈینو بندھے پڑے تھے۔ وہ سب فرش پر اس طرح لڑھکے ہوئے تھے۔ جیسے چاولوں کی بوریاں پڑی ہوں۔ ان کے ہاتھ پیر باندھے

کر گول گٹھڑی کی شکل دی گئی تھی۔ منہ میں کپڑے ٹھنسنے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں بندھن سے آزاد کرایا اور پھر آنکھوں کی پٹی کھولی۔ صغیر آزاد ہوتے ہی باضابطہ رونے لگا۔ اسے خاموش کرنے میں جتنا وقت لگا وہ الگ ہے مگر اسے چپ کرا ہی دیا پھر پوچھا کہ ریاست خان کو کہاں رکھا گیا ہے، کچھ اندازہ ہے؟

”ریاست خان کو بہت مارا۔ اس کی چیخیں سن سن کر میں دہلتا رہا تھا کہ اسی طرح مجھے بھی پیٹا جائے گا۔“ صغیر نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

”فکر نہ کرو اب اس کی پٹائی کا باب کھلنے والا ہے۔ پہلے تو میں اپنی پٹائی کا روزنامہ کھولوں گا پھر ریاست خان کا۔ ایک ایک تمانچے کا اسے حساب دینا ہوگا۔ تم سب کے جسم پر جتنی چوٹ ہے اسے پانچ سے ضرب دے کر انہیں ماروں گا۔“ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔

”ہاں صاحب جی۔ اسے اتنا مارنا کہ وہ پھر کسی پر ظلم نہ کر سکے۔ بہت ظالم ہے وہ۔“

”بالکل ایسا ہی ہوگا۔ اب تم لوگ تیار ہو جاؤ، میں نے ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔ پہلے میں ریاست خان کو ڈھونڈ لوں پھر ان سے حساب لیتا ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر اس کمرے کے برابر والے کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی خالی تھا۔ اس کے برابر والا کمرہ بھی خالی تھا۔ تبھی میری نظر کھلے ہوئے دروازے سے باہر گئی اور میں ادھر بڑھتا چلا گیا۔

دروازے سے نکلنے ہی میں نے خود کو آنگن میں پایا۔ خوب بڑا سا آنگن تھا۔ اس آنگن میں ایک چھدر اسٹا پیڑ تھا۔ اس پیڑ کی ایک ڈال سے ریاست خان کو الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ وہاں ایسا کوئی ہتھیار یا اوزار نہیں تھا جس سے رتی کاٹ سکتا اس لیے پیڑ پر چڑھنا پڑا۔ رتی کھول کر میں نے ریاست خان کو نیچے اتارا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اسے اٹھا کر میں اندر لے آیا۔ اس کی حالت خود بتا رہی تھی کہ اس پر بے تحاشہ تشدد کیا گیا ہے۔ میں اسے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اندر لے کر آیا۔

ایک بے ہوش شخص کو گود میں اٹھا کر لانا آسان نہیں ہے پھر بھی میں اسے اٹھالایا تھا۔ اس کو لٹانے کے بعد میں نے صغیر سے کہا۔ ”اس کے زخموں پر مرہم لگاؤ؟“

”مرہم کہاں سے لاؤں؟“ وہ بے چارگی سے بولا۔

میں نے اس کمرے سے نکلنے ہوئے اپنا بیگ اٹھالیا تھا۔ اس بیگ سے فرسٹ ایڈ کٹ نکالی اور مرہم کی ٹیوب اس کی طرف بڑھادی۔ اس نے ٹیوب سے مرہم نکالی اور اس کے زخموں پر لگانے لگا۔ میں نے اپنے بیگ کی دوبارہ تلاشی لی کہ کچھ غائب تو نہیں ہے لیکن سب کچھ جوں کا توں موجود تھا۔ اس کی تلاشی تو لی گئی تھی جس کا اندازہ مجھے ہو چکا تھا کیونکہ شیونگ کا سامان میں بیگ کے بیک سائیڈ پاکٹ میں رکھتا ہوں جو اس وقت اپر سائیڈ پاکٹ میں نظر آ رہا تھا یعنی کسی نے نکالا تھا اور تمام چیزوں کو اسی طرح دوبارہ سے رکھ دیا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا تھا کہ واکا کی ٹاکی نہیں تھا۔ سفیر کے بیگ میں رکھ دیا تھا ورنہ اسے دیکھ کر تو یہ لوگ واقعی مجھے الجھنسی کا بندہ سمجھنے لگتے۔ موبائل بھی موجود تھا جسے میں نے باہر نکالا اور سفیر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل بجی اور فوراً ہی کال رسیو ہو گئی۔ سفیر نے ہیلو کے جواب میں کہا۔ ”آپ ہیں کہاں۔ ابھی ابھی وسیم وہاں سے واپس آیا ہے۔ میزبان نے بتایا کہ

آپ جا چکے ہیں؟ کہاں پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”یقین کرو میں پھر اغوا ہو گیا ہوں؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”یوں کہیں کہ اغوا سیریز چل رہی ہے۔ ہر قدم پر اغوا ہو رہے ہیں۔“ سفیر نے شاید مائیک کھول رکھا تھا

اس لیے کہ اس بار آواز وسیم کی آئی تھی۔ ”جلدی بتائیں کہ اس وقت آپ ہیں کہاں؟“

”یہی تو معلوم نہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ یہ بات غلط بھی نہیں تھی میں نے ابھی تک باہر کا

منظر دیکھا بھی نہیں تھا۔ آتے وقت باتوں میں اس نے مجھے الجھا لیا تھا اسی لیے میں ادھر ادھر دیکھ نہیں سکا۔ عقلمند

ہمیشہ ہوشیار رہتے ہیں لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں اس بندے پر اتنا اعتماد کیوں کر بیٹھا تھا۔ دراصل میرے

ذہن میں خطرے کی کوئی بات آئی نہیں تھی۔ میں اسے ایک معمولی ڈرائیور سمجھا تھا جس کا خمیازہ بھگت چکا تھا۔

”کیا کسی کمرے میں قید ہیں؟“

”نہیں آزاد ہوں لیکن مقام نامعلوم ہے۔ پتا نہیں کون سی جگہ ہے۔ ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں“ کہتے ہوئے

میں اندر کی طرف بڑھا۔ ریاست خان کو ہوش نہیں آیا تھا۔ اس کے سر کو اپنی گود میں لیے ہوئے صغیر بیٹھا تھا۔ اس

سے ظاہر تھا کہ صغیر واقعی اسے دل کی گہرائی سے دوست سمجھتا تھا۔ جیدے اور اللہ ڈینو کے چہروں پر بھی غم کی

پرچھائیں نظر آرہی تھی لیکن وہ اس قدر ٹوٹے ہوئے نظر نہیں آرہے تھے جتنا صغیر ٹوٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ

بس سر جھکائے غمگین سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس علاقے کا نام کیا

ہے؟ کسی کو معلوم ہے؟“

”جی ہاں، یہ گلگت شہر سے تقریباً آٹھ کلومیٹر پہلے آنے والا قصبہ مینوار ہے۔ یہ گھر کسی شاہ کا ہے جسے

انہوں نے کرایہ پر حاصل کیا ہوا ہے۔“ جیدے نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

میں نے فون پر بتایا۔ ”یہ مینوار ہے، ہم جس گھر میں رہتے ہیں یہ کسی شاہ کا ہے جسے ان لوگوں نے کرایہ

پر حاصل کیا ہے۔“

”او کے ہم دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ جس کی گاڑی حاصل کی ہے وہ ایک اچھا بندہ ہے اور صبح

سے ساتھ ہے، وہ ہر علاقے سے واقف ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”میں نے بھی ایک ایسے ہی بندے پر یقین کر لیا تھا جس کی سزا بھگت لی ہے۔ آنکھیں کھلی رکھنا۔“

”اتفاق ہے کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اسی لیے اس بندے کو پہچان لیا۔ اس کی مدد میں نے ایسے وقت میں

کی ہے جب موت اس کے شہرے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اگر میں مداخلت نہ کرتا تو وہ لاش میں تبدیل ہو

جاتا۔ لمبی کہانی ہے۔ آپ آجائیں تو سناتا ہوں۔“

”یہ بتاؤ جہاں تم ٹھہرے ہو وہاں تفتیش کے لیے کوئی جگہ ہے؟“

”گویا کچھ قیدی بھی ساتھ ہیں۔ بے فکر ہو کر آجائیں۔ یہ اپنا مرتجس شاہ ہے نا۔ بہت کام کا بندہ ہے۔

اس نے آپ کی بات سنتے ہی اشارے سے بتا دیا ہے کہ ایسی جگہ ہے۔“

”جلدی پہنچو اس لیے کہ قیدی ابھی بے ہوش ہیں، ان کے ہوش میں آنے سے پہلے میں انہیں یہاں سے

منتقل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

مجھے پوری امید تھی کہ وہ میرے لہجے کو پہچانتے ہیں۔ لہجے نے بتا دیا ہوگا کہ میں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں اور وہ ہوا میں اڑتے پرندوں کی سی تیزی سے آرہے ہوں گے۔ میں نے ایک بار پھر ریاست خان کو دیکھا۔ وہ اسی طرح بے ہوش پڑا تھا۔ شاید اس پر بہت زیادہ تشدد ہوا تھا۔ اس کی حالت درست نہیں تھی۔ اسے جلد کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا ضروری تھا۔ ابھی میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ صغیر وغیرہ اس طرح دہل کر چونکے جیسے موت کے فرشتے نے دستک دی ہو۔ میں نے اللہ ڈینو سے کہا۔ ”جا کر دروازہ کھولو۔ باہر میرے آدمی ہیں۔“

وہ کھڑا ہوا لیکن اس کے چہرے پر بے یقینی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن میرا حکم تھا اس لیے وہ اٹھ گیا۔ ابھی وہ دروازے پر پہنچا بھی نہیں تھا کہ مجھے بھی دھڑکا ہوا کہ کہیں واقعی مجھے مغالطہ نہ ہوا ہو کہ میرے آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ امداد شاہ کے آدمی ہوں۔ میں نے اللہ ڈینو کو رکنے کے لیے کہا اور خود دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے میں کوئی رخ نہ تھا کہ میں اس سے جھانک کر دیکھتا۔ اس لیے بحالت مجبوری دروازہ کھولنا پڑا۔ دروازہ میں نے یکا یک نہیں کھولا تھا بلکہ تھوڑا سا کھولا تھا اور داہنے پیر کو دروازے کے پلڑے سے اٹکا دیا تھا کہ اگر زور زبردستی ہو تو آسانی سے دروازہ نہ کھلے۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس لیے کہ میرے سامنے سفیر کا چہرہ تھا۔ میں نے دروازہ پورا کھول دیا۔ اس کے پیچھے دسیم تھا اور دسیم کے ساتھ ایک نیا بندہ تھا۔

”وقت کم ہے اور لوگ زیادہ ہیں۔ جلد انہیں یہاں سے منتقل کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”ابھی لیجئے۔“ کہہ کر سفیر اندر داخل ہوا پھر بولا۔ ”لوڈ کرنے والا مال کس طرف ہے؟“
 ”ادھر والے کمرے میں۔“ میں نے اشارے سے بتایا۔

وہ سب ادھر بڑھ گئے۔ امداد شاہ کو سفیر نے اکیلے اٹھایا۔ دوسرے کو دسیم اور نئے بندے مرتجس نے مل کر اٹھایا۔ وہ شخص باڈی بلڈر تھا اس لیے وزن بھی زیادہ تھا۔ دسیم اور مرتجس شاہ نے بدقت تمام اسے باہر لایا تھا اور اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا۔

”ایک اور ہوگا۔ اسے بھی گاڑی میں ڈالو۔“ کہہ کر میں جیدے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ریاست خان اسی طرح بے ہوش تھا۔ میں نے صغیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈب رہی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔ ”فکر نہ کرو..... ریاست خان کو کچھ نہیں ہوگا۔ میرے آدمی پہنچ گئے ہیں۔ ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔ ضرورت پڑی تو اسے سی ایم ایچ تک لے جائیں گے۔“
 ”صاحب جی کچھ بھی کریں میرے یار کو بچالیں۔ یہ بہت نامیں بندہ ہے۔ نماز بالکل قضا نہیں کرتا۔ آپ اس پر رحم کریں۔ اللہ اجر دے گا۔“ وہ منتیں کرنے لگا۔

”ارے بے وقوف۔ وہ میرا بھی یار ہے۔ میری وجہ سے وہ اس مصیبت میں پھنسا ہے۔ ہم اسے ہر حال میں ٹریمنٹ دلائیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”اب اسے لے جانا ہے۔“ پھر جیدے کی طرف مڑ کر کہا۔
 ”اسے اٹھاؤ تا کہ باہر لے جاسکوں۔“

جیدے، صغیر اور اللہ ڈینو نے اسے ہاتھوں پر اٹھالیا اور ہم باہر پہنچے۔ اتنی دیر میں قیدیوں کو بھی گاڑی میں

بھرا جا چکا تھا۔ بڑی سیٹ پر ریاست خان کو لٹا دیا گیا۔ صغیر نے اس کے سر کو اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ اس وقت ہائی روف کی حالت اگر کمپنی والے دیکھ لیتے تو مارے خوشی کے بے ہوش ہو جاتے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ہائی روف میں اتنے سارے بندے ”ٹھونے“ جا سکتے ہیں۔ مرتجس گاڑی چلا رہا تھا۔ سڑک بھی ہموار تھی اس لیے سفر کا پتا ہی نہ چلا اور ہم گلگت کے اس مکان میں پہنچ گئے جو سفیر نے عقلمندی دکھاتے ہوئے کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔ اگر کسی ہوٹل میں ٹھہرتا تو وہاں یہ سرگرمی ممکن نہ ہوتی۔

مکان کے احاطے میں ہائی روف کو روک کر مرتجس اتر ا۔ اس نے پچھلا دروازہ اوپر اٹھا کر کہا۔ ”ان حرام خوروں کو کیسے اتارا جائے۔ سب کے سب بے ہوش ہیں۔“

”میں ہوں نا۔“ وسیم نے آگے بڑھ کر کہا اور امداد شاہ کو کھینچ کر کندھے پر اٹھالیا پھر اندر کی طرف بڑھا۔ عبداللہ نے جیدے کے ساتھ مل کر باڈی بلڈر کو اٹھایا۔ تمام قیدیوں کو اندر پہنچانے کے بعد وہ ریاست خان کی طرف بڑھے تھے کہ میں نے مرتجس سے کہا۔ ”بھائی میاں، کوئی اچھا ڈاکٹر مل جائے؟“

”کیوں نہیں..... یہاں بلانا ہے یا اسے لے جانا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”اگر کوئی قائدے کا اسپتال ہے تو وہیں لے چلو۔“

”میرے خیال میں بندے کی حالت بتا رہی ہے کہ اسے اسپتال لے جانا بہتر ہے۔“ وسیم نے اپنا خیال

ظاہر کیا۔

”شاہرہ قائد اعظم پر فیملی ہسپتال ہے۔ وہاں میرے جاننے والے اسٹاف ہیں۔ وہیں چلتے ہیں۔“

مرتجس نے کہا۔

”وہاں فیسلسٹی تو ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں کسی بھی بڑے اسپتال کے مقابلے میں اچھا اسپتال ہے۔“ مرتجس نے کہا۔ ”اہم بات یہ ہے

کہ وہاں کے کئی ڈاکٹر میرے جاننے والے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمیں آسانی ہوگی۔“

”اس کے بارے میں کوئی تفتیش تو نہیں کرے گا کہ یہ زخمی کیسے ہوا۔ پہلے پولیس میں رپورٹ درج

کرائیں۔“ میں نے مرتجس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ یہ سوال یوں بھی ضروری تھا کہ اس دور میں کون

خواہ مخواہ کی سروردی مول لیتا ہے۔ سب کو اپنی پڑی ہے۔ ایک ذرا سی الجھن بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بن جاتا

ہے۔ پھر پولیس والے بھی تاک میں رہتے ہیں کہ ان کو کوئی ایسا کلیو ملے۔ ایسا سرانظر آئے جو ان کی جیب کا ابھار

بڑھا دے۔ وہ ڈاکٹر سے باز پرس کر سکتے تھے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بغیر پولیس میں اندراج کرائے میڈیکل

ٹریٹمنٹ دی۔ اگر وہ پولیس کو خبر دے دیتے تو ان کا تو کچھ جاتا نہیں لیکن پولیس والوں کی جیب کا بھلا ہو جاتا خبر

نہ دینے کی صورت میں پولیس والوں کے نقصان کی بھر پائی ڈاکٹر کے ذمے ہوتی کہ وہ اس ناشتاپانی کے لیے کچھ

دیں۔

اپنی جیب کو ہلکا کرنا کسے پسند ہے اس لیے ڈاکٹر صاحبان کیس درج کروانے کے فرائض خود ہی انجام

دیتے ہیں اور میں اس الجھن سے بچنا چاہتا تھا۔ میری الجھن مرتجس نے دور کر دی۔ ”نہیں جناب، میں ہوں نا۔

پولیس تک بات نہیں پہنچے گی۔“

مرتب جس پھر سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور ہم اسپتال کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ مرتب جس کی واقفیت بہت لوگوں سے ہے۔ اس کے کہنے پر فوراً ٹریینٹ دیا جانے لگا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایکس رے میں سب خیریت ہے۔ شاید اندرونی چوٹ آئی ہے جس کی وجہ سے یہ بے ہوش ہوا ہے۔ ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ جلد ہوش آجائے گا۔ مگر اتنی چوٹیں آئیں کیسے؟

”اسے کچھ غنڈوں نے لوٹنے کے لیے الٹا لٹکا دیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم نے یہ بات پہلے ہی جان لی ہے۔ اس لیے کہ اسکیٹنگ میں غذا کی نالی میں کچھ مواد نظر آیا ہے جسے ہم نے صاف کر دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کے گردے پر چوٹ لگی ہے جس کا اثر اچھا نہیں ہے ویسے ہم نے اس کے لیے بھی انجکشن لگا دیا ہے۔ آرام آچکا ہوگا۔“

”کیا اسے رات بھر یہیں رکنا پڑے گا؟“

”یہ زیادہ بہتر ہے لیکن آپ اگر گھر لے جانا چاہیں تو لے جاسکتے ہیں لیکن دو تین گھنٹے کے بعد۔“ ڈاکٹر کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ زیادہ سیریس نہیں ہے۔ میں بھی مطمئن ہو گیا۔ صغیر کو وہیں چھوڑا اور واپسی کے لیے نکل پڑا لیکن انہیں سمجھا دیا تھا کہ جو کوئی بھی پوچھے تو یہی بتانا ہے کہ کچھ لوگوں نے لوٹنے کے لیے اسے زد و کوب کیا ہے اور وہ سب ٹریکنگ کے لیے آئے ہیں۔

واپس آیا تو وسیم بے چینی سے منتظر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی بولا۔ ”اندر موجود صاحب بے چینی سے منتظر ہیں کہ آپ آجائیں تاکہ ان کی خاطر داری ہو سکے۔“

”اسے ہوش آ گیا؟“

”جی ہاں..... وہ چیخنے کی کوشش متواتر کر رہا ہے۔“

”چلو دیکھتے ہیں۔“ کہہ کر میں نے اندر قدم بڑھا دیا۔ وہ کمر ساؤنڈ پروف نہیں تھا اس لیے اس کی چیخ باہر تک سنی جاتی اس خطرے کے پیش نظر میں نے اندر جاتے ہی دروازہ بند کیا پھر امداد شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ کینہ تو نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔ ”امداد شاہ یا جو بھی تمہارا نام ہے۔ غور سے سن لو۔ اگر تم نے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا تو میں الگ ہٹ جاؤں گا اور باقی کے سوالات میرا یہ ساتھی کرے گا۔“ کہہ کر میں نے میرے بعد اندر آنے والے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بندہ تھرڈ ڈگری کا ماہر ہے۔ اس کی مار کا جواب نہیں۔ جسم سے ایک قطرہ خون نہیں نکلتا اور اندرونی حالات خستہ تر ہو جاتی ہے جسے کوئی ڈاکٹر تشدد ثابت نہیں کر پاتا۔ اب سوچ لو۔ میرے سوالات کا جواب سیدھے سیدھے دو گے یا اس کا سامنا کرو گے۔“

امداد شاہ کا منہ بند تھا۔ وہ بولنا چاہتا بھی تو بول نہ پاتا لیکن اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ آنکھوں میں نفرت کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ میں نے سفیر کو آواز دی۔ وہ کسی جن کی طرح فوراً حاضر ہو گیا۔ شاید وہ دروازے سے لگا کھڑا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر مدد دے سکے۔ اس نے اندر آتے ہی ایک نظر امداد شاہ پر ڈالی پھر منہ دوسری طرف کر کے تھوکا اور پھر جیب سے قلم تراش نکال کر ”کی رنگ“ سے اسے الگ کیا۔ وہ چھوٹا سا چاقو کتنا دھاردار ہے اس کا مجھے اندازہ تھا۔ اس نے چاقو کی دھار پر انگلی پھیری پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”جی

فرمائیں..... پہلے کہاں سے ابتدا کروں..... کس جگہ کی چڑی پہلے چھیلوں؟“

”کچھ توقف کرو..... ایک دو سوال تو کر لوں۔ اگر جواب نہیں دے گا تو میں تمہاری مدد ضرور لوں گا۔ ابھی تو اس لیے بلایا ہے کہ اس کی ہلکی سی خاطر داری کرنی ہے۔“

”ارے جناب ہلکی خاطر داری کے لیے میں ہوں نا۔“ وسیم نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”چھوٹے کام میں کرتا رہا ہوں پھر انہیں کیوں تکلیف دے رہے ہیں۔“ کہہ کر اس نے وہیں قریب رکھی ایک بالٹی اٹھالی۔ ٹین کی چادر سے بنی یہ بالٹی کسی اور کام کے لیے تھی۔ عام طور سے اب ٹین کی بالٹیاں کم کم ہی استعمال ہوتی ہیں۔ پلاسٹک کی بالٹیاں ہی پسند کی جاتی ہیں۔ اس ٹین کی بالٹی کو وسیم نے الٹی کر کے اس کے سر پر رکھ دی۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے تھے اور سفیر نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ بالٹی سر پر آجانے سے اب وہ کچھ دیکھ بھی نہیں پا رہا ہوگا۔ وسیم نے بالٹی اوڑھانے کے بعد وہیں رکھی ہتھوڑی کو اٹھایا اور اس بالٹی پر چوٹ ماری۔ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میرا منہ بن گیا۔ عجیب سی کراہیت آمیز آواز تھی۔ ابھی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے پھر ہتھوڑی کا وار کیا۔ پھر وہی آواز۔ میں سمجھ رہا تھا کہ جب کھلی سماعت سے ایسی آواز کراہیت شدہ ہے تو بالٹی کے اندر کانوں کے اتنے نزدیک وہ گونجتی آواز کیسی لگ رہی ہوگی۔ اس کے کان جھنجھنا جاتے ہوں گے۔ اسے ہی کہتے ہیں سماعت شکن آواز۔ اس کے کانوں کے پردے پھٹ رہے ہوں گے۔ میں وسیم کا یہ کھیل دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہر منٹ کے بعد ایک چوٹ مارتا۔ پانچویں چھٹی چوٹ پر امداد شاہ نے خود کو زمین پر گرادیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ اذیت برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ اس عجیب و غریب ایذا نے اسے توڑ دیا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے وسیم کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بس اب بالٹی کو اتار لو۔“

وسیم نے بالٹی اتاری تو امداد شاہ کا چہرہ نظر آیا۔ چہرے پر اذیت سہنے کا طمع صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر بندھی پٹی کو ہٹایا ہی تھا کہ وسیم نے اس سے کہا۔ ”کیا حال ہے جناب کا؟ کیا اب جواب دینا پسند کریں گے یا دوبارہ سے بالٹی سر پر رکھوں؟“

بالٹی کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خوف تیر گیا۔ اس نے ڈر کر بالٹی کو دیکھا۔

”یار دلدار اگر جواب دینے پر راضی ہو تو شروع ہو جاؤ ورنہ میرے پاس ابھی اور بھی طریقے ہیں۔ ایسے ایسے طریقے کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی میرا نام سن کر تھر تھرا کر نہیں گی۔ یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں نے کیا یہ ہلکی خاطر داری تھی۔ ابھی مجھ سے زیادہ آزمودہ طریقہ جاننے والے لائین میں اپنی باری کے منتظر کھڑے ہیں۔“ اس نے عبداللہ اور سفیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ سفیر الملک ہیں۔ ان کا کام ہے انسانی جسم کی کھال کو اس انداز میں تراشنا کہ وہ ملک ملک کا نقشہ نظر آئے۔ یقین کرو اس نقشے کی تصویر اتار کر لوگ گوگل پر سیو کر دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو ابہام نہ لگے۔“ پھر اس نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ عبد رب ہے دن بھر اپنے معبود کا شکر ادا کرتا رہتا ہے کہ اس کی ہاتھ میں وہ قوت ہے کہ یہ ایک ہی بار میں انگلی توڑ دیتا ہے۔ راہ چلتے انگلی توڑتا ہے اور انگلی والے کو پتا بھی نہیں چلتا۔ یہ کام اتنی پھرتی سے کرتا ہے کہ دس منٹ میں بیس انگلیاں پور پور ہو جاتی ہیں۔ ابھی اس کا پریکٹیکل مظاہرہ ہوگا۔ عملی مظاہرہ۔ دیکھو گے نا؟“

وسیم کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ امداد شاہ سے دوستانہ بھارہا ہو۔ ہنسی مذاق کر رہا ہو۔ اس کی باتوں پر سب

کے چہرے پر شگفتگی آگئی تھی صرف امدادشاہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

اس کے سستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر سفیر آگے بڑھا۔ اس نے امدادشاہ کی تھوڑی کوپکڑ کر اوپر اٹھایا اور پھر کہا۔ ”تم نے سپاہی نمبر 335139 کا نام سنا ہے؟ ان کا نام تھا سپاہی مقبول حسین۔ وہ 1965 کی جنگ کے شروع میں زخمی ہو کر انڈین قید میں چلے گئے۔ ان پر انڈین نے کیسے کیسے ظلم نہ کیے ان کی زبان تک کاٹ دی لیکن وہ پاکستان زندہ باد کہتے رہے۔ ان پر جتنے ظلم ہوئے تھے اس کا حساب لینا بھی باقی ہے۔“

سفیر کی باتوں نے اس کو چہرے پر خوف کے سائے مزید گہرے کر دیئے۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اتنے میں عبداللہ آگے بڑھا اس کے ہاتھ میں پلاس تھا۔ اس نے پلاس بجاتے ہوئے کہا۔ ”آج کئی دن ہو چکے ہیں مجھے دلی خوشی نہیں ملی۔ جانتے ہو مجھے خوشی کس بات سے ملتی ہے؟ جب میرے پلاس کی جگڑ میں آکر کسی کی انگلی چرچراتی ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ دل میں ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔“

وہ سب مل کر اسے نفسیاتی طور پر اتنا زیادہ خوفزدہ کر چکے تھے کہ مجھے اس پر محنت کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”بولو، کیا تم میرے سوالوں کا جواب دینا پسند کرو گے؟“

اس نے خوفزدہ نظروں سے پہلے عبداللہ کے پلاس کو دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوف بس سا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہ اندر سے ٹوٹ چکا ہے، میں نے پوچھا۔ ”تم نے ریاست خان پر تشدد کیوں کیا؟“

اس نے جواب دینے کی بجائے ہونٹوں پر زبان پھیرا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا لیکن جواب دینے سے بھی انکاری تھا۔ میں نے اس سے پھر پوچھا۔ ”اگر تم جواب نہیں دو گے تو میں ان دونوں سے تمہیں بچا بھی نہیں پاؤں گا۔“

”کیا آپ کا تعلق آئی ایس آئی سے ہے؟“ اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

”ہم کون ہیں یہ بھول جاؤ، صرف سوالوں کا جواب دو۔“ میں نے تنبیہ کی۔ ”ریاست خان پر تشدد کس وجہ سے کیا؟“

”اسے ایک کام دیا گیا تھا وہ اس نے نہیں کیا۔“ امدادشاہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”وہ کام کیا تھا؟“

”مجھے خود نہیں پتا؟“ اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

میں نے سفیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ایک کام کرو۔“

”کیا کرنا ہے؟ چمڑی چھیلنا شروع کر دو؟“ سفیر نے جیب سے قلم تراش نکالتے ہوئے جوابا کہا۔

”نہیں، ایسا کرو ایک موم بتی لے آؤ۔“

”جی ابھی لایا۔“ کہتے ہوئے سفیر باہر نکل گیا۔ جتنی تیزی سے وہ گیا تھا اسی تیزی سے وہ لوٹ آیا۔ میں نے دسم سے کہا:

”اس والی رستی کو لے کر اسے کھڑکی کے ساتھ باندھ دو، سلاخیں مضبوط ہیں۔ اس لیے بندھن سخت ہونا

ضروری ہے تاکہ یہ بل نہ سکے۔ اس طرح سے باندھنا کہ یہ بیٹھا رہے۔“
وسیم نے رتی اٹھائی اور اس بندھے ہوئے بندے کو دوبارہ سے باندھ دیا۔
”اب اس کے داہنے پیر کو اٹھا کر اس کرسی سے باندھو تاکہ پیر نیچے نہ گرے۔“

اس نے یہی کیا۔ اس کے داہنے پیر کو کرسی سے باندھ دیا۔ اب وہ عجیب حالت میں بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی پنڈلی کے نیچے لے جا کر موم بتی کو جلا کر رکھ دیا۔ موم بتی کی لو اس کی پنڈلی سے ٹکرا رہی تھی۔ جلا رہی تھی۔ گو کہ لو اتنی اونچی نہیں تھی کہ فوراً گوشت کو جلانے لگتی لیکن اس کی تپش پہنچنا شروع ہو چکی تھی۔ اس نے جس طرح مجھے اذیت دی تھی اسی کے مقابلے کی اذیت میں اسے دے رہا تھا۔ میں نے مڑ کر عبد اللہ سے کہا۔ ”ایسا کرو کہ چل کر باہر ہوا میں بیٹھتے ہیں۔ جب اس کا دل چاہے گا ہمیں آواز دے لے گا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ایسا کرتے ہیں کھانا آگیا ہے ہم سب باہر ہوا میں بیٹھ کر کھا لیتے ہیں۔“ وسیم نے جواب دیا اور ہم سب باہر کی طرف بڑھنے لگے۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے امداد شاہ سے کہا۔ ”جب صحیح جواب دینے کا موڈ ہو مجھے آواز دے لینا۔“

یہ وہی جملہ تھا جو اس نے مجھ سے کہا تھا اور وقت نے وہی جملہ میری زبان سے کہلوا دیا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خود کو کبھی قوی مت سمجھو۔ صرف حق ہی فتح پاتا ہے۔ اس نے غرور میں یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ بہت قوی ہے لیکن وقت نے اس کی اوقات دکھا دی۔ اب میری باری تھی کہ میں اسے اس کی اوقات بتا دوں کہ ابھی وطن کے سپوت زندہ ہیں۔ ابھی بھی دشمنانِ وطن کی آنکھوں میں سلائی پھیرنے کے لیے معمولی لوگ کافی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ زیادہ دیر موم بتی کے شعلے کو سہہ نہیں پائے گا۔ بس کچھ دیر کی بات ہے کہ اس کا حوصلہ جواب دے جائے گا۔
باہر آتے ہی میں نے کہا۔ ”وسیم تم ایسا کرو کہ ریاست خان کے پاس چلے جاؤ۔ اسپتال میں کسی ایک اہم شخص کا رہنا ضروری ہے۔“

”میں چلا جاتا ہوں۔“ سفیر نے خود کو پیش کیا۔

”اگر تم جانا چاہو تو بہتر ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے فیصلہ بھی کر سکتے ہو۔ اس بندے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ایک معصوم شخص ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں میں سب سمجھ گیا ہوں۔“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ مجھے امید تھی کہ امداد شاہ سے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا اس لیے کہ وہ یقیناً کوئی اہم بندہ ہے۔ اس علاقے میں ایسا بندہ بلاوجہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی خاص مشن پر اس علاقے میں آیا ہے۔ اس نے اپنا جال کہاں تک پھیلا لیا ہے۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔ میری قوتِ سماعت مکمل طور پر کمرے پر مرکوز تھی۔ اس کی قوتِ برداشت جواب دیتی تو وہ خود مجھے آواز دیتا۔ اس لیے کہ جس حالت میں اس کے پیر بندھے تھے اس حالت میں اس کے پیروں کے مسلز اکڑتے اور اس پر موم بتی کا شعلہ اس کے گوشت کو جلاتا اور وہ بل بھی نہیں پاتا یہ اذیت اس کے لیے عذابِ ثابت ہوتی۔ وہ اس عذاب کو زیادہ جھیل نہیں پاتا۔ اسے میرے آگے جھکنا ہی تھا۔ لیکن ابھی تک اس نے آواز نہیں دی تھی۔ اس لیے میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کمرے میں اللہ ڈینا اور جیدے بستر پر بیٹھے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھے جیسے سب ل کر کچھ سوچ رہے ہوں۔ میں نے کمرے میں داخل

ہوتے ہی کہا۔ ”اور بھائیو کیا حال ہے؟“
 ”سر، ریاست خان کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ جیدے نے پوچھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ فکر مند ہے۔
 واقعی وہ ریاست خان سے محبت رکھتا تھا۔ ورنہ وہ اتنا پریشان کیوں ہوتا۔ اس کی پریشان صورت دیکھ کر میں نے
 اس کی پیٹھ پر تھکی دے کر کہا:

”سب خیریت ہے۔ شام تک وہ آجائے گا۔“

”اس کو اندر کی مار بہت پڑی ہے۔ اندر کچھ خرابی نہ آگئی ہو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”صرف سر پر ایک چوٹ ایسی ہے جس نے مجھے
 پریشان کر دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ بھی معمولی ہے۔“
 ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ صغیر نے خوش ہو کر کہا۔

ابھی میں اس سے بات ہی کر رہا تھا کہ میری جیب میں موبائل کی بیل بجی اور میں نے جلدی سے نکال کر
 دیکھا۔ سفیر کی کال تھی۔ میں نے بٹن پیش کیا اور کان سے لگا لیا۔

”ڈاکٹر نے اسے وارڈ میں منتقل کر دیا ہے۔“

”یہ تو اچھی خبر ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایک بات میں نے محسوس کی ہے۔ ابھی کنفرم نہیں ہوں۔ آپ وسیم کو بھیج دیں۔“

”کیوں، خیریت تو ہے؟“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ایک آدمی مسلسل ریاست خان پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو پوری طرح ہوشیار رہنا۔ میں ابھی عبداللہ اور وسیم کو بھیج رہا ہوں۔“

”دونوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وسیم کافی ہے۔“

”وسیم کو تو بھیجوں گا ہی۔ اس کے پیچھے عبداللہ جائے گا تا کہ کور دے سکے۔ وہ تم دونوں سے دور رہ کر نظر
 رکھے گا۔“

”جیسا من سب سمجھیں۔“ اس نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

اب مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ کوئی لمبا چکر ہے اور امداد شاہ کوئی بڑا کھلاڑی ہے۔ اس سے سچ اگلوانا
 ضروری ہو گیا تھا۔ اس سے نمٹنے کے لیے ضروری تھا کہ میں ان لوگوں کو یعنی ریاست خان اور اس کے ساتھیوں کو
 یہاں سے چلتا کر دوں۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں امداد شاہ والے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس طرف جانے کی
 ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اب پھنسی پھنسی آواز میں مجھے پکار رہا تھا۔ آواز لگا رہا تھا کہ جو بھی ہے جلد آئے۔ میں ٹہلنے
 کے انداز میں اس کمرے میں داخل ہوا۔ شمع نے اپنا کمال دکھا دیا تھا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی بو پھیلی ہوئی
 تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر موم بتی کو بجھا دیا۔ اگر اس کا سر بندھانہ ہوتا تو یہ کام وہ کب کا کر چکا ہوتا۔ میں نے
 اس سے پوچھا۔ ”اب بتاؤ کیسا محسوس کر رہے ہو؟ میرے سوالوں کے جواب دو گے یا مزید موم بتیاں جلا کر باہر
 چلا جاؤں؟“

”ہم ہر سوال کا جواب دیں گے۔“ اس نے کراہنے کے انداز میں جواب دیا۔

”تم نے ریاست خان کو کون سا کام دیا تھا جو وہ کر نہیں سکا؟“

”ہمارا ایک مہمان آنے والا تھا اسے تم نے پریشان کر کے بھگا دیا۔ تم ہو کون؟“

”میں خدا کی فوجدار ہوں۔ یہ بتاؤ کہ وہ مہمان کون تھا؟“

”وہ ہمارے گروپ کو امداد دینے والے کا نمائندہ تھا۔ اس کو یہاں کوئی کام انجام دینا تھا۔“

”کون سا کام؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اس بارے میں ہمیں بھی نہیں معلوم۔“ اس نے اپنے پیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو میں ایسا کرتا ہوں کہ اپنے ساتھی کو بلاتا ہوں وہ خود پلاس سے ناخن کھینچ کر پوچھ لے گا کہ تمہیں معلوم

ہے یا نہیں۔“

”یقین کرو کہ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔“ اس کی آواز میں کرب ہی کرب تھا۔ میں نے

محسوس کر لیا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس لیے اس سوال کو چھوڑ دیا اور نیا سوال کیا:

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا تعلق کس گروپ یا لوگوں سے ہے؟“

”ہمارا کوئی گروپ نہیں۔ میں بھی ریاست خان کی طرح حضرت جی کا مرید تھا۔“

”کون حضرت جی..... اس ملک میں کئی کروڑ حضرت جی ہوں گے۔ ان میں سے کس کی بات کر رہے

ہو۔“

”میں حضرت مرشد جی کا مرید تھا۔ ان کا ایک اور مرید ہے، ناصر شاہ۔ وہ مجھ سے کام لیتا رہتا ہے۔ ہر

کام کے الگ پیسے ملتے ہیں۔ اس بار اس نے مجھے یہ کام سونپا تھا کہ میں ریاست خان پر نظر رکھوں۔ اس سے کوئی

شخص ملنے آئے گا۔ وہ اسے کوئی کام سونپے گا۔ اگر ریاست خان وہ کام نہیں کر سکے تو اس پر میں دباؤ ڈالوں۔“

”دروغ گور احافظہ ناشد..... تم نے خود کہا تھا کہ مرشد جیسے لوگوں سے تم خود کام لیتے ہو اور اب کہہ رہے

ہو کہ تم اس کے مرید تھے..... اس دروغ گوئی کی وجہ بھی بتاتے چلو۔“

”جو ہم نے پہلے کہا تھا وہ بھی صحیح تھا اور جواب کہہ رہا ہوں وہ بھی صحیح ہے۔ پہلے میں نے مرشد کے ہاتھ

پر بیعت کی ان کا مرید بنا لیکن بعد میں جب ناصر شاہ کے ساتھ کام کرنے لگا تو سمجھ آئی کہ مرشد تو ایک کھلاڑی

ہے۔ اپنے چہرے پر تقدس کا ملمع سجائے ہوئے ہے۔ اس لیے اس کی قدر میری نظروں میں کم ہو گئی اور میں نے

اس بیعت کو بھلا دیا اور ناصر شاہ کے ساتھ کام کرنے لگا۔“

”گویا تم سے کام لیتا ہے ناصر شاہ۔ اسی نے حکم دیا تھا کہ ریاست خان پر دباؤ ڈالو؟“

”جی ہاں!“

”دباؤ ڈالنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اسے ختم کر دو۔“

”اس کے بارے میں نئی ہدایت مجھے فون پر ملی کہ ریاست خان نے غداری کی ہے اور ایجنسی والوں سے

مل گیا ہے۔ اس نے کس کس ایجنسی کو کیا کیا بتایا ہے۔ یہ مجھے معلوم کرنا تھا اسی وجہ سے میں نے اس پر سختی کی تھی۔

اس کی غداری کی وجہ سے ہم سب خطرے میں آ گئے ہیں اسی کا مجھے غصہ تھا۔“

”تمہارے ساتھ جو لوگ ہیں کیا یہ بھی ناصر کے آدمی ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”ناصر رہتا کہاں ہے؟“

”پنڈی میں۔“

”ٹھیک ہے اب آرام کرو۔ جلد ہم سفر پر چلیں گے۔ تم بھی میرے ساتھ ہو گے؟“

اسے ہدایت دے کر میں باہر آ گیا۔ اب مجھے سفیر وغیرہ سے مشورہ کرنا تھا۔ حالانکہ سفیر ہو یا وسیم یا عبداللہ میرے فیصلے سے کوئی بھی انحراف نہیں کرتا لیکن پھر بھی میں ان سے مشورہ ضروری سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ساتھی میرے لیے سب کچھ تھے۔ عبداللہ کے کمرے میں آیا تو وہ نیٹ پر چیٹنگ کر رہا تھا۔

”یہ بچوں والا شوق کب سے شروع کر دیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مافی کا پیدا کرنا شوق مافی کے کام آ رہا ہے۔ اسی سے باتیں ہو رہی ہیں۔“

”اچھا..... وہ اس وقت کہاں ہے؟“

”وہیں..... وہی میں..... اسے فلیٹ راس آ گیا ہے۔ اس نے اپنا سب کچھ وہیں منتقل کر لیا ہے۔ شاید آپ کو بتایا بھی تھا کہ وہ جس کے لیے مراجار ہا تھا، جس سے باتیں بھی سرگوشیوں میں کیا کرتا تھا اب اس سے زور زور سے باتیں کرتا ہے۔ بس شرعی تقاضا پورے کرنے کے لیے ہمارا انتظار کر رہا ہے تاکہ ہم جا کر اسے مزید عذاب میں ڈالنے کے لیے لاہور سے اس کی جان کو دہی پرواز کرائیں۔“ عبداللہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

”ارے بات یہاں تک پہنچ گئی..... چلو اچھا ہوا..... بیٹو کا زندگی بھر افسوس رہے گا۔ کاش اسے بھی اس کی محبت سے ملا سکتا۔“ میں نے افسوس بھرے انداز میں کہا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آپ کو حیرت نہیں ہے کہ مافی جیسا کم گو اور معصوم بچہ ایک لڑکی کے لیے اس طرح پاگل ہوا تھا ہے۔“

”جی ہاں یہی بات مافی بھی کہتا تھا لیکن ذرا آہستہ سے اس لیے کہ وہ بڑوں کے پیار میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔“ وسیم نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اس چوٹ پر عبداللہ تلملا گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ بولتا بھی کیسے اس لیے کہ وسیم نے حقیقت بیان کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی عشق کی آگ میں تپ رہا ہے۔ بھلے ہی وہ اسے مظلوم لڑکی سمجھ کر آگے بڑھا ہو لیکن وہی چنگاری آگ بن چکی تھی، اسی طرح جیسے وسیم سعدیہ کے لیے رحم کے جذبے سے بڑھا تھا لیکن بعد میں وہی اس کے لیے سب کچھ ہو گئی۔ اگر میری زندگی بھی معمول پر آگئی تو میری کوشش ہوگی کہ ہم سب ایک جگہ رہیں۔ پاس پاس گھر ہو۔ ایک میں مونا کے ساتھ۔ تیسرے میں وسیم اور سعدیہ۔ تیسرے میں عبداللہ اور بانو چوتھے میں مافی اور شازیہ پانچویں میں ایاز اور شاہین خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے اور میں خواب دیکھ رہا تھا کہ وسیم کی آواز نے حال میں کھینچ لیا۔

”اس بد بخت نے کچھ اگلا یا ابھی کچھ اور خاطر داری کرنی ہے؟“

وسیم کے سوال پر میں نے جواب دیا۔ ”اس نے بہت کچھ بتایا ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے ہمارا پنڈی جانا ضروری ہے۔ تمام کڑیاں مرشد کی خانقاہ سے مل رہی ہیں۔ جسے ہم نے اجاڑ دیا تھا وہ اب ایک نئے انداز میں سامنے آئی ہے۔“

”چلیں اس بہانے مجھے بھی اپنا کچھ پرانا حساب چکنا کرنا ہے۔“ وسیم نے عادت کے مطابق مزاح کا

انداز اختیار کیا۔

یہ میرے دوست، میرے غمخوار، میری جان۔ میں وسیم کو محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا کہ یہی تو وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے میری زندگی میں بہار ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی شوخی ان کی شگفتہ بیانی میں کمی نہیں آتی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں کب کا حوصلہ ہار چکا ہوتا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”یہ مرتجس کیسا بندہ ہے؟“

”اسے ہم نے موت کے منہ سے چھینا ہے اس لیے نمک حلائی تو کرے گا ہی..... آگے اللہ جانے۔“

”حالات ایسے الجھ رہے ہیں کہ ہر ایک پر یقین کیا نہیں جاسکتا۔ اب یہی دیکھو جس بندے کو میں نے معمولی ڈرائیور سمجھا تھا وہ ایک بڑا مہرہ نکلا۔“

”یہ ہمیں کن حالات میں ملا پہلے یہ سمجھ لیں۔ پھر آپ کا جو فیصلہ ہو گا اسی کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کریں گے۔“ وسیم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ کمر اگرچہ چھوٹا تھا لیکن درمیان میں تھا اس لیے ہم نے اس کو اہمیت دی تھی۔ میں اسی کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا تا کہ ضرورت پڑنے پر ایکشن لیا جاسکے۔ ایک کمرہ ادائیگی جانب تھا اور دوسرا بائیں۔ ایک میں باڈی بلڈر اور اس کے ساتھی کو رکھا تھا اور دوسرے میں صغیر اور اس کے ساتھی تھے۔ اس درمیانی کمرے میں ہم آرام سے میٹنگ کر سکتے تھے اسی لیے میں وسیم کو کوکریدر ہاتھا۔ عبد اللہ بھی میری طرف متوجہ تھا۔

”ہم تینوں جہاں اترے تھے وہاں سے بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ راستہ کچھ سناں تھا۔ دور دور تک میدان تھے۔ کہیں کہیں گھنی جھاڑیاں بھی تھیں۔ اس ویران راستے میں انسان کی شکل دیکھنے کو ہم ترس گئے۔ یوں بھی یہاں لاہور کراچی کی طرح ہر گلی کوچے میں بھیڑ تو ہوتی نہیں ہے۔ ابھی ہم کچھ ہی آگے گئے تھے کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی کسی کا گلا دبا رہا ہو اور وہ جکڑ سے نکلنے کے لیے کوشش کر رہا ہو۔ یہ آواز سفیر نے بھی سنی تھی وہ بھی چونکا ہو گیا۔ اس نے اشارے سے مجھے رکنے کو کہا اور ان جھاڑیوں کی طرف بڑھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ نزدیک پہنچتے ہی اس نے لکارا۔ لکار سنتے ہی اندر سے کسی نے آواز دی۔ ”کون ہے۔ اپنا راستہ لے ورنہ بے موت مارا جائے گا۔“

اتنی دیر میں ہم سب نے جھاڑیوں کو گھیر لیا تھا۔ اس دھمکی نے سفیر پر جنون سا طاری کر دیا۔ اس نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے ان میں سے ایک کو لات ماری۔ وہ تین تھے اور ہم بھی تین۔ جسے لات پڑی تھی وہ اچھل کر دور جا گرا تھا۔ اس کے ساتھی کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ اس نے چاقو لہراتے ہوئے سفیر پر حملہ کیا تھا کہ میں نے اس کی کمر پکڑ لی اور عبد اللہ نے تابوڑ توڑ دو پنج مارے۔ اس کی ناک کا بھرتا بنا اور وہ لہراتا ہوا گرا۔ اتنی دیر میں نیچے دبا ہوا بندہ اٹھ گیا تھا۔ اب وہ بھی ان کی پٹائی میں شامل ہو گیا تھا۔ بس دس منٹ کی دیر لگی اور وہ سب لمبے لمبے ہو گئے۔ تب ہم نے اس بندے سے پوچھا کہ بات کیا تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ لوگ اسے قتل کرنے لائے تھے۔ قتل کرنے کی وجہ کیا تھی یہ پوچھنے پر وجہ جو اس نے بتائی اسے سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ تینوں باہر کے تھے۔ افغانستان میں جب افغان فوجی پھیلی اور وہاں سے آنے والے پناہ گیروں کو حکومت نے اس علاقے میں ایک کیمپ بنا کر رکھا۔ یہ تینوں اسی کیمپ میں رہنے والے تھے اور اس بندے کے ساتھ ڈرائیوری کرتے تھے۔

انہوں نے ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی۔ وہ لڑکی اس بندے کی محبوبہ ہے۔ اس لیے اس نے احتجاج کرتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ ان سے نمٹ لے گا۔ اسی بات پر وہ تینوں اسے بس اسٹاپ سے اغوا کر کے لائے اور اب قتل کرنے والے تھے۔ اس پورے معاملے کو ہم ختم تو نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے مرتجس کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل پڑے۔ اس نے جب بتایا کہ اس کی اپنی سوزوکی ہے اور وہ ڈرائیوری کرتا ہے تو ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ آدمی ایماندار ہے۔ پھر ڈرا ہوا بھی ہے کہ وہ لوگ اسے چھوڑیں گے نہیں اس لیے ہمارے ساتھ ہے۔“

”اس سے پوچھو اگر یہ ہمارے ساتھ پنڈی جانا چاہے تو اس کی سوزوکی پر ہی ہم چل دیتے ہیں۔ راستے میں پریشانی تو ہوگی مگر مجبوری ہے کیونکہ ہمیں بائی روڈ ہی جانا پڑے گا۔ امداد شاہ کو ساتھ لے کر ہم بائی ایر جانے سے تو رہے۔“

”یہ خود بھی پنڈی یا لاہور جانے کا سوچ رہا ہے۔ تاکہ وہاں سے پیسے کما کر لائے اور نکاح کر سکے۔“

”پھر تو ضرور بات کرو۔“

”جی میں ابھی بات کرتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ چلے گا یا نہیں۔“ پھر اس نے سوال کیا۔ ”لیکن اس زخمی بندے کا کیا کرنا ہے؟“

”ریاست خان بھی ہمارا سر در نہیں ہے۔ انسانیت کے ناتے ہم اس کی اتنی مدد کر دیتے ہیں کہ اس کا علاج ہوتا رہے۔ یقیناً تم لوگوں کے پاس بھی اے ٹی ایم کارڈ ہوگا۔ میرے پاس بھی ہے۔ بیگ میں سب کچھ محفوظ ملا ہے۔ اے ٹی ایم کارڈ پورے پاکستان میں کارآمد ہے۔ اچھی خاصی رقم نکال کر اسے دے دیں گے۔ ویسے بھی دو چار دن سے زیادہ وہ اسپتال میں رہے گا نہیں۔ صحت مند ہوتے ہی بائی ایر کراچی یا جہاں جانا چاہے گا چلا جائے گا۔“ میں نے جواب دیا اور باہر نکلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے سفیر سے بات کرنی تھی۔ اس لیے کہ زیادہ دیر کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ امداد شاہ کے اور بھی ساتھی ہوں گے۔ وہ ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔ پھر مجھے جلد سے جلد مرشد سے بھی دو دو ہاتھ کرنا تھا۔ اس لیے یہاں وقت برباد کرنا ضروری نہیں تھا۔

میں اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ اسپتال زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ میں ٹہلتا ہوا ادھر بڑھتا جا رہا تھا۔ شہر چھوٹا سا ہو تو آنے جانے میں آسانی بھی ہوتی ہے اور بھیڑ بھاڑ، ٹریفک کے شور سے بھی نجات ملی ہوتی ہے۔ گو کہ یہ سڑک مرکزی حیثیت کی تھی لیکن گاڑیاں برائے نام چل رہی تھیں۔ میں ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا اسپتال کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میرے قبضہ میں امداد شاہ جیسا بندہ تھا۔ میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب تک یہ بات سامنے نہیں آئی تھی کہ وہ ہے کیا۔ اس کی اہمیت کیا ہے۔ لیکن یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ غداروں کے گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اب اس سے مزید راز اگلوانا تھا جو میں یہاں نہیں، پنڈی پہنچ کر اس سے اگلوں تا۔ تب تک اسے قبضہ میں رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ہر طرف سے ہوشیار رہوں۔ سفیر بتا چکا تھا کہ کوئی مشکوک شخص ریاست خان کی نگرانی کر رہا ہے اس سے یہ بات صاف تھی کہ امداد شاہ کا نیٹ ورک بڑا ہے۔ شہر میں اس کے بندے موجود ہیں۔ کہیں اس کا کوئی ساتھی مجھے ہی شکار نہ کر لے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ادھر ادھر ناقدانہ انداز میں نظر ڈالی۔ مگر ادھر ادھر کوئی بھی مشکوک بندہ نظر نہیں آیا جو مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ میں نے

اپنی رفتار تیز کر دی اس لیے کہ اب اسپتال بھی نزدیک آ رہا تھا۔

اسپتال گو کہ چھوٹا تھا لیکن صاف ستھرا اور جدید سہولیت سے مزین تھا۔ کمپاؤنڈ میں قدم رکھتے ہی ایک خوشگوار سا احساس ہوا۔ سبزے کی چادر دور تک بچھی ہوئی تھی۔ میں آہستہ روی سے اندر کی طرف بڑھا۔ تبھی میری نظر مرتجس پر پڑی۔ وہ ٹھنڈی بوتل لیے اس کمرے کی طرف جا رہا تھا جدھر ریاست خان کو رکھا گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سلام کیا۔

”اب بیمار کی طبیعت کیسی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تو وہ پٹاپٹ بول رہا ہے۔ لگ ہی نہیں رہا کہ اس کی حالت کبھی اتنی خراب تھی۔“ مرتجس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”چلو یہ اچھا ہی ہوا۔“ میں نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

کمرے میں داخل ہوا تو ریاست خان بیڈ پر نیم دراز تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ بشائیت لوٹ آئی تھی۔ اس کے سامنے کرسی پر سفیر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ شاید وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ”ابھی میں نے ویم کو کال کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ریاست خان کورلیز کراہے جائے۔“ اس نے یہ جملہ ریاست خان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

”کیوں بھائی، کیا اس کا خیال صحیح ہے؟“ میں نے ریاست خان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”خود میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے اب ذرا بھی کمزوری محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ بس کمرے سے ذرا نیچے ملکی سی چھین ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ انجکشن دیا جا چکا ہے۔ یہ درد بھی کم ہو جائے گا۔ اب میں خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا ہوں۔“

”یار سفیر میں بھی چاہتا ہوں کہ واپس پنڈی کے لیے نکل لوں۔“ میں نے سفیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں یہاں ٹریکنگ کے لیے آیا ہوں؟ یا نانگا پربت پر چڑھنے والا ہوں؟ کے ٹو سر کرنے والا ہوں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں تو خود جلد واپسی کی سوچ رہا ہوں۔“

”لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ بائی روڈ جایا جائے؟“

”یہ خیال بھی برا نہیں ہے۔ میں آپ کو پنڈی تک پہنچا سکتا ہوں۔ کئی بار مسافر لے کر جا چکا ہوں۔“

مرتجس بولا۔

”لیکن تمہاری سوزو کی اتنی اعلیٰ تو ہے نہیں کہ اس پر اتنا لمبا سفر کیا جائے۔“ سفیر نے دخل دیا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں سوزو کی پر جاؤں گا۔ میرے ایک جاننے والے ٹرانسپورٹر کے پاس ہاؤ

لیکس ہے۔ وہ میں اکثر کرایہ پر لیتا رہتا ہوں۔“

”تمہارے گھر والے؟“ میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ایک ماں تھی اس کا بھی پچھلے دنوں انتقال ہو گیا۔ گویا میں اکیلا ہوں۔ شادی کے لیے ابھی ابھی ایک

لڑکی دیکھی ہے۔ پیسا جمع ہوتے ہی اسے دلہن بنا کر لے آؤں گا۔“

”تو پھر تم ایسا کرو آج ہی جا کر اپنے دوست سے بات کر لو۔ اگر وہ پیشگی کرایہ مانگے تو دے دینا۔“ کہہ

کریں نے ہزار ہزار کے دس نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

”اتنے روپے کی ضرورت نہیں۔ صرف تین ہزار دے دیں۔ وہی بہت ہوگا۔“ اس نے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔

”زیادہ رقم اس لیے دے رہا ہوں کہ ٹنکی بھی بھروالینا اور دیگر ضروری چیزیں بھی لے لینا۔“ پھر میں نے گردن موڑ کر ریاست خان سے پوچھا۔ ”تمہارا ارادہ کیا ہے؟“

اس نے دھکی لہجے میں جواب دیا۔ ”ابھی آپ لوگوں سے دل بھرا نہیں اور آپ جانے کی کہہ رہے ہیں۔ جانا تو مجھے بھی ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے ساتھ لے لیں۔“

”تمہارے ساتھی؟“

”وہ بھی ساتھ چلیں گے۔“

”چار ہم ہیں، چار تم اور تین وہ، یعنی ہمارے قیدی۔ ہائی لیکس میں اتنے آدمی اور سفر لمبا؟“

ریاست خان نے کہا۔ ”وہ موٹا پاڈی بلڈر اور اس کے ساتھی کو میں جانتا ہوں۔ وہ دونوں مقامی غنڈے ہیں۔ ان کو ساتھ لے جانا ضروری بھی نہیں ہے۔ انہیں امداد شاہ نے پیسوں کے عوض بلایا ہوگا۔“

”جی ہاں۔ ان دونوں کو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ دونوں بس اسٹاپ پر غنڈا گردی کر کے پیسے کماتے ہیں۔“ مرتجس نے بھی تائید کر دی۔

”ڈن..... تم لوگ بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔ ہم یہاں سے صبح نماز کے بعد چلیں گے۔“ میں نے ریاست خان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر تھکی دی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ گویا وہ میری اس فیصلے سے خوش تھا۔ سفیر لائق سا بنا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جا کر ڈاکٹر سے بات کرے۔ اگر ڈاکٹر اجازت دے دے تو اسے بھی ساتھ لے لوں گا۔ سفیر اٹھ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا اس نے کہا:

”اگر آپ لوگ ضد کریں گے تو میں اجازت دے دوں گا لیکن ایسا آپ کو اپنی ضمانت پر کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ اس وقت تو صحیح نظر آرہے ہیں لیکن ابھی کسی لمبے سفر پر انہیں لے جانا مناسب نہیں ہے۔ اندرونی چوٹ زیادہ ہے جو خطرے کا باعث بن سکتی ہے اس لیے میرا مشورہ ہے ابھی کم از کم ایک ہفتہ انہیں شہر سے باہر نہ لے جائیں۔ انہیں بیڈرسٹ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر کی باتوں نے ریاست خان کو اداس کر دیا۔ وہ مرجھا سا گیا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یوں سمجھ لو ہم چلتے چلتے تمہیں نظر آ گئے تھے۔ ایسے لاکھوں لوگ راہ میں ملتے ہیں اور پھٹ جاتے ہیں۔ اگر اللہ کو منظور ہوگا تو پھر ملاقات ہو جائے گی۔ جاتے وقت تمہارے اخراجات کے لیے میں صغیر کو پچاس ہزار روپے دے جاؤں گا۔ علاج ہو جائے تو پنڈی آ جانا اگر قسمت میں ہوگی تو ملاقات بھی ہو جائے گی۔“

ریاست خان باضابطہ رونے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور باہر نکل آیا۔ سفیر ساتھ تھا اس کے پیچھے مرتجس تھا۔ ہم تینوں باہر نکلے تو مرتجس نے کہا۔ ”آپ یہیں ٹھہریں۔ میں سوزو کی لے کر آتا ہوں۔“

اس کی سوزو کی پر بیٹھ کر ہم اس مکان میں پہنچے جہاں صغیر وغیرہ منتظر تھے۔ وسیم میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ مرتجس کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”اس سے بات کر لی؟“

”ہاں بات ہو گئی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اور ہم صبح ہی نکل رہے ہیں۔“

”گڈ..... یہاں سے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

”پنڈی لیکن اس سے پہلے میں چاہوں گا کہ تم ایاز کو پنڈی بلا لینا۔ گوکہ اس وقت ایاز کا متبادل ہمارے پاس ہے۔ یہ مرتجس کام کا بندہ لگ رہا ہے لیکن ایاز کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یوں بھی مرشد سے مقابلہ ہے تو ہمیں پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا۔“ میں نے سفیر سے کہا۔

”او کے میں اسے کال کرتا ہوں۔ اسی بہانے مونا سے بھی باتیں ہو جائیں گی۔“ سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”او بھائی! ایاز اپنے ورک شاپ پر ہوگا اور مونا حویلی میں۔“

”کیوں آپ کو بتایا نہیں تھا کہ ایاز اور شاہین کو انکل نے حویلی بلوایا تھا۔ شاید اب بھی وہ وہیں ہو۔“ سفیر نے کہا۔

”یوں کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ مونا سے بات کرنے کا بہانا چاہیے۔“ وسیم نے چوٹ کی۔
”جل کیوں رہے ہو۔ تمہیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ تم سادی سے گھنٹے بھر باتیں شروع کر دو گے۔“ سفیر نے وار کر دیا۔

”سادی سے میں نے ایک دو منٹ سے زیادہ کبھی بات ہی نہیں کی۔ جب کہ تم..... دکھاؤں کال رجسٹر میں ٹائم۔“

”ارے ارے تم دونوں تو لڑنے بیٹھ گئے۔“ میں نے مداخلت کی۔

”کیا کریں، ہم ایک دوسرے پر چوٹ کر کے یاد دلاتے ہیں کہ کوئی آپ کی کال کے انتظار میں بھی بیٹھا ہے۔ کبھی اسے بھی یاد کر لیا کریں۔“ وسیم نے کہا تو مجھے یاد آ گیا کہ ابھی تک میں نے سویرا سے بات نہیں کی ہے۔ مونا اور سعدیہ سے اسے معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں وادی سے لوٹ آیا ہوں۔ یہ میری نااہلی تھی کہ اب تک میں نے اسے کال نہیں کی۔ واقعی وہ کیا سوچتی ہوگی۔ ضرور ناراض ہو رہی ہوگی کہ میں نے اسے کال کیوں نہیں کیا۔ سویرا کا خیال آیا تو میں نے سفیر سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم دونوں لڑتے رہو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بات پیدا ہو اس لیے میں خود ہی کال کر لیتا ہوں۔“

”آمین..... پتھر میں جو تک لگ ہی گئی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ سو بار کال کریں۔ ہمارا کیا ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں جب دل کرے گا دس بیس یونٹ خرچ کر دیں گے۔“ وسیم نے مسکرا کر جوابا کہا۔

انہیں ہنستا ہوا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ میرے موبائل میں وہ نمبر تھا جو وادی میں جانے سے پہلے سویرا نے دیا تھا کہ یہ نمبر اس کے پاس رہتا ہے۔ میں نے اس نمبر کو پیش کیا اور موبائل کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف بیل بج رہی تھی لیکن کال رسیو نہیں ہو رہی تھی۔ میں مایوس ہو کر کال ڈسکنکٹ کرنے والا تھا کہ کال رسیو ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ ادھر سے آواز آئی تھی کہ میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے اتنی دیر بعد کال رسیو کی؟“

”میں کچن میں تھی اور وہاں امی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے کال کیسے رسیو کر لیتی۔“

”تو کیا انہوں نے بیل نہیں سنی ہوگی؟“

”سوال ہی نہیں ہے۔ میں نے نیل بند کر رکھی ہے۔ واہریت سے پتا چلتا ہے کہ کال آرہی ہے۔ جس دن سے مونہ نے بتایا ہے کہ آپ واپس آگئے ہیں میں اسی دن سے ہر وقت موبائل اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔“

”یہ اچھی بات ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور یہ کون سی اچھی بات ہے کہ اتنے دن بعد کال کر رہے ہیں۔“

”اتنے دن بعد..... اللہ کا خوف کرو بی بی پرسوں تو وادی سے نکلا ہوں۔ وہاں سنگٹل نہیں تھا۔ کل کا دن کچھ مصروف گزرا اور آج موقع مل ہی گیا۔“

”سفیر اور وسیم کو کیسے موقع مل گیا کہ انہوں نے پہلی فرصت میں فون کر کے اطلاع دے دی۔“

”وہ لوگ یہاں مجھ سے ایک دن پہلے آگئے تھے۔ میں صبح پہنچا ہوں۔ دن بھر بھاگ دوڑ رہی۔ اب جا کر موقع ملا ہے۔ وہاں کے حالات کیا ہیں؟“

”یہاں سب صحیح ہے۔ بابا نے حفاظتی انتظام انتہائی سخت کر رکھا ہے اس لیے اب تک کوئی بات ہوئی نہیں ہے..... ویسے آپ آکب رہے ہیں؟“

”بہت جلد اور ہمیشہ کے لیے؟“

”میں پھر کہوں گی کہ ان تمام جھگڑوں سے خود کو الگ کر لیں۔ یہاں آکر بیٹھ جائیں۔ یہاں آپ کے دشمن تو کیا ان کے فرشتے بھی پہنچ نہیں پائیں گے۔ اگر آ بھی گئے تو بچ کر جانیں جائیں گے۔ الیکٹرونک آلات سے حویلی قلعہ میں تبدیل ہو گئی ہے۔“

”بہت جلد آنے والا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد تم مجھے اپنے سامنے پاؤ گی۔“

”آپ کے پاس وعدوں کے علاوہ ہے ہی کیا۔“ سویرا کے لہجے میں ناراضگی کا عنصر در آیا تھا۔

”یقین کرو ان دنوں دل میں رہ رہ کر کک سی ہو رہی ہے۔ کافی عرصہ سے ماں جی کی ڈانٹ نہیں کھائی اور نہ ان کے ہاتھ کا بنا ساگ ملا ہے۔“

”اور کوئی یاد نہیں آتا۔“ وہ روانی میں بول گئی۔ عورت خواہ کتنا ہی پڑھ لکھ لے۔ کتنا ہی ترقی کر لے لیکن اس کے اندر چاہے جانے کا جو جذبہ ہوتا ہے وہ کبھی مرتا نہیں ہے۔ موقع ملتے ہی باہر آ جاتا ہے۔ اس بات کا اثر میرے دل پر ہوا، میں کچھ بولتا مگر خود اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ غلط بول گئی ہے۔ اس نے فوراً تھج کی۔

”اس گھر میں بابا بھی ہیں جو منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن ان کی نگاہیں کہتی ہیں کہ وہ آپ کے آنے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔“

اس کی بات سے میں نے بات نکالی۔ ”ہاں بابا بھی یاد آتے ہیں ان کے علاوہ ایک اور ہستی بڑی شدت سے یاد آتی ہے۔“

”کون؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ابھی اگر بتا دیا تو تم جل بھن کر کباب ہو جاؤ گی۔ اس کی یاد ہی تو میرا سرمایہ ہے۔ سوتے جاگتے میں بس اسے ہی یاد کرتا ہوں۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔

میرا مفہوم وہ سمجھ گئی تھی پھر بھی وہ پوچھنے سے خود کو روک نہ سکی۔ اس نے کہا۔ ”وہ ہے کون جس کے نام

روشنی جواب دے جائے۔“

”اچھا تو اس کام کا بھی تجربہ ہے۔ واہ۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ایسا کر چکے ہو۔“ وسیم نے چوٹ کی۔
”مجھے کبھی مونا سے اتنی الفت محسوس ہی نہیں ہوئی ورنہ کر بیٹھتا۔“

”اچھا یہ بات ہے۔ میں مونا سے ضرور ذکر کروں گا کہ تم سے اسے الفت ہی نہیں۔“
”اور وہ تمہارے سر پر گومڑا بھار کر کہے گی کہ مجھے تو ان سے الفت ہے تم چیک کرنے والے کون ہوتے ہو۔“

ان دونوں کی لائیو بحث مزید طوالت اختیار کرے اس سے پہلے میں نے مداخلت ضروری سمجھی اور کہا۔
”اگر تم لوگ خاموش ہو جاؤ تو میں ایک بات کہوں۔“
”ارشاد ارشاد۔“ وسیم نے جوابا کہا۔

”ہم انسان ہیں اور ہمارے لیے غذا ضروری ہے تو کیوں نا عبداللہ مرتجس کے ساتھ جا کر کچھ کھانے پینے کا سامان لے آئے۔“

عبداللہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مرتجس کی طرف دیکھا تھا کہ وسیم بولا۔ ”ایسا کرتا ہوں میں عبداللہ کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔“

مرتجس نے بغیر مانگے سوزو کی کی چابی اس کی طرف بڑھادی۔ وسیم چابی لے کر عبداللہ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی میں نے کہا۔ ”کل ہم لوگ پنڈی میں ہوں گے۔“

”یہ تو ہمیں معلوم ہے نئی بات کیا ہے؟“ سفیر چپکا۔ ”یہاں سے چلیں گے تو پنڈی پہنچ ہی جائیں گے۔“
”وہاں ٹھہریں گے کہاں، اس بارے میں بھی اپنا خیال پیش کرو۔“

”کہیں اور ٹھہرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ راجا صاحب کا بنگلا ہے نا۔“ سفیر نے کہا۔ ”راجا صاحب کے گھر والوں کو اتنی جلدی اس بنگلے کا خیال نہیں آئے گا۔ تب تک ہم اس بنگلے کو استعمال کر سکتے ہیں۔“

”لیکن وہ بنگلا مرشد کی نظروں میں ہے اور نمٹنا اسی سے ہے۔“ میں نے کہا۔
”یہ تو بعد کی بات ہے ابھی ہم وہاں جا کر ایک دو دن تو آرام کر سکتے ہیں۔ بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ وسیم کا وہ دوست جو اسٹیٹ ایجنٹ ہے اس کے ذریعہ کسی اچھے علاقے میں فرنشڈ گھر لے لیں گے۔“

”ایک گھر وہ والا ملا تھا نا جہاں کا مالک فرنشڈ گھر دے کر لوٹ لیا کرتا تھا، وسیم ایسا ہی گھر دلانے گا۔“
میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”تم تو ایسا ہی گھر ڈھونڈو گے جہاں سے ڈاکوؤں کی دولت ہاتھ آئے۔“

باتیں ابھی جاری تھیں کہ باہر ایک زوردار دھماکا ہوا اور پھر دروازے سے گولیوں کی بوچھاڑ نکرائی۔ سفیر زور سے چیخا۔ ”سب زمین پر لیٹ جائیں۔“

صغیر، اللہ ڈینو، جیدے نے زمین پر لیٹنے میں دیر نہیں لگائی۔ سفیر نے لیٹتے ہی دیوار کی طرف لڑھکنا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ دروازے سے آنے والی کوئی گولی مزاج نہ پوچھ لے۔

صرف ایک برسٹ چلا تھا پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دیوار سے لگ کر کھڑکی تک پہنچا۔ احتیاطاً میں نے صغیر کی اتری ہوئی شرٹ کو کھڑکی کے سامنے لہرا کر جھٹکے سے ہٹایا۔

لیکن باہر کوئی نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو فائر ضرور آتا۔ جب باہر کوئی تغیر نظر نہیں آیا تو میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک پر بہت سارے تماشین کھڑے تھے۔ سب کی نظریں اسی گھر پر لگی تھیں۔ مجھے کھڑکی پر دیکھ کر کئی افراد نے کچھ کہا تھا۔ ایک تو وہ لوگ دور تھے پھر شینے زبان میں بول رہے تھے جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں نے مڑ کر مرتجس سے کہا۔ ”یار تم اپنی زبان میں ان سے پوچھو کہ ہوا کیا ہے؟“

مرتجس کھڑکی پر آنے کے لیے اٹھا تھا کہ میں نے کہا۔ ”یہاں سے نہیں، باہر جا کر پتا کرو۔ میں بھی ساتھ چل رہا ہوں۔“

پہلے میں باہر نکلا پھر مرتجس۔ مرکزی دروازے سے باہر جو چار دیواری تھی۔ اس کے گیٹ پر تباہی کے آثار نظر آئے۔ لکڑی کا آرائشی ستون بارود سے جلا ہوا تھا۔ دیوار بھی کریم ہو گئی تھی۔ لگتا یوں تھا جیسے دیسی ساختہ کریم استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آ چکی تھی کہ حملہ آور صرف دھمکانا چاہتے تھے۔ یہ کون لوگ ہو سکتے تھے یہ بھی سمجھ سے باہر تھا۔ اس لیے کہ ابھی تک ایسا کوئی دشمن نظروں میں نہیں تھا۔ اس نئے علاقے میں کون ہماری جان کا دشمن بن چکا ہے یہ اس وقت سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ امداد شاہ کے لوگ جاگ اٹھے ہیں۔ میں سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں کھڑے تماشین ہمیں اس طرح سے گھور رہے تھے جیسے ہم عجوبہ ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے مرتجس کو آنکھ سے اشارہ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور ایک شخص سے شینے زبان میں کچھ بولا۔ جواب میں اس نے جو کچھ کہا اسے سن کر مرتجس میری طرف مڑ کر بولا۔ ”دو بایک پر چار لوگ تھے۔ وہ اس طرف سے آئے اور فائرنگ کرتے ہوئے نکل گئے۔ پیچھے والی بایک پر بیٹھے شخص نے کوئی چیز دروازے کی جانب اچھالی تھی جس کے بعد دھماکا ہوا تھا۔“

”ان سے پوچھو کہ وہ لوگ دیکھنے میں کیسے تھے۔ کیا مقامی تھے یا.....؟“ میں نے مرتجس سے کہا۔ اس نے شاید وہی کچھ پوچھا تھا پھر مڑ کر مجھ سے اردو میں بولا۔ ”وہ لوگ ایک سیکنڈ کے لیے بھی رکے نہیں تھے۔ چلتی گاڑی سے یہ کارروائی ہوئی تھی۔“

میں اب سمجھ چکا تھا کہ یہ صرف دہشت پھیلانے کے لیے کیا گیا ہے۔ میں نے مڑ کر کہا۔ ”سفیر کہاں رہ گیا؟ یہ کچھ اور کھیل لگ رہا ہے۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ کہتے ہوئے وہ مڑا اور پھر بولا۔ ”لگتا ہے سفیر اندر ہی ہے۔ میں ابھی باکرلاتا ہوں۔“

وہ مڑا تھا کہ میں نے کہا۔ ”اندر جا کر تیاری کرو۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت یہ علاقہ چھوڑنا ہوگا۔ یوں بھی دھماکے کی وجہ جاننے کے لیے پولیس والے آتے ہوں گے۔ ہمیں ان بکھیرٹوں سے بچنا ہے۔“

ہم واپس کمرے میں پہنچے تو کمر خالی پڑا تھا۔ نہ صغیر تھا نہ جیدے اور نہ اللہ ڈینو۔ سفیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ایک کے بعد ایک تمام کمرے دیکھ ڈالے لیکن کسی کا بھی پتا نہیں تھا۔ تبھی میری نظر عقب میں کھلنے والی کھڑکی پر پڑی۔ اس کھڑکی کی گرل کھلی ہوئی تھی جس سے کوئی بھی شخص اندر بہ آسانی داخل ہو جائے۔ میں نے اس کھڑکی پر پہنچ کر باہر جھانکا۔ عقب میں میدان تھا۔ کچی مٹی کچھ گیلی تھی اس لیے کسی گاڑی کے ٹائر کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ جب ہم باہر تھے تو کچھ لوگ اس راستے سے اندر داخل ہوئے اور امداد شاہ کو بشمول اللہ ڈینو،

جیدے، صغیر کو ساتھ لے گئے۔ انہوں نے بہت عام طریقہ استعمال کیا تھا۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ دھماکا ہوتے ہی لوگ دھماکے کی وجہ جاننے میں لگ جاتے ہیں۔ اسی بات کا ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور اپنے آدمیوں کو لے گئے، مگر سفیر کہاں گیا؟ کیا وہ لوگ اسے بھی قیدی بنا کر لے گئے؟ میرے ذہن میں خطرے کی کھنٹی سی بج اٹھی۔ اب وہ لوگ اس پر تشدد کریں گے۔ جتنی آسانی سے وہ لوگ سب کو لے گئے یہ حیرت کی بات نہیں تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سفیر ان کے ساتھ اتنی آسانی سے کیسے چلا گیا۔ وہ اکیلا بھی کئی ایک کو سنبھال سکتا تھا۔ پھر اتنی خاموشی کے ساتھ وہ کیسے چلا گیا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مرتجس نے سوالیہ انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ سب کہاں گئے؟“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ ہم بمشکل دس منٹ کے لیے باہر گئے اور ادھر یہ کارروائی ہو گئی۔ امداد شاہ، صغیر، اللہ ڈینو، جیدے سب غائب ہو گئے۔ سفیر بھی غائب ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ سفیر بھائی کو کوئی سراغ ملا اور ان کے پاس وقت نہیں ہوگا ہمیں بلانے کا اسی لیے وہ اکیلے ہی نکل گئے۔ ان کے تعاقب میں گئے ہوں گے۔“ مرتجس نے اپنا خیال پیش کیا۔ اس کی بات میں دم تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا۔ سفیر ان کے تعاقب میں لگ گیا ہوگا۔

”سرا ایک عجیب سی میٹھی میٹھی بو ہوا میں کہاں سے آرہی ہے؟“ مرتجس نے گہری گہری سانس لے کر کہا۔ اندر آتے ہی ذہن الجھ گیا تھا اس لیے میں نے اس بو کو محسوس نہیں کیا اب اس نے توجہ دلائی تو یاد آیا کہ یہ بو میتھول پروپیٹھیر کی ہے۔ اب ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ باہر سے گیس کا گولا پھینکا گیا۔ کمرے میں گیس پھیلی، اندر والے بے ہوش ہو گئے اور وہ لوگ انہیں اٹھا کر لے گئے۔ یہ کارروائی عام لوگوں کی ہو ہی نہیں سکتی۔ معمولی غنڈے بد معاش ایسی چیزیں استعمال کب کرتے ہیں۔ ضرور اس کے پیچھے کوئی منظم گروہ ہے۔ امداد شاہ کسی معمولی گروہ کا کارندہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ کوئی بڑا گروہ ہے۔ اس سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا پھر ان کی قید میں سفیر ہے۔ سفیر کتنا ہی جی دار کیوں نہ ہو وہ گیس کے اثر سے لڑ نہیں سکتا۔ دشمن اسے بھی اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ سفیر میرے لیے بہت اہم ہے اسے بازیاب کرنا ضروری ہے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے اس پر میں غور کرنے لگا۔

میرے پاس ہتھیار کے نام پر صرف دو پستول تھے۔ ایک امداد شاہ اور دوسرا ریاست خان سے چھینا ہوا۔ میں نے مرتجس سے پوچھا۔ ”کیا یہاں اسلحہ مل سکتا ہے؟“

”کس قسم کا اسلحہ؟“

”جدید قسم کا اس لیے کہ ہمیں مقابلہ کرنا ہے۔ ہمارے دشمن بہت طاقتور ہیں۔ جب وہ جدید طریقہ کار استعمال کر سکتے ہیں تو ان کے پاس اسلحہ بھی انتہائی جدید ہوگا۔ میرا ساتھی ان کی قید میں ہے اس لیے ہم آرام سے بیٹھ نہیں سکتے۔ دودو ہاتھ کرنا ہی ہوں گے۔“

”میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو اسلحہ کی تجارت کرتا ہے۔ اس سے بات کرتا ہوں۔“ مرتجس نے

کہا۔

”تو پھر دیر نہ کرو ابھی جا کر بات کرو بلکہ یہ کچھ پیسے لیتے جاؤ۔ اگر آٹو میٹک گنز مل جائیں تو ہاتھ کے ہاتھ

لیتے آنا۔“ کہہ کر میں نے اسے ہزار کے نوٹوں کی ایک پوری گڈی دے دی۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ شاید اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی رقم دیکھی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”پنڈی پہنچ کر ہم تمہیں بطور انعام اس سے بڑی رقم دیں گے۔“

”جی..... میں ابھی ایک گھنٹے میں آ جاؤں گا۔ آپ لوگ فکر نہ کرنا۔“ کہہ کر مرتجس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ باہر سے فائر ہوا۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ دروازہ کھولتے ہوئے وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک کر میری طرف مڑا تھا۔ شاید کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ گولی نے دروازے میں سوراخ کر دیا تھا۔ فائر ہوتے ہی وہ خوف سے زمین پر گرا تھا اور ہم نے سمجھا کہ اسے گولی لگی ہے۔ میں پھرتی سے اس کی طرف کھسکتے ہوئے پہنچا۔ اس کے جسم کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ وہ چیخا۔ شاید اس پر خوف حاوی ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”زخم تو نہیں لگا ہے نا؟“

”جی..... جی نہیں۔“ اس کی آواز میں خوف تھا۔ اب تک مجھے جتنے ساتھی ملے تھے یہ ان میں سب سے بزدل ثابت ہو رہا تھا۔ میں اسے کھینچتے ہوئے پیچھے لے کر آیا پھر اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

وہ بیٹھ تو گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر اب تک خوف کی پرچائیں لرزاں تھیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ اس لیے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ویسے اب ٹھیک ہوں۔“

”میرے یار ایسے ڈرو گے تو یہ دنیا جینے نہیں دے گی۔ جو ڈر گیا سمجھو وہ مر گیا۔ اس دنیا میں جینا ہے تو لڑنا سیکھو، بزدلی انسان کی موت ہے۔“ میں نے ناصح بن کر مشورہ دیا۔

”لگتا ہے آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر میں بہادر بن ہی جاؤں گا۔ پہلی بار مجھ پر فائر ہوا اسی لیے ڈر گیا تھا۔ اب میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا۔ ”مگر یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ کسی کو مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔“

”دشمنی تم سے نہیں ہم سے ہے۔ وہ لوگ ہمیں یہاں قید رکھنا چاہتے ہیں۔ شاید ان کا ارادہ ہو کہ پولیس کے آنے تک ہم اسی گھر میں رہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے بندے کو کھڑا کر دیا ہے۔“

”مگر کچھ ہی دیر پہلے ہم باہر نکلے تھے تب تو کسی نے روکا نہیں تھا۔“

”ہو سکتا ہے فائر کرنے والا بعد میں آیا ہو یا پھر اس نے ہمیں پہچاننے کے لیے اس وقت کچھ نہیں کہا۔“

”اب کیا ہوگا۔ اس نے ہماری شکلیں تو پہچان لی ہوں گی۔“

”یہ بعد کی باتیں ہیں فی الحال تو ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ میں نے ہنستے ہوئے عام سے لہجے میں کہا تا کہ ماحول کی کشیدگی کم ہو جائے۔

”لیکن ہم نکلیں گے کیسے اس لیے کہ دروازے کے باہر تو وہ لوگ پہرہ دے رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”کوئی اور راستہ نہیں ہے؟“

”ایک راستہ ہے۔“ مرتجس بولا۔

”کون سا؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اس سے پوچھا۔

”براہر والا گھر خالی ہے۔ درمیان میں جو دروازہ ہے اسے توڑ کر ہم اس گھر میں داخل ہوتے ہیں اور پھر اس گھر کے عقب میں جو دروازہ ہے اس سے نکل جاتے ہیں۔ وہ دروازہ اس گھر کے باغچے میں کھلے گا اور باغچے

سے ہم پہاڑی کی طرف اتر جائیں گے۔“ مرتجس نے جواب دیا۔

”کدھر ہے دروازہ۔“ کہہ کر میں نے اندر والے کمرے کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں ادھر ہی دروازہ ہے۔“ وہ بولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں بھی

اس کے پیچھے پیچھے اندر پہنچا۔ اس کمرے کو ہال کہا جاسکتا تھا۔ خوب بڑا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے کا دروازہ عقب میں کھل رہا تھا۔ دروازے میں تالا بھی نہیں تھا۔ کڑی بھی کھلی ہوئی تھی۔

”اس دروازے پر تو تالا پڑا رہتا ہے پتا نہیں کیسے کھلا رہ گیا۔“ مرتجس بولا اور دھکا دے کر اس دروازے

کو اس نے کھول دیا۔ سامنے ایک بڑا سا آنگن تھا۔ اس آنگن کے آخر میں ایک دروازہ تھا جس پر شاید تالا لگا ہوا تھا جسے کسی نے کھولا تھا۔ اس لیے کہ ایک پرانا سا تالا نیچے پڑا تھا۔ دروازے کو دھکا دیا تو سامنے بھی آنگن ہی تھا۔

پہلے میں ادھر پہنچا۔ مرتجس بھی ساتھ تھا۔ ہم نے اس آنگن کو پار کیا اور کمرے میں پہنچے۔ اس کمرے میں دو دروازے تھے۔ مرتجس نے کہا۔ ”ادھر نہیں۔ وہ باہر کا دروازہ ہے۔ اس والے دروازے سے چلیں۔ اس نے

جس دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا ہم ادھر بڑھے۔ اس دروازے کو کھولتے ہی سامنے ایک بڑا سا باغچہ نظر آیا۔

”اگر ہم اس طرف کی دیوار میں بنے دروازے سے گزرتے ہیں تو ادھر پہاڑی ہے۔ ویرانہ ہے۔ ادھر

کوئی نہیں جاتا۔ سڑک اور پہاڑی کے درمیان یہ مکان ہے اس لیے ادھر سے ہم انہیں نظر بھی نہیں آئیں گے۔“ مرتجس نے کہا۔

”اور اگر ادھر کوئی ہوا تو؟“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”امید تو نہیں ہے۔ ان کی نظروں میں صرف وہ گھر ہوگا۔ اگر کوئی ہوا بھی تو اس گھر کے عقب میں ہوگا

جب کہ یہ والا دروازہ الگ سمت میں کھلتا ہے۔“

”دیر کرنا مناسب نہیں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ کہہ کر میں نے اس دروازے کو کھول لیا۔ دروازہ کھلتے

ہی ویران پہاڑی نظر آئی۔ میں نے پستول نکال لیا تھا اور جھک کر دروازہ پار کیا۔ اگر کوئی دور سے نشانہ لیے بیٹھا ہو تو فائر کر گرنہ ہو۔ اسی لیے میں جھک کر چل رہا تھا۔ مرتجس نے بھی میری تقلید کی تھی۔

ہم جھکے جھکے آگے بڑھتے چلے گئے۔ کافی آگے جانے کے بعد پہاڑی کی چڑھائی آگئی تو میں نے کہا۔

”پہاڑی پر چڑھنا مناسب نہیں ہے۔ دور سے ہمیں دیکھا جاسکتا ہے۔“

”پہاڑی پر چڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس جانب بڑھتے چلے جائیں۔ کچھ آگے جانے کے بعد ایک

سڑک ہے۔ اس پر گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کسی سے لفٹ لے کر ہم واپس شہر میں آسکتے ہیں۔ ویسے بھی ادھر سے شہر زیادہ دور نہیں ہے پیدل بھی آیا جاسکتا ہے۔“ مرتجس نے اطلاع دی۔

”تو پھر وقت برباد نہ کرو اور پیدل ہی چل دو، اگر لفٹ مل گئی تو واہ واہ ورنہ پیدل پہنچ ہی جائیں گے۔“

میں نے کہا۔

”میرے خیال میں ہمیں زیادہ دیر کھڑے رہنا نہیں پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی گاڑی آ ہی جائے گی۔“ مرتجس

نے ڈھارس بندھائی۔ اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک واکس وگین آتی نظر آئی۔ کبھی ایسی چھوٹی بسیں کراچی میں بھی چلا کرتی تھیں۔ جس میں بندہ ٹھونسا جاتا تھا۔ اندر جانے والے کی یا تو کب نکل آتی تھی یا کب

درست ہو جاتی تھی۔ انسان کو مرغاب بنانے کا اچھا طریقہ تھا۔ اگر ایسی سواری کہیں اور ملتی تو میں اسے نظر انداز کر دیتا لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا اس لیے میں نے بھی اسے رکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ جیسے ہی وہ ”مرغا“ گاڑی رکی میں نے اندر کی جانب قدم بڑھادئے۔ کوئی بھی سیٹ خالی نہیں تھی۔ کئی لوگ رکوع کی حالت میں پہلے سے موجود تھے۔ ان کی صف میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ گاڑی اشارٹ ہوئی اور آگے کی سمت بڑھنے لگی۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ اسی سڑک پر مڑ گئی جو اس طرف سے آرہی تھی جس طرف وہ مکان ہے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ اگر دائیں جانب نہ مڑ کر بائیں جانب مڑ جاتے تو واپس اسی گھر کے دروازے پر پہنچ جاتے۔

کچھ دور آگے جاتے ہی شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں تھیں۔ ابھی ہم شہر میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ ایک کے پیچھے ایک دو پولیس وین سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس کی نینڈ ٹوٹ گئی ہے۔ اسے علم ہو گیا ہے کہ کسی گھر پر حملہ ہوا ہے اور وہ اب انہیں بچانے یا ملزم کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں۔ وین کو مرتجس نے بھی دیکھ لیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔ شاید وہ دل ہی دل میں پولیس کی پھرتی پر داد بھی دے رہا ہو۔ وین ہمارے برابر سے گزرتی ہوئی دور نکل گئی اور ہم شہر میں داخل ہو گئے۔

شہر کے بس اسٹاپ پر وہ وین نما وینگن رکی تو ہم باہر آ کر کمر سیدھی کرنے لگے پھر میں نے مرتجس سے پوچھا۔ ”ایسا کوئی ٹھکانا ہے جہاں ہم رک سکیں۔ اس لیے کہ جب تک میں اپنے ساتھی کو ان کے چنگل سے چھڑاؤں گا نہیں اس علاقے سے جا نہیں سکتا۔“

”میرا ایک دوست ہے۔ وہ ان دنوں ہنزہ گیا ہوا ہے، اپنی بیوی بچوں کو لانے۔ اتفاق کی بات ہے کہ۔“

جاتے وقت وہ اپنے گھر کی چابی مجھے دے گیا تھا۔ اس لیے کہ اس کا ایک بھائی پنڈی میں رہتا ہے وہ آ۔ اس کا چہرہ کھل تھا۔ ”مرتجس نے خوشخبری سنائی۔“

جلدی بول۔ محل

”وہ چابی تمہارے پاس ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ اس وقت بھی میری جیب میں ہے۔“

”چلو ہم اسی طرف چلتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے ساتھ لے کر اسٹاپ کے سامنے

طرف چل پڑا۔

وہ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے ہر کونے سے غربت جھانک رہی تھی۔ میلے کپڑے

ہوئے میں نے پوچھا۔ ”مرتجس، وہ گھر تم نے اپنے نام سے لیا تھا۔ بعد میں پولیس پریشان تو نہیں آواز میں کہا۔“ بس اسٹاپ ”ان دنوں مکان مالک بھی یہاں نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے گھر کیستان گیا ہوا ہے

آتے بھی ایک ماہ لگیں گے۔ اتنے دنوں میں کیس دب چکا ہوگا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ اتنے دنوں بعد سائیکل چلائی لوگوں کو میں نے سیاح سمجھ کر گھر دلایا تھا۔ انہوں نے مجھے معقول کمیشن دیا تھا۔ یہ بات

آتے رہتے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تم کیا کرنے آئے ہو۔ میں بھی یہی بیان سفیر اسٹاپ پر منتظر ہے۔“ پولیس والے کچھ لے دے کر چھوڑ دیں گے۔“

”تم فکر نہ کرنا میں تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ تمہیں نوکری کی بھی فکر نہیں ہوگی۔ آ۔“ بھی لگا لوں۔ کئی دن سے اسے دیکھا بڑا سا گھر بنا کر رہنا اگر کھیتی کرنے سے دلچسپی ہے تو مزید زمین خرید لینا یا کوئی چھ

دینا۔“ میں نے اس کی پیٹھ پر تھکی دے کر کہا۔

”جی ہاں صاحب جی مجھے بہت ارمان ہے کہ محسنہ کو اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھوں۔ اسے ہر آرام دوں۔ اس کے لیے بڑا سا گھر بناؤں اور ہم دونوں ہر فکر سے آزاد ہو کر زندگی گزارتے رہیں۔“ مرتجس آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

”بے فکر رہو تمہارے سارے خواب پورے ہوں گے۔“ میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے ڈھارس دی۔ ”نہ صرف میں تمیں ایک بڑی رقم دوں گا بلکہ حکومت سے بھی انعام دلاؤں گا۔“

”تب تو میرا نام بہت ہو جائے گا۔ لوگ مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے کہ مجھے حکومت نے انعام کا حقدار قرار دیا۔ ویسے سر آپ کا تعلق کس شعبہ سے ہے؟ کیا آپ انٹیلی جنس والے ہیں۔“

”اتنی جلدی نہیں..... آہستہ آہستہ معلوم ہو ہی جائے گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بعض باتیں راز میں رہیں تو اچھا ہے۔“

پتا نہیں اس نے میری بات کا کیا مطلب لیا کہ وہ بالکل مطمئن نظر آنے لگا۔ شاید وہ اپنے مفروضے پر یقین کر چکا تھا کہ میرا تعلق محکمہ خفیہ سے ہے۔ وہ کمرے کی صفائی میں لگ گیا تھا۔ اس نے بستر کی چادر کو درست کیا اور پھر بولا۔ ”ایسا کرتا ہوں۔ بازار سے ایک دو چادریں لے آتا ہوں۔“

”اور اگر بازار میں تمہارا کوئی جاننے والا مل گیا تو؟“

”جاننے والا تو پورے شہر میں ہے۔ یہ شہر ہے ہی کتنا بڑا۔ پھر میں بس اسٹنڈ پر رہتا ہوں اس لیے تقریباً ہی جانتے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

جب کہ یہ ”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اگر کوئی دشمن ٹکرا گیا تو؟ فی الحال ان باتوں کو رہنے دو۔ صرف یہ سوچو کہ ”دب سے نمٹا کیسے جائے۔“ پھر میں نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور وسیم کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری بیل پر ہی دیران پہاڑی ہل رسیو کر لی۔ رابطہ ہوتے ہی میں نے پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں ہو؟“

ہو تو فارکار گرنے اس وقت تو گھر سے باہر سڑک پر کھڑے ہیں۔ اندر کیا ہو رہا ہے۔ پولیس نے پورے علاقے کو ہم بھٹکے لے رکھا ہے۔“

”پہاڑی پر چڑھنا اب وہاں نہیں ہیں۔ شہر واپس آ جاؤ۔ بس اسٹاپ پر تمہیں مرتجس مل جائے گا۔ وہ نئے گھر تک ”پہاڑی پر ہگا۔“

سڑک ہے۔ اس پر گاڑی ہے ہیں۔“ کہہ کر اس نے کال آف کر دی۔ میں نے موبائل کو جیب میں رکھا ہی تھا کہ مرتجس سے شہر زیادہ دور نہیں ہے۔

”تو پھر وقت برباد ہے کہ ہمیں سراغ لگانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ انہوں نے سفیر بھائی کو رکھا کہاں ہے۔“ میں نے کہا۔

”خود کو محفوظ رکھنے کی جتن میں لگے ہوئے تھے اب اسی سمت کام کرنا ہے۔“ میں نے جواب ”میرے خیال میں اسٹینڈ چلے جاؤ وسیم آ رہا ہے۔“

نے ڈھارس بندھائی۔ اس کی کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ میں اب حالات کا ذہن میں تجزیہ کرنے لگا۔ ابھی زیادہ وقت کراچی میں بھی چلا کرتی تھیں لہذا اور وسیم و عبد اللہ، مرتجس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

”ہوا کیا؟“ وسیم نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے تمام باتیں بتائی تو وہ بولا۔ ”سفیر کا یوں گم ہو جانا عجیب ہے۔ میرا خیال ہے وہ تعاقب میں ہوگا۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ عبداللہ بولا۔

”اس کے موبائل پر کال کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے دشمنوں کی نظر موبائل پر نہ پڑی ہو۔“ وسیم نے خیال پیش کیا۔

میں خود بھی یہی کرنے والا تھا لیکن وسیم نے جب کہہ دیا تو اس کی تعریف کرنا پڑی کہ تم نے صحیح کہا۔ وسیم نے فوراً اپنے موبائل سے نمبر پیش کیا اور موبائل کو کان سے لگا لیا۔ میری نظریں اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ چہرہ اندرونی جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ تیل جا رہی ہے۔ پھر اس کا چہرہ الجھن کی آماجگاہ بن گیا۔ شاید کال رسیو نہیں ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ نمبر پیش کیا۔ اور ادھر کی آواز سنتا رہا لیکن ایسے آثار نظر نہیں آئے کہ ادھر سے کال رسیو کی گئی ہو۔ میں نے منع کیا۔ ”بار بار کال نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کال رسیو کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو اور رنگ ٹون سن کر کوئی دوسرا موبائل پر قابض نہ ہو جائے۔“

”سفیر رنگ ٹون بند رکھتا ہے لیکن ویریٹ سسٹم آن رہتا ہے۔“ وسیم نے فکر مندی بھرے لہجے میں

جواب دیا۔

”اسے پتا لگ چکا ہوگا کہ کال کی جا رہی ہے۔ موقع ملتے ہی وہ خود فون کر لے گا۔ ضرور کرے گا۔“ میں

نے حوصلہ دیا۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ وسیم کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ دوسری طرف سفیر ہے۔ وسیم نے کال رسیو کرتے ہی کہا۔ ”کہاں ہے ٹو، جلدی بول۔ محل وقوع بتا۔ ہم ابھی پہنچ جاتے ہیں۔“

وسیم نے مائیک آن کر دیا تھا۔ ادھر کی آواز مجھے بھی سنائی دی۔ سفیر نے کہا تھا۔ ”میں تم لوگوں کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ سائیکل چلا کر میری ٹانگیں ناکارہ ہو گئی ہیں۔“

”یہ سائیکل کا ذکر کہاں سے آگیا؟“ وسیم نے پوچھا۔

”ایک لمبی کہانی ہے۔ جلدی سے بتاؤ کہاں پر ہو؟“

”ایسا کرو بس اسٹاپ پر آ جاؤ۔ ہم اب شہر منتقل ہو گئے ہیں۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ”بس اسٹاپ پر میں مرتجس کو بھیج رہا ہوں۔“

”او کے میں شہر کی طرف آ رہا ہوں۔ سارے مسلز پھول گئے ہوں گے۔ اپنے دنوں بعد سائیکل چلائی ہے اور وہ بھی مسلسل کئی گھنٹے تک۔“ کہہ کر اس نے کال منقطع کر دیا۔

میں نے مرتجس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بھی سن لیا ہوگا کہ سفیر اسٹاپ پر منتظر ہے۔“

”جی میں جا رہا ہوں۔ اُپ کہیں تو میں ایک چکر محسنہ کے گھر کا بھی لگا لوں۔ کئی دن سے اسے دیکھا

بھی نہیں ہے؟“ مرتجس کا لہجہ التجا یہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اجازت نہیں بھیک مانگ رہا ہو لیکن میں نے اسے

”یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ ہمیں بالکل خبر نہیں کہ دشمن کہاں سے وار کرے گا اس لیے ہمہ وقت ہوشیار رہنا ہوگا۔ زندگی رہی تو محسنہ سے زندگی گزار کر لینا لیکن اس وقت نہیں۔“

میری بات نے اس پر مایوسیوں کے بادل برسا دیئے۔ وہ بالکل مجھ سا گیا اور منہ لٹکائے چلا گیا۔ اس کے جانے کا منظر کچھ ایسا تھا کہ وسیم اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ اس نے کہا۔ ”یہ تو مجنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دینے والا بندہ ہے۔ ایسے باہر جا رہا تھا جیسے کمار نے مغل اعظم میں سیڑھیاں اترتے ہوئے تان لگائی تھی۔“ جس کے دل میں پیار نہ ہو وہ پتھر ہے، انسان کہاں۔“

”بڑی ہری ہری سوچ رہی ہے۔ سفیر کی خیریت کی خبر ملی تو گانا سو جھنے لگا۔ بھائی میاں، دشمن تاک میں ہے۔ کچھ اس کا بھی سوچ لو۔“

”اس کام کے لیے آپ ہیں نا۔“ اس نے پٹ سے جواب دیا اور ہنسنے لگا۔

ہم سب کا مزاج بھی عجب ہے۔ پل بھر کی خوشی کو بھی بھرپور انداز میں انجوائے کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہماری زندگی میں اب تک ٹھہراؤ نہیں آیا ہے۔ موت اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ چل رہی ہے۔ کبھی موت کا پلہ جھکتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی زندگی کا، اور کبھی زندگی بے معنی سی نظر آنے لگتی ہے اسی لیے ہم سب چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ بھرپور لطف اٹھاتے ہیں۔

وسیم کی بکو اس جاری تھی کہ دروازہ کھلا۔ ایسا لگا تھا جیسے اس کو کھولنے کے لیے کسی نے لات ماری ہو۔ اس دڑام کی آواز پر ہم دونوں چونک گئے تھے۔ وسیم نے پستول بھی نکال لیا تھا، بس فائر کرنے کی دیر تھی کہ سفیر کا قہقہہ گونجا۔ وہ ایک اسپورٹ سائیکل سمیت اندر گھس آیا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی کہا۔ ”یارانِ با وفا، عرض ہے کہ میں پورے ڈھائی تین گھنٹے سے اس سائیکل پر ہوں اس لیے لگتا ہے یہ سائیکل میری ٹانگوں سے چپک گئی ہے اور جدا ہونے پر بالکل تیار نہیں اس لیے اس کے ساتھ اندر تشریف لے آیا اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو مجھے اس سائیکل پر سے اتار بھی دیں۔“

”آمیرے لعل میں تجھے گود میں اٹھا کر چاند دکھلاؤں۔“ کہتے ہوئے وسیم ہاتھ پھیلائے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور سچ مچ اس نے سفیر کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ خود ہی اچھل کر سائیکل سے نیچے اتر آیا۔ دروازے پر کھڑا مرتجس اپنی ہنسی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا لیکن اس کی ہنسی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ خوب بڑا سا۔

”اس میں کیا لے آئے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”سفیر بھائی پہنچے نہیں تھے۔ بس اسٹاپ پر میرے جاننے والے کی ایک دکان ہے اس کے ہاں سے دو چادریں لے لیں تاکہ اس گندے شندے ماحول کا کچھ اثر کم ہو سکے۔ واپسی کے وقت مجھے خیال آ گیا کہ کچھ دیر میں بھوک بھی لگ سکتی ہے سو کچھ روٹیاں اور مٹن کڑہائی بھی لے لی۔“ مرتجس بولا۔

”کچھ بھی کہو یہ بندہ ہے بڑے کام کا۔ واقعی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ گدھے کی طرح محنت کی ہے میں نے۔“ سفیر نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے شاپر لیا اور اس میں سے کھانے کے لوازمات والا شاپر الگ کر لیا اور

شاہر واپس کر دیا۔ مرتجس نے ہنستے ہوئے شاہر واپس لیا اور اس میں سے چادر نکال کر بیڈ پر بچھانے لگا۔ اتنی دیر میں وسیم نے پتا نہیں کہاں سے دو پلیٹ ڈھونڈ لی اور اسے دھو کر لے آیا۔ اس میں سالن رکھتے ہوئے بولا۔

”کھانے کے درمیان اپنی روداد سنا رہنا تاکہ کھانے کا مزہ دو بالا ہو سکے۔“

”واہ اچھا طریقہ سوچا ہے..... نہیں نہیں میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنی روداد سنا رہوں اور تم بوٹیاں کم کرتے جاؤ۔ پہلے میں ڈٹ کر کھاؤں گا پھر چائے پیوں گا اور پھر سناؤں گا کہ امداد شاہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔“ سفیر نے ناراض بچے کے سے انداز میں کہا اور روٹی کا نوالہ توڑنے لگا۔

”اور میں صبر کا دامن چھوڑ کر تمہارا سر توڑنے پر غور کرنے لگا ہوں۔ جلدی بناؤ امداد شاہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔“ وسیم نے مصنوعی غصے سے کہا اور روٹی والی پلیٹ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لی۔

”پہلے چائے کی تیاری پکڑو۔ مرتجس نے شاہر میں چائے لی ہے۔ اسی شاہر میں پڑی ہوگی۔ جب پلیٹ ڈھونڈ نکالی ہے تو کپ بھی ڈھونڈ لو اتنی دیر میں، میں پیٹ بھر لیتا ہوں۔“ سفیر اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے پلیٹ واپس چھین لی تھی اور نوالے توڑ کر سالن میں لگا رہا تھا کہ مرتجس بولا۔

”آپ کھانا تو ختم کریں میں نے چائے کے لیے پیالیاں دھولی ہیں۔“

عبداللہ کسی فلسفی کی طرح سوچ میں گم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دل ہی دل میں کوئی پلان بنا رہا ہے۔ اس لیے کہ اس نے ابھی تک کسی بات میں دخل نہیں دیا تھا اور نہ کوئی سوال کیا تھا۔ جب کسی کی آواز کچھ اونچی ہوتی تو وہ چونک کر اسے دیکھتا اور پھر خیالوں میں کھو جاتا۔

”تو پھر دیر کس بات کی میں تو چائے سے ہی کھانے پر تہہ لگاؤں گا۔“ کہہ کر سفیر نے پانی کا گلاس اٹھا لیا جو میں نے اس کے سامنے لا کر رکھا تھا۔

”ہاں اب بولو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے سفیر کو مخاطب کیا۔ اس نے گلاس رکھ کر پیٹ پر ہاتھ پھیرا پھر وسیم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اگر میں نے سعدیہ کو تیرا یہ ظلم نہ بتایا کہ تو مجھے کھانے بھی نہیں دیتا ہے تو کہنا۔ پھر وہ جو کرے گی سو کرے گی، مجھے مت کہنا کہ ایسا کیوں کیا۔“

”ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ تم وہاں سے فرار کیوں ہوئے تھے؟“ میں نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔

”ہوا یہ۔“ سفیر نے چائے کا سپ لے کر کہا۔ ”جیسے ہی دھماکا ہوا اور سب اُدھر دوڑے اسی وقت مجھے عقب سے کسی گاڑی کے بریک کی آواز سنائی دی جو بالکل قریب کی لگی۔ میں اُدھر متوجہ ہو گیا۔ کیونکہ اُدھر کوئی سڑک نہیں ہے پھر گاڑی کیا کرنے آئی ہے۔ میں حفظِ ما تقدم کے تحت اُدھر گیا تھا۔ اسی وقت مجھے کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ یہ کون لوگ ہیں۔ میں انہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن کھڑکی کھولتا تو وہ ہوشیار ہو جاتے اس لیے میں نے برابر والے دروازے کو کھولا اور اس گھر کے آنگن میں پہنچ گیا۔ عقب میں جو دروازہ تھا۔ اس کو کھولا اور اُدھر سے جھانکا تو دیکھا کہ ایک بندے نے کوئی چیز انر پھیکی پھر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے سمجھا تھا کہ گرینڈ وغیرہ نائپ کا کوئی گولا ہے۔ میں بھی چونک گیا مگر آواز نہ آئی تو پھر جھانکا تو نظر آیا کہ وہ لوگ کھڑکی کے پاس کھڑے گیس سلنڈر سے گریل کاٹ رہے تھے۔ میں وہیں دبک کر دیکھنے لگا۔ پھر جب وہ لوگ اندر سے ایک

کے بعد ایک بندے کو لا کر گاڑی میں بھرنے لگے تو میں سمجھ گیا کہ آپ سب باہر نکل چکے ہو۔ گھر خالی ہے ورنہ اتنی آسانی سے یہ لوگ امداد شاہ کو باہر نہیں لا سکتے تھے۔ ان کے بندوں کے ہاتھ میں جدید اسلحے تھے اور ہم خالی ہاتھ۔ ان سے پتھروں سے تو لڑ نہیں سکتا تھا۔“ ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وسیم بولا:

”اور تم نے ان کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا۔“

”وہ بھی سائیکل پر۔“ عبداللہ نے لقمہ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے سوچ کا عکس ہٹ چکا تھا۔

”تو کیا میں تعاقب کرنے کے لیے تمہاری اجازت کا منتظر رہتا۔ کہ تم آؤ اور مجھ سے کہو، ذرا جا کر دیکھو تو یہ لوگ کیا کرنے والے ہیں کہاں رہتے ہیں۔“ سفیر نے چڑ کر کہا۔

”یار وسیم بات پوری ہونے دو۔“ میں نے وسیم کو خاموش کر دیا ورنہ نوک جھوک چلتی رہتی اور وقت برباد

ہوتا رہتا۔

”تو میں بتا رہا تھا کہ وہ لوگ ایک کے بعد ایک بندے کو اس طرح اٹھا کر لا رہے تھے جیسے وہ سب بے ہوش ہوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ جو لوگ گرل کاٹنے کے لیے گیس سیلنڈر کے ساتھ آئے ہیں وہ کیا کلوروفارم کے بغیر آئے ہوں گے۔ اسی قبیل کی کوئی گیس کا استعمال کیا ہوگا۔ اب میں کیا کروں، یہی سوچ رہا تھا کہ میری نظر آنگن میں کھڑی سائیکل پر پڑی اور میں نے اس اسپورٹ سائیکل کو اٹھا لیا۔ جیسے ہی گاڑی سڑک پر چڑھی میں سائیکل پر تعاقب میں لگ گیا۔ حالاں کہ درمیان میں فاصلہ بہت رہا لیکن سڑک بھی ویران اور علاقہ بھی میدانی یعنی دور سے نظر آنے والا۔ گاڑی جہاں رکی اس مقام سے میں تب بھی ایک کیلومیٹر سے زیادہ دور تھا لیکن وہ گھر نظروں میں آ گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس گھر تک پہنچا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر واپس آ گیا۔“

”تم پہلے وہاں گئے تھے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا:

”جی ہاں۔ اس مکان کے نزدیک پہنچا تو وہاں کا منظر ہی ایسا تھا کہ میں سڑک پر ہی رک گیا۔ دو پولیس موبائل کھڑی تھیں اور بہت سارے تماشین اندر سے کیسا سانپ نکلے گا یہ دیکھنے کو منتظر تھے۔ اس بھیڑ میں میں بھی شامل ہو گیا تھا کہ موبائل بج اٹھا۔ اور میں نے دوبارہ سے پیڈل مارنا شروع کر دیا۔“ سفیر نے بات ختم کی اور بستر پر پسر گیا۔

اسے لیتے دیکھ وسیم نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟ اس مکان کا جائزہ نہ لے لیا جائے؟“

”تمہارے خیال میں کیا میں نے جائزہ نہیں لیا ہوگا؟ عقل کے معاملے میں تم سے کچھ.....“ سفیر نے انگلیوں سے پیانا بنا کر کہا۔ ”زیادہ ہی ہوں گا۔ میں نے اس مکان کا آگے پیچھے ہر زاویہ سے جائزہ لے لیا ہے۔ عام سا مکان ہے۔ تقریباً آٹھ بندے ہیں۔ سب کے سب مسلح ہیں۔ ان کے پاس جدید اسلحہ ہے۔ اور کچھ پوچھنا ہے؟“

”امداد شاہ کو وہاں رکھا ہے یا وہاں سے کہیں اور لے گئے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے خیال سے وہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جب تک میں تھا تو وہاں سے کوئی گاڑی نکلی نہیں۔“

”وہ زخمی تھا۔ میں نے اس کی ران کو موم بتی سے داغا ہے۔“

”یہ کوئی اتنا بڑا زخم نہیں کہ آپریشن تھیر کی ضرورت پڑے۔ مرہم وغیرہ لگا دیا ہوگا۔“

”رات ہونے دو۔ وہاں کا ایک چکر لگاؤں گا۔“ میں نے کہا اور چائے کی پیالی میں پچی ہوئی چائے کا کھونٹ لیا۔ اتنی دیر سے مرتجس چپ تھا۔ سفیر کے چپ ہوتے ہی وہ بولا۔ ”سر میں ایک چکر لگاؤں محسنہ کے گھر تک؟“

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وسیم نے کہا۔ ”او مجنوں کے نانا کچھ تو صبر کر لو۔ تمہاری محبوبہ کہیں جا نہیں رہی۔ ابھی ہر طرف دشمن ہیں۔ اگر ان کے ہتھے چڑھ گئے تو جان سے بھی جاؤ گے۔ ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ تھوڑا سا صبر کر لو۔ پھر دیکھنا ہم خود تمہیں سہرا پہنا کر محسنہ کے پاس چھوڑ آئیں گے۔“

”جی بہتر۔“ مرتجس مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ اور پھر پلیٹیں اٹھا کر دھونے کے لیے چلا گیا۔

اس کا چہرہ دیکھ کر سفیر مسکرا کر رہ گیا لیکن وسیم نے قہقہہ لگا دیا۔ عبداللہ بھی مسکرانے لگا تھا۔ یہ پیار بھی کیا چیز ہے۔ اگر ہو جائے تو انسان کو سودائی بنا دیتا ہے۔ لوگ اس کا مذاق بنا دیتے ہیں وہ خود ایک تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے انہیں آنکھیں دکھائی کہ اس طرح اس کا مذاق نہ اڑا۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ اگر میں مداخلت نہ کرتا تو یقیناً ان میں سے کوئی ایک مزید جملے کتا۔ اور وہ بے چارہ کوئی جواب نہ دے کر تملتا کر رہ جاتا۔

میں نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوں تو ذہن کھل جاتا ہے۔ خیالات کی یلغار ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ گزرے ہوئے لمحے آنکھوں کے پردے پر رقص کرنے لگے تھے۔ زندگی کتنی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ ہر پل ایک نیا باب کھل جاتا تھا۔ کبھی ایسی سُست رفتار تھی کہ وقت گزرتے نہیں گزرتا تھا اور اب کہاں اتنی تیز ہو گئی ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ ہفتہ مہینے میں کیسے بدلا۔ اگر اسی طرح زندگی بھاگتی رہی تو شاید ہی کبھی سکون کا کوئی لمحہ میسر آئے۔ تبھی میرے ذہن میں بیٹو کا چہرہ آ گیا۔ مہذب معاشرے نے اسے کیا دیا؟ موت۔ کیسا معصوم بندہ تھا اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کی موت کا جتنا دکھ مجھے تھا اتنا دکھ کسی اور کی موت کا نہیں ہوا۔ بیٹو کے ساتھ مانی کی یاد آ گئی۔ کمپیوٹر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ لیکن کیسا معصوم۔ مانی کی یاد آئی تو میں نے سفیر سے پوچھا۔

”مانی سے رابطہ ہو تو اس سے میری بات کرانا۔“

”مانی سے عبداللہ کو کام رہتا ہے۔ دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کا فن سیکھنے کی کوشش میں یہ اس بچے کو دوست بنائے ہوئے ہے۔“ وسیم نے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے چوٹ کی۔

عبداللہ تملتا گیا۔ اتنی دیر سے وہ خاموش تھا لیکن بالآخر اس کی خاموشی ٹوٹ ہی گئی۔ اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ”آئی ٹی کا علم ایک سمندر ہے۔ اگر میں یہ علم حاصل کر رہا ہوں تو آپ کو کیا تکلیف ہے۔“

”تکلیف یہ ہے کہ اس کام کے لیے دماغ چاہیے جو آپ کا حاضر نہیں ہوتا۔“

”جس دماغ میں گوبر ہو وہی اتراتا ہے۔“

”ذرا شادی تو ہو لے پھر پوچھوں گا بچو!“

”ٹھیک ہے حویلی پہنچتے ہی میں سادی باجی سے یہی کہوں گا کہ یہ صاحب کہتے ہیں بیویاں دماغ کھا جاتی

ہیں۔“ عبداللہ کہاں چوکنے والا تھا۔

”یار بورمت کرو سونے دو۔“ سفیر نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”خواب میں کھونے دو۔“

”اوائے ہوئے۔“ وسیم نے پھر چوٹ کی۔

کہیں یہ جملوں کی جنگ تیز نہ ہو جائے اس لیے میں نے مداخلت کا ارادہ کیا اور باری باری ان تینوں کو دیکھا۔ سفیر تو آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ایسے جیسے لائق ہو مگر مجھے پتا تھا کہ وہ اسی حالت میں ان کے جملوں کا جواب دیتا رہے گا۔ وسیم فرش پر بیٹھا تھا لیکن اس کی قوتِ سماعت دوستوں پر مرکوز ہوگی۔ عبداللہ بھی لائق سا ایک جانب بیٹھا تھا لیکن وہ بھی جوابی حملہ کرنے پر پرتول رہا ہوگا۔ ان سب کی نوک جھوک سے ہی زندگی میں رونق ہے۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن ان کی شگفتہ مزاجی نہیں جاتی۔

ان پر نظر ڈالنے کے بعد میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”ہم کچھ ہی دیر میں جب اندھیرا پھیل جائے گا۔ اس مکان کی طرف جائیں گے۔ تم بھی تیار رہنا۔“

”ہاں ہاں اچھا سا سوٹ نکال لینا۔ پرفیوم بھی لگا لینا۔“ وسیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”مجھ سے زیادہ پرفیوم کی ضرورت تمہیں ہے۔ میرے لیے تو پستول ہی کافی ہے۔“ عبداللہ نے جوابی چوٹ کی۔

”اور پستول اس وقت نایاب ہے۔“ وسیم نے کسی مولوی کے دعا کرانے کے انداز میں کہا۔

اس کی بات سن کر مجھے یاد آیا کہ مرتجس کو ہتھیار کی فرہمی کے لیے جانا تھا۔ میں نے مرتجس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اوبھائی تم نے کہا تھا کہ کوئی تمہارا جاننے والا ہے جو ہتھیار فراہم کرتا ہے۔“

”جی ہاں۔ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔“ کہہ کر وہ میرے قریب آ کر موبائل پر کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پہلی ہی بار کی بیل پر فون رسیو ہو گیا۔ ادھر سے کچھ کہا گیا تھا کہ مرتجس نے جواب دیا۔ ”مرتجس بول رہا ہوں..... جی جی ڈرائیور..... ایک کام ہے..... جی..... میرے ایک دوست کو ایک دو اچھا والا بادام چاہیے..... جی جی..... پیسا نقد اور ابھی ملے گا..... جی میں آ رہا ہوں۔“ کہہ کر اس نے موبائل آف کیا پھر بولا۔

”ابھی چلنا ہوگا۔“

”پیسے تمہارے پاس ہیں۔ اسلحے کی پہچان وسیم کو ہے۔ اسے ساتھ لے جاؤ۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”آئیے وسیم بھائی۔“ مرتجس نے باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ اب کمرے میں سفیر اور عبداللہ تھے جو اس وقت خاموش تھے۔ دونوں میری طرف متوجہ تھے۔ ان کی نظروں میں سوال تھے۔ شاید وہ منتظر تھے کہ میں ان سے ڈسکس کروں کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا۔ کیسے اس مکان میں داخل ہوا جائے گا۔ کیسے ہم امداد شاہ کو ان کے چنگل سے چھینیں گے۔ اس لیے کہ امداد شاہ وہ مہرہ ہے جس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اسے کیسے حاصل کیا جائے۔ کس قسم کی پیش بندی کی جائے۔ اس پر غور کرنا۔ مشاورت کرنا بہت ضروری تھا۔ بالآخر میں نے سفیر کی طرف دیکھ کر پوچھ لیا۔ ”وہ گھ کتنے رقبے پر ہے؟“

”گھر کی حالت بتا رہی ہے کہ مالک خاصہ امیر آدمی ہے۔ یوں سمجھ لیں ایک حویلی سی حویلی ہے۔ دو منزرا

ہے اور آگے اور پیچھے باغیچہ ہے۔ جس میں پھلدار پیڑ لگائے گئے ہیں۔ احاطہ کی دیوار تقریباً پانچ فٹ اونچی ہو گی۔ دیوار پر شیشے کے ٹکڑے یا آہنی کیلیں نہیں لگی ہیں جس کی وجہ سے بہ آسانی اس پر چڑھا جاسکتا ہے۔“ سفیر نے بتایا۔

”کیا مسلح گارڈ بھی وہاں نظر آئے یا وہی لوگ مسلح تھے جو اس گاڑی میں تھے؟“

”اندر ہوں تو بات دیگر ہے۔ باہر سے نظر نہیں آئے۔“

ابھی ہم باتوں میں مشغول ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور مرتجس کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے پیچھے دسیم تھا۔ ان دونوں کے ہاتھ میں بیک تھے۔ مرتجس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوش ہے۔ اسے اتنا خوش دیکھ کر عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو..... کیا محسنہ سے ملاقات ہو گئی؟“

”واقعی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری اتنی عزت ہوگی۔ بابر خان کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ جب میں پہنچا اور دسیم صاحب سے اس نے دو بات کی تو وہ ایسا ہو گیا جیسے وہ مجھے سر پر بٹھالے گا۔ بار بار کہتا تھا کہ مرتجس تیرا شکریہ میں کیسے ادا کروں۔ تُو نے مجھے اتنے بڑے آدمی سے ملاقات کرا دی۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ ”دسیم بھائی نے کم سے کم پانچ لاکھ روپے کی خریداری کی ہے۔ ایسے ایسے ہتھیار خریدے ہیں کہ میں نے کبھی دیکھے بھی نہیں تھے۔ اگر میں اکیلا جاتا تو دو کلاشنکوف ہی خرید سکتا تھا۔ دسیم صاحب کے پاس تو بہت روپیہ ہے۔ انہوں نے اسی وقت کھڑے کھڑے قیمت ادا کی ہے۔ وہ زندگی بھر نہیں بھولے گا کہ میں اس کے لیے اتنا بڑا خریدار لے کر گیا تھا۔“

”ہاں بھئی دسیم۔“ میں نے مسکراتے ہوئے دسیم سے کہا۔ ”اتنے روپے کہاں چھپا رکھے تھے۔“

”بابر خان کے ساتھ شہر کے چار بینکوں کے اے ٹی ایم خالی کیے تب جا کر اس کی سمیٹ ہوئی۔“

”ہاں ہاں یہ کچھ دیر کے لیے بابر خان کے ساتھ باہر گئے تھے۔ میں نے سمجھا تھا کہ چائے شائے پینے گئے ہیں۔“

”اچھا اچھا اب دکھاؤ کیا کیا لائے ہو۔“ میں نے دسیم سے کہا۔

دسیم کے جھکنے سے پہلے ہی مرتجس نے جھک کر بیک کھولا۔ اس میں سے ایک ایک کر کے چار آٹو بینک پمپل نکالا۔ اس کی گولیوں کے ڈبے دکھائے پھر ہاتھ ڈال کر بیس کے قریب گرینینڈ نکالے۔ ایک اسنا پیر راکفل دکھائی۔ دور بین اور پمپل سائلنسر دکھایا۔ ہلکی مشین گن دکھائی۔ تبھی دسیم بولا۔ ”اتنا ہی مال دوسرے بیک میں بھی ہے۔ ضرورت کی ہر شے لے لی ہے۔“

”اتنے چھوٹے سے شہر میں اتنا اسلحہ..... کون خریدتا ہے؟ ایسے اسلحے تو معمولی لوگ لیتے نہیں ہیں؟“

”بابر خان افغانستان اور چائے سے اسلحہ اندرون ملک بھیجتا ہے۔ اس نے میرا نام سن رکھا تھا۔ میں جن

لوگوں سے مال لیا کرتا تھا، وہ انہیں بھی جانتا ہے۔ اس لیے جلدی یقین کر لیا اور بڑے اسلحے بھی دکھانے پر راضی ہو گیا ورنہ تو وہ پہلے کہہ رہا تھا کہ صرف درہ پستول ہوتا ہے۔ وہ لے لو۔“ دسیم نے ہنستے ہوئے بتایا۔

”ایسا کرو اسلحہ آپس میں تقسیم کر کے ریڈی ہو جاؤ۔ کچھ ہی دیر میں ہم کوچ کرنے والے ہیں۔“ میں نے

کہا۔

”ایک بات تو بتائی ہی نہیں۔ میں ایک اور کام کی چیز کرایہ پر لے آیا ہوں۔“ مرتجس بولا۔ ”جس کی ضرورت پڑے گی۔“

”ایسی کیا چیز لائے ہو؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”کالے رنگ کی ہائی لیکس۔ رات میں دور سے نظر بھی نہیں آئے گی۔“ اس نے فخریہ بتایا۔

”واہ، یہ ہوئی نابات۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے شاباشی دی۔ یہ کام کی چیز ضرورت تھی لیکن اتنی اہم نہ تھی۔ کیونکہ ہمیں گاڑی وہاں سے دور کھڑی کرنی تھی۔ پھر پیدل ہی آگے جانا تھا۔

وسیم نے جیکٹ کے اندر گرینڈ رکھے اور مشین پسل کمر میں کھونسا پھر مشین گن کا پٹا کندھے پر لٹکا بولا۔ ”میں تو تیار ہو گیا ہوں۔ دوسروں کی پوزیشن بتائی جائے۔“

”ہم آپ سے کم ہیں کیا؟“ عبداللہ نے جواب دیا۔ اس نے بھی ضروری اسلحے سیٹ کر لیے تھے۔ سب نے انٹشن ہو کر کہا۔ ”بندہ بھی تیار ہے۔“

”سنو مرتجس۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”اس وقت ہم جس مہم پر جا رہے ہیں۔ یہ تمہارے لیے بالکل نئی چیز ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم گاڑی میں ہی رہو گے۔ تاکہ جب تمہاری ضرورت پڑے تو تم حاضر رہو۔ یہ کام سب سے اہم ہے ورنہ ہم وہاں سے نکل نہیں پائیں گے۔“ میں نے اسے مہم سے دور رکھنے کے لیے اس کے کام کو اہم بنا دیا۔ وہ بھی خوش ہو گیا کہ وہی سب سے اہم بندہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے باہر نکلنے پہلے ہی وہ ہائی لیکس کو چیک کرنے چلا گیا۔ ہم سب تیار ہو کر باہر آئے۔ میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”ٹنکی فل کرائی ہے نا؟“

”جی ہاں وسیم بھائی نے پہلا کام یہی کیا ہے۔“ مرتجس نے جواب دیا۔ اور انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔ ہائی لیکس کی آواز بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔ انجن ورکنگ کنڈیشن میں تھا۔ اس نے اندر کی لائٹ رکھی تھی۔ روڈ بھی تقریباً دیران تھا۔ ہم تیز رفتاری سے منزل کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ایک پہاڑی کے دامن میں پہنچے۔ کافی دور تک پھیلا میدان تھا میدان کے درمیان وہ مکان تھا اور مکان کے عقب میں پہاڑی سلسلہ تھا۔ دور سے ایک مکان کے ہیولے طرف اشارہ کرتے ہوئے سفیر نے کہا۔ ”وہ والی عمارت ہے۔“

میں نے عمارت پر نظر ڈالی سڑک سے ایک ذیلی سڑک اس عمارت تک جا رہی تھی۔ جس نے بھی عمارت بنوائی تھی، بہت شوقین مزاج لگتا تھا۔ اچھے خاصے پیسے اس کی تعمیر پر خرچ کیے ہوں گے۔

جہاں سے وہ ذیلی سڑک مڑتی اس سے کچھ پہلے میں نے گاڑی روکنے کو کہا۔ اس لیے کہ مجھے جھاڑیوں کا ایک جھنڈ نظر آ گیا تھا۔ ”ان جھاڑیوں میں گاڑی اس طرح کھڑی کرو کہ فوراً کسی کی نظر میں نہ آ سکے۔“

میں نے کہا تو مرتجس نے اسی طرف رخ موڑ دیا۔ جھاڑیوں کی وجہ سے گاڑی بالکل چھپ کر رہ گئی تھی کالی رنگت یوں بھی اندھیرے میں نظر کہاں آتی۔ ہم نے کپڑے بھی کالے پہن لیے تھے۔ یہ کپڑے بھی وسیم تھا۔ اس نے پوری تیاری کرائی تھی۔ نیچے اتر کر وسیم نے سائبریا کی ٹوپی نکالی اور پہن لی۔ پھر ایک ٹوپی

دوسری عبداللہ اور ایک سفیر کو بھی دی۔ میں نے ٹوپی لی تو احساس ہوا کہ اس میں ہیڈ سیٹ بھی ہے۔ وسیم نے کہا۔ ”یہ ہیڈ سیٹ اتنا طاقتور ہے کہ اس پر سرگوشی بھی دو میل کے احاطے میں صاف سنی جاسکتی ہے۔ ہم الگ رہ کر بھی ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔“

پھر اس نے ایک ایک پستول سب کو دیا۔ جب کہ ہمارے پاس مشین پستل پہلے سے تھا۔ اس پستل کی ساخت عجیب سی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی سوال کرتا کہ وسیم نے خود ہی بتا دیا کہ یہ ایک طرح کا بلیو پائپ جیسا ہے۔ اس سے سوئی نکلتی ہے جو مقابل کے جسم میں داخل ہوتے ہی مضروب کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ اس طرح شور شرابے سے بھی بچا جاسکتا ہے۔“

میں نے وہ پستول بھی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وسیم نے کہا۔ ”ہمیں چار جانب سے آگے بڑھنا چاہیے۔ الگ الگ سمت سے داخل ہونا ہی بہتر ہے۔“

میں نے اعتراض نہیں کیا۔ عبداللہ نے مغربی سمت منتخب کی۔ سفیر مشرقی دیوار اور وسیم نے شمالی اور میں نے جنوبی دیوار سے چڑھنے کا بتایا۔ اس طرح کوئی ایک نظروں میں آ جاتا تو دشمن کی پوری توجہ اس کی طرف ہو جاتی اور باقی لوگ بہ آسانی اندر پہنچ جاتے۔

میں ان لوگوں سے الگ ہو کر جنوبی دیوار کی جانب بڑھنے لگا۔ اس طرف جھاڑیاں بہ کثرت تھیں۔ ان کی آڑل رہی تھی۔ چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ دشمن جس قسم سے کارروائی کر چکا ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ ہو رہا ہے کہ وہ ٹرینڈ ہے۔ کہیں اس عمارت کی پہرے داری کے لیے ان لوگوں نے کوئی خاص نظام نہ لگا رکھا۔ کیمرے نہ لگا رکھے ہوں۔ حساس مائیک بھی لگا سکتے ہیں جو ہلکی آواز کو بھی کیچ کر لیتے ہیں۔ اب تو بازار میں نگرانی کے ایسے آلات نہایت ارزاں قیمت میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ دو اور چار پیروں والے کتے بھی ادھر ادھر بٹھا رکھے ہوں۔ یعنی کتے اور چوکیدار ایسا اگر ہے تو پریشانی پیدا ہو سکتی ہے۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ کان میں سرگوشی سی سنائی دی۔ یہ آواز سفیر کی تھی۔ ”میں دیوار کے نزدیک پہنچ چکا ہوں۔“

”احتیاط رکھنا، کہیں ان لوگوں نے کیمرے نہ لگا رکھے ہوں۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”میں نے بڑی باریک بینی سے دیکھا ہے۔ کیمرے اگر لگائے ہوئے ہیں تو خفیہ ہو سکتے ہیں۔ ویسے مجھے تو امید کم ہی ہے۔ اس لیے کہ میں نے جو معلومات حاصل کی ہے اس کے مطابق چھ سات ماہ قبل اس مکان میں عنایت شاہ نامی ایک تاجر رہا کرتا تھا۔ اس کی بیوی روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئی تو وہ مکان چھوڑ گیا۔ تاجر نے ہی مکان بنوایا تھا۔ کیمرے کی اسے ضرورت شاید ہی محسوس ہوئی ہو۔“

”احتیاط سے داخل ہونا، میں بھی دیوار کے نزدیک پہنچ چکا ہوں۔“ میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ ہر اس جگہ سے بچنے کی کوشش کرتا جہاں مجھے کیمرے کا شبہ ہوتا۔ گو کہ تاریکی تھی لیکن کیمرے اگر انفراریڈ والے ہوں تو اندھیرے میں بھی بہ آسانی انسانی جسم کو محسوس کر لیتے ہیں اور اسکرین پر دیکھا دیتے ہیں۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا دیوار تک پہنچ ہی گیا۔ دیوار اتنی زیادہ اونچی نہ تھی کہ اس پر چڑھنے کے لیے مجھے سوچنا پڑتا۔ پھر دیوار کے قریب ایک گھنا پیڑ بھی تھا جس کی ڈالیاں دیوار کو چھو رہی تھیں۔ اوپر چڑھنے میں مدد ضرور دے سکتی تھیں۔ میں نے اس درخت کا انتخاب کر لیا اور اس کے تنے کے گرد دونوں ہاتھ سے گھیرا

بنایا اور اس پر چڑھتا چلا گیا۔ درخت اس دیوار سے خاصہ اونچا تھا۔ دیوار تک پہنچ کر میں نے اچھال بھری۔ جمناسٹک کی مہارت کام آئی اور میں پہلی کوشش میں ہی درخت سے دیوار پر پہنچ گیا اور پھر نیچے کود گیا۔ ہلکی سی دھپ کی آواز آئی اور میں بھر بھری زمین پر تھا۔ کچھ دیر تک وہیں دبکا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت کانوں میں ایک ساتھ دو آوازیں آئیں۔ پہلی آواز سفیر کی تھی اور دوسری آواز دسیم کی وہ دونوں بھی اندر آ چکے تھے۔

میں نے دونوں کو اپنا محل وقوع بتایا اور قریب آ جانے کو کہا۔ ابھی میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ مجھے ایک سایہ سا اپنی سمت آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ایک اور سایہ تھا۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ میرے اندر سے آواز ابھری، شاید یہ پہرے دار ہیں۔ میں فوراً ہی جھک گیا۔ وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں میں خود کو چھپا سکتا۔ اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ زمین پر لیٹ جاؤں۔ میں لینے پر غور ہی کر رہا تھا کہ میرے کانوں میں عبداللہ کی سرگوشی سنائی دی۔ ”میں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔ میرے ساتھ دسیم بھی ہے۔ ہم دونوں آپ کی طرف آرہے ہیں۔“

میں نے اطمینان کی سانس لی اور دوبارہ سے سیدھا ہونے پر غور کر ہی رہا تھا کہ میری طرف آنے والے دونوں افراد قریب آ گئے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی یا ان کی بد قسمتی۔ وہ دونوں باتیں کرنے میں لگن تھے۔ وہ سرگوشیوں میں بول رہے تھے۔ ایک نے کہا تھا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ خان کو خواب آتے ہیں۔ سردی ہڈی میں اتر رہی ہے اور ہمیں باہر بھیج دیا کہ کوئی اندر کودا ہے۔ کہاں ہے کودنے والا۔“

دوسرے نے ایک غیر پارلیمانی لفظ کا استعمال کیا اور انہیں بھیجنے والے کی بہن سے اپنے رشتے کا اعلان کیا پھر بولا۔ ”اپنے آپ کو اہم ثابت کرنے کے لیے وہ ایسا کرتا ہے۔“

”دل تو کرتا ہے کہ اس کے سڑے ہوئے دماغ میں ساری گولیاں اتار دوں لیکن باس کی وجہ سے خاموش ہو جاتا ہوں۔“

اس کا دل جو چاہ رہا تھا وہ تو اس نے کیا نہیں لیکن میں نے اپنے دل کی بات مان لی اور اس کی طرف اس عجیب ساخت کے پستول کی نال کو سیدھا کیا اور اس کے گال کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ ہلکی سی کٹ کی آواز ابھری اور وہ کچھ بولے بغیر گال پر ہاتھ رکھے گرنا چلا گیا۔

اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر دوسرا چونکا مگر دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اس پر بھی وہی پستول آزمایا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر ذہیر ہو گیا۔ ان دونوں کے جسم کو چھپانے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور آگے بڑھا۔ اب میرا رخ عمارت کی طرف تھا۔ سامنے ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس سے اندر جھانک کر تو دیکھوں۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا۔ کھڑکی میں گرل لگی تھی۔ مضبوطی آزمانے کے لیے میں نے اسے جھٹکا دیا۔ کافی مضبوط لگی۔ اب کیا کروں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دسیم کی سرگوشی گونجی۔ ”آپ ہٹ جائیں میں دیکھتا ہوں۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دسیم بالکل میرے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے جیکٹ کے اندر سے کوئی اوزار نکالا تھا کہ میں نے کہا۔ ”شور نہ ہو تو بہتر ہے۔“

”فکر ہی نہ کریں۔“ کہہ کر اس نے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس میں بھرا محلول اس نے گرل کے

جوائنٹ پر گرایا پھر اوزار کو اس میں پھنسا کر ایک دو بار ہلکے ہلکے جھٹکا دیا۔ تیسری چوتھی بار میں گرل کا جوائنٹ کھلتا چلا گیا۔ شاید اس نے کسی قسم کا تیزاب استعمال کیا تھا۔ اسی طرح اس نے چار جانب کیا تو گرل اکھڑ کر ہاتھ میں آگئی۔

گرل کو نیچے رکھنے کے بعد اس نے کہا۔ ”پہلے میں جاتا ہوں۔“ کہہ کر وہ اندر کود گیا۔ اس کے بعد میں بھی اندر داخل ہو گیا۔

اندر بالکل گپ اندھیرا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی رہتا ہی نہیں۔ دے قدموں ہم دروازے سے باہر نکلے۔ سامنے ایک اور کمر تھا۔ اس کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی خالی تھا۔ اب دوسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ اس کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا اندر کوئی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ اس کی طرف بڑھتا کہ سفیر کی آواز ہیڈ سیٹ پر گونجی۔ ”میں آپ کے عقب میں ہوں۔ کھڑکی سے ابھی اندر آیا ہوں۔“

میں نے رخ تبدیل کیا ہی تھا کہ یکا یک پورا کمر اور گلیا رابقع نور بن گیا۔ ایک ساتھ بہت ساری سرچ لائٹ جل اٹھی۔ ایسی روشنی پھیل گئی تھی جیسے ہم کرکٹ گراؤنڈ میں کھڑے ہوں اور اب میچ شروع ہونے والا ہے۔

روشنی ہوتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کمرے کے چاروں کونے پر مسلح افراد کھڑے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سفیر بھی کمرے سے باہر بھونچکا سا کھڑا تھا اور اس کے پیچھے دو مسلح افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہتھیاروں کا رخ اس کی طرف تھا اور وہ دونوں شاید پہرے دار تھے اس لیے کہ ان دونوں کے جسم پر نیلی وردی تھی۔ تبھی مائیک کی آواز گونجی۔ ”تم سب اپنے اپنے ہاتھوں کو سر پر رکھ کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“



دے کر ذبح کرنے میں خوب مزہ آتا ہے۔“

”اچھا..... یہی شوق میرا بھی ہے لیکن ذرا جدا ہے۔ جس کی گردن پر میں چھری پھیرتا ہوں وہ جہنمی ہوتا ہے اس لیے مجھے بھی بہت لطف آتا ہے۔“ وسیم نے اونچی آواز میں کہا۔

”ایسا کرتا ہوں ابتداءً سے ہی کردوں تاکہ تم دیکھ سکو کہ مزہ کسے آتا ہے، تمہیں یا ہمیں۔“ وہ وسیم کی طرف دیکھ کر بولا۔

”صحیح کہا، اتنی بار وطن دشمنوں کو ذبح کیا ہے۔ ایک بار وطن کے نام پر ذبح ہو کر بھی دیکھنا چاہیے۔“ وسیم خاموش رہنے پر تیار ہی نہیں تھا۔

ناصر شاہ بھی بڑبولا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی ہانکے جا رہا تھا۔ ”انٹرنیٹ پر میں نے اپنی کئی کارگزاری کی کلپ ڈالی ہے۔ وقت ملے تو دیکھ لینا لیکن تم کیسے دیکھو گے کیونکہ تمہیں اب ذبح ہونا ہے اور اس دوران تمہیں یوٹیوب دیکھنے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔“

وہ مسلسل بھونک رہا تھا۔ میں نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”ابے تُو بھی تو کچھ بول؟ کیسی موت تجھے پسند ہے؟“

”دیکھ بھائی اس سے نہیں مجھ سے پوچھ کہ مجھے کیسی موت پسند ہے۔“ وسیم نے چٹکی لی۔ ”مجھے فرائیڈ چکن بہت پسند ہے۔ تیرے پاس کوئی میرے ساز کی کڑھائی اگر ہے تو اسے تیار کر لے۔ مجھے میری پسندیدہ موت چاہیے ہی چاہیے، ویسے ابھی تک یہی ہوا ہے کہ جو ہمیں موت دینے کا سوچتا ہے اسے موت مل جاتی ہے..... تیری قسمت بھی کہیں دھوکا نہ دے جائے۔“

”ہا ہا ہا..... بڑا سورا بن رہا ہے۔“ اس نے اپنے ساتھی کی طرف مڑ کر کہا۔ ”اس کی باتیں سن۔ اسے بڑا گھمنڈ ہے۔ اتنا مار، اتنا مار کہ جسم کا ہر ریشہ کہے“ اس نے باضابطہ ایکٹنگ شروع کر دی۔ اپنے دونوں ہاتھ کو جوڑ کر بیٹھ گیا پھر جڑے ہوئے ہاتھ کو اٹھا کر رونے کے انداز میں بولا۔ ”مجھے معاف کر دو۔ اب میں کبھی پولیس میں شامل نہیں ہوں گا۔ ابھی استعفا دے دوں گا۔“

”لگتا ہے پرانے ڈراما باز ہو۔ اچھی ایکٹنگ کرتے ہو۔“ وسیم نے پھر چوٹ کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وسیم زیادہ بولے۔ ناصر کی باتیں سن کر مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بڑبولا اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لیے وقت سے پہلے کچھ کر بیٹھے گا۔ اس لیے کہ ایسے لوگ کسی بھی وقت آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

”ویسے رہائی کی صورت کیا ہوگی۔ اس پر بھی بات کر لو۔“ میں نے پہلی بار زبان کو حرکت دی۔

”کوئی صورت نہیں۔ اب گوٹ ہماری کوٹ میں ہے۔ تم لوگ صرف جواب دو گے۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ مجھے وہ گینگ مین سے زیادہ کوئی مسخرہ لگ رہا تھا۔

”پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی سوال جواب کا وقت نہیں آیا ہے۔“ وہ ٹہلتے ہوئے مجھ سے دور چلا گیا پھر بڑی تیزی سے قریب آیا اور اٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر مار کر بولا۔ ”تم لوگوں نے میرے بہت سے لوگ مارے ہیں۔ اب میں سب کا بدلہ لوں گا۔ اپنے ایک ایک شہید کا بدلہ۔“

”ابے جہنمی شہید کب سے کہلانے لگے۔“ وسیم نے پھر لقمہ دیا۔

”اگر تم خاموش نہ ہوئے تو تمہیں بھی اپنے شہیدوں کی خدمت کرانے کے لیے بھیجنا پڑے گا۔“ اس نے وسیم کے پاس پہنچ کر اس کے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور الفاظ چبا چبا کر بولا۔ ”میں نے کہا نا، مجھے پولیس والوں کو اذیت دیتے ہوئے مزہ آتا ہے۔“

”وطن دشمن سب سے زیادہ اگر کسی سے نفرت کرتے ہیں تو وہ فوجی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ پولیس والے وطن کے محافظ ہوتے ہیں اور چور ڈاکوؤں کو خطرہ محافظ سے ہوتا ہے۔ تم چور ہو یا ڈاکو۔“ وسیم نے بالوں پر پڑنے والے جھٹکوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”میں چور یا ڈاکو نہیں مجاہد وطن ہوں۔“ ناصر نے اس بار زیادہ زور سے جھٹکا دیا۔

مجھ پر تشدد ہو تو قبول ہے لیکن میرے سامنے میرے کسی ساتھی پر کوئی تشدد کرے یہ مجھے منظور نہیں۔ میرے اندر غصے کی ایک تیز لہری اٹھی اور میں نے بندھے ہاتھوں کو جھٹکا دیا۔ کبھی کبھی قسمت ایسے موقعہ پر ساتھ دے دیتی ہے جب تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ یہ جھٹکے کا اثر تھا یا رستی کی گانٹھ باندھنے والے کا قصور، کہ گانٹھ ڈھیلی پڑ گئی۔ دوسرا جھٹکا گانٹھ سے برداشت نہیں ہوا اور میرا ہاتھ آزاد ہو گیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور سامنے کھڑے بندے پر اچھل کر جا پڑا اور اس کے پستول کو چھینتا ہوا ایک دوسرے بندے پر گرا..... بس یہ ایک منٹ کا کھیل تھا۔ وہ سمجھ بھی نہ پائے اور میں تین بندوں کو دھکیلتا ہوا۔ کمرے سے باہر لے گیا تھا کہ کمرے میں دھماکا ہوا اور ساتھ ہی ناصر کی مکروہ آواز گونجی۔ ”بہت ہو گیا۔ اگر اپنے بندوں کی زندگی عزیز ہے تو پستول پھینک دو ورنہ یہ والی گولی تمہارے اس بڑبولے ساتھی کے سر میں دھسنے گی۔“

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ وسیم کی طرف ہے۔ اسی وقت وسیم کی آواز سنائی دی۔ ”اگر گولی چلا سکتے ہو تو چلاؤ میں بھی تو دیکھوں تم صرف ڈرامے باز ہو یا گولی بھی چلا سکتے ہو۔“ پھر وسیم نے ہدایاتی انداز کا قہقہہ لگایا تھا۔ اس کی ہنسی نے اس بندے کو مزید مشتعل کر دیا۔ وہ چیخ کر بولا۔ ”ابھی تک تیری ملاقات کسی جی دار سے ہوئی نہیں ہے۔ آج میں تجھے دکھاؤں گا کہ تشدد کیسے کیا جاتا ہے؟“

”تشدد کہتے کسے ہیں تجھے اس کا پتا ہے؟“ سفیر نے چیخ کر کہا۔ ”تشدد ایسے کی جاتی ہے۔“ اس آواز کے ساتھ دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ شاید اس نے پیروں کا استعمال کیا تھا اور کوئی سفیر کی لات کھا کر گر ا تھا۔

بغیر سوچے سمجھے، لائحہ عمل تیار کیے بنا جب انسان کوئی قدم اٹھا لیتا ہے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ میری جلد بازی نے میرے دوستوں کی زندگی پر خطرے منڈلا دیئے تھے۔ وہ سب بھی جذباتی ہواٹھے تھے۔ ایسے نازک وقت میں کیا کرنا چاہیے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے فائر کی آواز سنائی دی اور وسیم کی چیخ گونجی۔ گھبرا کر میں نے آواز دی۔ ”امداد شاہ اپنے بندے کو روک لے۔ میں اندر آ رہا ہوں۔“

”نہیں پہلے پستول پھینک دو ورنہ دوسرے والے پر فائر کرنے والا ہوں۔“ ناصر نے چیخ کر جواب دیا۔

میں نے پستول اندر پھینکا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھا پھر اندر داخل ہو گیا۔ جھتی ہوئی بازی ایک بار پھر پلٹ گئی تھی۔ ناصر شاہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تُو نے چالکیہ مہاراج کا نام سنا ہے؟ نہیں نا..... آج میں تجھے اس کے سکھائے سبق کا ایک باب سکھاؤں گا۔“

”چانکیہ کی پوری کتاب میں نے پڑھی ہے۔ لیکن وہ تو ہند کا ایک مکار روزیہ تھا۔ تجھے کیسے اس کا نام یاد آ گیا۔“ میں نے جواب میں کہا پھر وسم پر نظر ڈالی۔ وہ بالکل صحیح تھا۔ شاید اسے ڈرانے کے لیے اس نے فار کیا تھا۔ گولی یقیناً اس کے بہت قریب سے گزری ہوگئی اور اضطرابی طور پر اس کی چیخ نکل گئی ہوگی اور اسی لمحے میں نے پستول پھینک کر خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ اگر تھوڑا سا صبر کر لیتا تو اس کی چال سمجھ جاتا لیکن اب کچھ نہیں سکتا تھا۔

میرے اندر آتے ہی اس کے دو آدمیوں نے مجھے جکڑ لیا۔ میں اگر چاہتا تو ایک ساتھ دونوں کو اٹھا کر پھینک دیتا لیکن میں خود ہتھیار ڈال چکا تھا اس لیے ان لوگوں نے آسانی کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ دوبارہ باندھ دیئے۔

”اب اگر بدمعاشی کی تو بغیر وارنگ کے تمہارے کسی نہ کسی ایک بندے کو گولی مار دوں گا۔“ اس نے پستول نچا کر کہا۔ ”تو بات ہو رہی تھی مہاراج چانکیہ کی۔ وہ بدمعاش نہیں سیاست داں تھا۔ سیاست کیسے کی جاتی ہے یہ بات وہ اپنے شاستر میں لکھ گیا ہے اور آج میں اس کا سبق دھراؤں گا کہ کیسے کسی کی زبان کھلوائی جاتی ہے۔“ کہہ کر وہ مڑا اور ایک ڈنڈا اٹھالایا۔

”ابے کبھی سچ بھی بول لیا کر، یہ ڈنڈا نہیں ڈنڈی ہے۔ اس سے میرا کیا بگڑے گا۔“ وسم نے ڈنڈے کو دیکھ کر کہا۔ ”ایسے ڈنڈے سے تو میں کان کھجایا کرتا ہوں۔ ذرا اور موٹا ڈنڈا لے کر آ۔“

”ابھی تو اس کو سنبھال۔“ کہہ کر اس نے پاگلوں کی طرح اس پر ڈنڈے برسادیئے۔ اگر اس وقت میں رسیوں میں جکڑا ہوا نہ ہوتا تو وہی ڈنڈا اس کی پیٹھ پر برسانا شروع کر دیتا۔ غصے کی وجہ سے میں مسلسل ہاتھوں کی کلائیوں کو موڑ رہا تھا۔ بندھن ڈھیلے کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن رسی ٹائیلوں کی تھی جتنی کوشش کر رہا تھا۔ رسی گوشت میں اترتی جا رہی تھی۔ یہی حال سفیر کا تھا۔ وہ اب رسی سے آزاد نہ ہونے کی وجہ سے زبانی جنگ پر تیار ہو گیا تھا۔ اس نے بھی چیخ چیخ کر اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ صرف وہی ایک بندہ ایکشن میں تھا۔ زبانی حملے بھی وہی کر رہا تھا۔ باقی سب خاموش تھے۔ ایسے جیسے وہ منظر میں رہتے ہوئے بھی غائب ہوں۔ اس وقت میرا ذہن اتنا بے قابو تھا کہ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں آ رہا تھا جب کہ کچھ ہی دیر پہلے امداد شاہ نے اس کا نام لیا تھا۔ ناصر شاہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

”ابے اگر ہمت ہے تو میرے ہاتھ کھول دے۔ پھر دیکھ میں تجھے کیسا سبق سکھاتا ہوں۔“ وسم نے کہا۔

”اگر اس کی رسی نہیں کھول سکتا تو میری رسی کھول دے۔ پھر تجھے مزہ میں چکھاتا ہوں۔“ سفیر چیخا۔

وہ رک گیا۔ میں نے بے چارگی سے وسم کی طرف دیکھا۔ اگر مجھے دوستوں کی زندگی عزیز نہ ہوتی تو میں بیروں سے بھی اس کی مرمت کر سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اچھا بھری تو ہمیں گھیرے کھڑے کسی نہ کسی شخص کی گن چل جائے گی اور میں کسی دوست کو گولی کھاتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ پاگل شخص دو چار منٹ بعد خود ہی رک جائے گا۔ شاید وہ نفسیاتی بیمار تھا اسی لیے ایسی حرکتیں کر رہا تھا۔ اسے رکتا دیکھ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تو وہ بولا:

”تیری باری بھی جلد آئے گی۔ ابھی اس سے تو نمٹ لوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے ایک بار پھر وسم کی پیٹھ

پڑنڈا مارا۔

مجھے ایسا لگا کہ وہ ڈنڈا اس کی پیٹھ پر نہیں میرے دل پر لگا ہو۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہمارے ارد گرد پوری طرح مستعد کئی مسلح افراد گن تانے کھڑے تھے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ہوشیار تھے۔ لیکن میں دوسری بار جذبات میں آنے والا نہیں تھا۔

”ناصر خان! عقل سے کام لے۔ یہ سب ایک ساتھ رہیں گے تو ایک سے دوسرے کو حوصلہ ملے گا۔ ان کو پہلے الگ الگ کمروں میں بند کر پھر ایک ایک کر کے سوال جواب کر۔“ امداد شاہ نے ٹپس دیا۔

ابھی تک میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ ان دونوں میں بڑا کون ہے۔ ویسے امداد شاہ نے جو بتایا تھا اس کے مطابق تو ناصر شاہ بڑا تھا لیکن امداد شاہ اسے اس طرح مخاطب کر رہا تھا جیسے وہ بڑا ہے۔

”آپ کا حکم ہے تو ایسا ہی کرتا ہوں۔ چل اوئے سورما۔“ اس نے ڈنڈے سے مجھے آگے دھکیلا۔ ”بس ایک گھنٹے میں تو فر فر بولنے لگے گا۔ پہلے تیرا ہی علاج کرتا ہوں۔“

ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن میں چاہتا تو پلٹ کر اس کا سر توڑ سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ میرے بہت نزدیک آچکا تھا۔ ٹرینڈ بندے یہ غلطی کبھی نہیں کرتے۔ دشمن کی پہنچ سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں بازی پلٹ نہ جائے۔ مگر وہ جوش میں ہوش کھو بیٹھا تھا۔ اگر میں چاہتا تو بڑی آسانی سے اپنا سر مار کر اس کا چہرہ پھوڑ سکتا تھا لیکن میں مجبور تھا۔ دسیم اور سفیر کی وجہ سے بے بس ہو گیا تھا۔ اس کے کام میں رخنہ نہیں ڈال رہا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے آسانی سے دھکا دیتا ہوا ایک بند کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ اس کے ساتھ کتنے بندے باہر آئے ہیں اور ان میں سے کتنے مسلح ہیں۔

اس کے ہاتھ میں صرف ڈنڈا تھا لیکن اس کے پیچھے پانچ بندے تھے جن کی گن کا رخ میری طرف تھا۔ میری جسارت نے ان سب کو دہلا دیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں اگر چاہوں تو اکیلا ہی ان سب سے نمٹ سکتا ہوں۔ اس لیے پوری طرح مستعد تھے۔ شکاری کتوں کی طرح چاق و چوبند تھے۔

”اوسورما۔ تجھے پتا ہے اب میں تیرے ساتھ کون سا سلوک کرنے والا ہوں؟ اگر نہیں پتا ہے تو سن۔“ کہہ کر اس نے ڈنڈے سے میری پیٹھ بجائی۔ ”یہ والا کراہم کس کام کے لیے استعمال کریں گے ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اسی لیے خالی پڑا ہے۔“

اس نے ڈنڈے سے ہی دروازہ کھولا۔ وہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ ایک دوسرا دروازہ بھی سامنے تھا جو یقیناً گیلری میں کھل رہا ہوگا۔ اس نے مجھے کمرے میں دھکیلنے کے بعد کہا۔ ”یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے۔ آتے وقت دیکھ ہی لیا ہوگا کہ دور و نزدیک صرف ویران میدان ہے یا پہاڑیاں ہیں۔ یہاں سے کسی کو مدد کے لیے بھی بلانا چاہے گا تو کوئی نہیں آئے گا۔ اسی لیے ہم نے اس گھر کو پسند کیا تھا۔ اب اس گھر میں صرف تم سب کی چیخیں گونجن گی اور میرے قہقہے۔ تیرے ہر ساتھی کے ایک ایک جوڑ کو میں الگ کروں گا اور لطف لوں گا۔“

ابھی اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے عقب میں کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ میں نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے آنے والے مسلح بندوں میں سے ایک گرا تھا۔ ناصر نے ایک غیر پارلیمانی الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اسے آواز دی لیکن جواب کی جگہ ایک دوسرا بندہ گرا۔ تیسرا بندہ بولا۔ ”یہاں کوئی

ہے جو بے آواز پستول سے فائر کر رہا ہے۔“

”ابے.....“ اس نے بولنے والے کے ساتھ اپنے رشتے کا اعلان کیا اور چیخا۔ ”اگر گولی چلتی تو خون بہتا۔ دیکھ اسے دونوں کو ہوا کیا ہے۔ اس کی آواز پر تیسرا بندہ ادھر بڑھا تھا کہ وہ بھی دھپ سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ جو بندہ تھا وہ بھی گرا تھا۔ ایک ایک کر کے پانچوں گرے تھے۔ اب صرف ناصر شاہ رہ گیا تھا کہ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اپنے سر کو اس کی ناک پر مارا تھا۔ ٹکرایسی تھی کہ اس کی ناک کا بھرتا بن گیا ہوگا۔ وہ چیخا چاہتا تھا مگر اس کے منہ سے صرف خون کی دھار نکلی تھی۔ یقیناً اس کے سامنے کے دانت بھی ٹوٹے تھے۔ اتنی دیر سے میں خود پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ میرے سامنے میرے جگر پر ڈنڈے برسائے گئے۔ شاید یہ اسی کا شاخسانہ تھا کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پوری طاقت سے سردے مارا۔ اب اسے موقع دینا فضول تھا۔ میں نے دوبارہ اس کے چہرے پر سر مارا۔ وہ الٹ کر گرا تھا کہ اندر کمرے سے بھی کسی کے گرنے کی آواز کے ساتھ کسی کی آواز آئی تھی۔“ ”ارے اسے ہوا کیا۔“

بولنے والا شاید ادھر بڑھا تھا کہ کوئی اور گرا۔ ساتھ ہی سفیر کی آواز سنائی دی۔ ”جیتے رہو۔ شاباش، پوری بازی پلٹ دی۔“

میں نے اس کمرے کے اندر کی طرف دیکھا۔ دو بندے زمین پر گرے ہوئے تھے۔ امداد شاہ اس میں سے ایک کی رانفل کی طرف جھپٹا تھا کہ وہ بھی زمین پر گر گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ عبداللہ ایکشن میں آچکا ہے اس لیے کہ ایک وہی باہر رہ گیا تھا۔ میری نظریں اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ میری ٹوپی میں ہینڈ سیٹ ہے۔ ابھی تک اسے استعمال کرنے کا خیال تک نہیں آیا ہے۔ میں نے سرگوشی میں اسے پکارا ہی تھا کہ سامنے والے والی گیلری کا ادھ کھلا دروازہ پوری طرح کھل گیا اور میں حیران رہ گیا۔

اب تک میں یہی سوچ رہا تھا کہ دشمنوں کو ایک کے بعد ایک بے ہوشی کی نیند سلانے کا کام عبداللہ انجام دے رہا ہے۔ لیکن دروازے کے درمیان بلیو پائپ جیسا کام انجام دینے والا پلاسٹک سے بنا پستول مرتجس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ گیلری سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی پوچھا۔ ”کوئی بچا تو نہیں۔“

”نہیں..... باہر کی پوزیشن کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”باہر شاید ہی کوئی ہو اس لیے کہ ایک کے بعد ایک عبداللہ صاحب اور میں نے مشترکہ کوشش سے سب کو سلا دیا ہے۔ تبھی تو میں اتنے آرام سے پیڑ پر چڑھا اور پھر وہاں سے کود کر گیلری میں آ گیا۔“ مرتجس نے پرجوش انداز میں جواب دیا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے کہ راوی امن چین لکھتا ہے ورنہ فائر ہو رہا ہوتا۔“ وسیم نے جواب دیا اور مرتجس سے بولا۔ ”او بھائی میری پیٹھ میں زور کی خارش ہو رہی ہے۔ کھجانا ہے اس لیے جلدی سے ہاتھ کھول دو۔“

مرتجس ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے باری باری سے وسیم اور سفیر کے ہاتھ کھول دیئے۔ پہلے وسیم کے ہاتھ آزاد ہوئے تھے۔ وہ میری طرف آ گیا تھا اور اب میرے بندھن کھول رہا تھا۔ میں نے کلائی کو ادھر ادھر موڑتے ہوئے کہا۔ ”وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایسا کرو کہ ان بوریوں کو اٹھاؤ اور گاڑی میں ڈالو۔“

”اللہ کا خوف کریں شہباز۔ اتنی ساری بوریوں کو لادنا آسان نہیں ہے۔“ وسیم نے کراہتی آواز میں کہا۔
 ”سب کو نہیں، صرف ان دونوں کو۔“ میرا اشارہ ناصر شاہ اور امداد شاہ کی طرف تھا۔

اچھا ایسے بولیں نا۔“ کہہ کر اس نے امداد شاہ کے بے ہوش جسم کو کندھے پر لاد لیا پھر بولا۔ ”بھائی میں تو اپنے حصے کا بیگار کرنے چلا۔ دوسرا والا ذرا موٹا اور بھاری ہے اسے سفیر اٹھائے گا۔“
 ”میں ہوں نا۔“ کہہ کر مرتجس نے ناصر کو اپنی پیٹھ پر لادا۔ تبھی میں نے کہا۔ ”وسیم تو جوش میں ہے۔ تم ہوش سے کام لو۔ اسے رہنے دو۔ تم وسیم کے ساتھ ڈنڈا ڈولی کر کے اس بندے کو لے جاؤ۔ اسے میں اور سفیر اٹھا لیں گے۔“

مرتجس نے اسے زمین پر پٹک دیا۔ سفیر نے ہنستے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ کو پکڑ کر کہا۔ ”آپ ٹانگیں پکڑیں۔“

ان دونوں کو ہم گاڑی تک لے کر آئے۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ عبداللہ پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“
 ”کچھ نہیں۔ ایک گولی ران کو چھوتی ہوئی نکل گئی ہے۔“
 ”دکھاؤ..... زخم زیادہ گہرا تو نہیں ہے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں جناب۔ خون بہنے لگا تھا اس لیے رومال سے زخم کو باندھا ہے۔ چلنے پھرنے سے زخم کھل جاتا اس لیے میں نے لیٹ جانا مناسب سمجھا۔ ویسے اب خون بھی بند ہو چکا ہے۔“

ان دونوں قیدیوں کو عقبی حصے میں ڈال کر مرتجس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ہم واپس اپنے نئے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں مجھے یاد آیا کہ میں نے تو مرتجس سے پوچھا ہی نہیں کہ وہ فرشتہ رحمت بن کر کیسے آ گیا۔ اس لیے کہ اسے تو میں نے گاڑی سے باہر آنے کے لیے بھی منع کر دیا تھا۔ میرے سوال پر اس نے کہا۔ ”جب اندر گولیاں چلیں تو میں دبک گیا۔ ابھی اندر بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ عبداللہ صاحب لنگڑاتے ہوئے پہنچ گئے۔ ان کو زخمی دیکھ کر میں گھبرا اٹھا۔ نزدیک پہنچتے ہی عبداللہ صاحب نے بتایا کہ اندر سب پھنس گئے ہیں۔ تب میں نے دل میں کہا کہ اب مجھے ہی کچھ کرنا ہے ورنہ آپ سب مارے جائیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے عبداللہ صاحب سے کہا کہ مجھے ایک پستول دے دیجئے۔ میں اندر جا رہا ہوں۔ تب انہوں نے دو پستول دیئے۔ ایک سے گولی چلتی تھی اور دوسرے سے بے ہوش کیا جانا تھا۔ میں پستول لے کر حویلی میں داخل ہوا اور گیٹ پر کھڑے شخص کو پہلے نشانہ بنایا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی میں شیر ہو گیا اور سیدھے راستے سے اندر جانے کی بجائے۔ پیڑ کے سہارے اوپر چڑھا۔ گیلری میں پہنچ کر جھانکا تو تین چار بندے آپ کو گھیرے کھڑے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے انہیں بے ہوش کیا اور پھر گیلری میں آگے بڑھا۔ وہاں ایک کھڑکی تھی جس سے کمرے کا منظر دیکھائی دے رہا تھا۔ میں نے وہیں سے کمرے کے اندر والوں کو بھی سلا دیا۔“

”واہ جوان واہ..... تم نے کمال کر دیا۔“

”سیدھی سی بات ہے کہ جب زندگی خطرے میں ہو تو چیونٹی بھی شیر بن جاتی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”اگر

میں اس وقت ہمت نہ دکھاتا تو آپ لوگوں کی مدد کیسے کرتا۔“

میں ہنس دیا اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا تھا۔ میری زندگی ہی ایسی ہو گئی تھی جیسے پانی پر بہتا ہوا کوئی پتا جو لہروں کی تال پر خود ہی بہتا چلا جاتا ہے۔ جب کسی چیز میں پھنستا ہے تو کوئی قسمت کی بھیجی ہوئی تیز لہر اٹھتی ہے اور وہ پھر بہنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی تو یہی ہوا تھا کہ حالات نے مجھے روک دیا تھا۔ ایک الجھاؤے میں الجھ گیا تھا کہ مرتجس تیز لہر بن کر آیا اور میں پھر سے پانی پر بہنے لگا۔ زندگی کا ایک عجیب مذاق میرے ساتھ جاری ہے۔

”کن سوچوں میں الجھی ہیں اے چشم گریاں ناک، مزگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا۔“ وسیم کے شعر نے مجھے پھر سے حال کی دنیا میں لاپھینکا۔

”سوچ رہا ہوں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔“ میں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

”یہ لو..... خود ہی پلان بناتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں۔ جناب من آپ ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہم پنڈی جانے والے ہیں۔“ وسیم نے تہقہہ لگا کر کہا۔

”بات تو صحیح ہے کہ ہمیں پنڈی جانا چاہیے اور جلد سے جلد نکل لینا چاہیے۔“

”تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ آج ہی، رات کے اندھیرے میں ہی اس شہر سے دور بہت دور چل دیتے ہیں۔“ سفیر نے کہا تھا کہ وسیم نے تان لگائی:

”چل چل دے دنیا دی اس.....“ وہ سیٹ سے پیٹھ لگانے سے گریز کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ پیٹھ پر ڈنڈے کی جلن باقی ہوگی مگر وہ اظہار نہیں کر رہا ہے۔

”ابھی بھی ہم خطرے میں ہیں۔ نیٹ ورک عیاں نہیں ہوا ہے کہ امداد شاہ کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔“ میں نے وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا ارادہ تو یہ تھا کہ میں یہیں ان کے چہرے سے نقاب اتار دوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ان کی جزیں پنڈی میں ہی ہیں۔ مرشد کی خانقاہ میں، اس لیے اسے وہیں لے جا کر پوچھنا چھ کروں گا۔“

”لیکن انہیں اس گاڑی میں لے جانا آسان نہیں ہے کیونکہ جگہ کم ہے۔“ سفیر نے جواب میں کہا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی ذمہ داری مرتجس کی ہے۔“ میں نے مرتجس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ بے فکر رہیں۔ ایک اور گاڑی میری نظروں میں ہے۔ اسے ایک ہفتے کے لیے لے آؤں گا۔“ مرتجس بولا۔

میں نے ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گڈ..... کیا ابھی مل جائے گی؟“

”بالکل۔ آپ لوگوں کو گھر چھوڑ کر میں نکل جاؤں گا۔ اس گاڑی کو واپس کروں گا اور دوسری لے آؤں گا۔ کیسی گاڑی مناسب رہے گی۔“ مرتجس نے پوچھا۔

”فور وھیل لینا۔ کنڈیشن اچھی ہو۔ پیسوں کی فکر نہ کرنا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ان شاء اللہ میں اے دن گاڑی لے کر آؤں گا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

وسیم اور سفیر خاموش تھے۔ عبد اللہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار صاف نظر آرہے تھے مگر وہ مجھے زخم دیکھنے

نہیں دے رہا تھا۔ کہیں گولی اندر ہی نہ ہو۔ میرے ذہن میں فکر در آئی۔ عبد اللہ جس قسم کا بندہ تھا، اس سے بعید نہیں کہ وہ اپنی تکلیف کو ظاہر کرے کہ اس کی وجہ سے سب پریشان ہو جائیں۔ یقیناً وہ اپنی تکلیف چھپا رہا ہے۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر نظر موڑ لی۔ رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ اندھیرا بھی کم ہونے لگا تھا۔ غیر دانستہ طور پر میری نگاہ ونڈ اسکرین کے پار چلی گئی اور میں چونک پڑا۔ ہم ڈھلان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ رستہ ہی ایسا تھا۔ چکراتی ہوئی سڑک تھی۔ بلندی سے نیچے دیکھا جائے تو پوری سڑک نظر آ جاتی۔ سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک نیچے کی جانب جا رہی تھی۔ ونڈ اسکرین سے نیچے والی سڑک نظر آئی تھی اور وہاں ایک جگہ سرج لائٹوں کی وجہ سے دن کا سماں تھا۔ پولیس نے ناکا لگا رکھا تھا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی اس لیے کہ ناکے تک پہنچنے میں ہمیں دس سے بارہ منٹ لگتے۔ ہماری گاڑی میں پیچھے کی طرف دو دو مسٹنڈے بندھے پڑے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی پولیس والے ہماری خاطر داری شروع کر دیتے۔ اب کیا کیا جائے میری سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے سفیر کی توجہ مبذول کرائی۔ وہ بھی پریشان ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ تو ایک خطرناک بات ہے۔“

گاڑی کی اسپید مرتجس نے کم کر دی تھی مگر رک نہیں تھا۔ میں مسلسل سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ تبھی میری نظر سڑک کنارے اگی جھاڑیوں پر پڑی۔ ہم اب جس جگہ تھے وہاں سے پولیس کا ناکا نظر نہیں آ رہا تھا۔ درمیان میں پہاڑی آگئی تھی۔ میں نے پہاڑی کو نظر میں تو لا اور پھر مرتجس سے کہا۔ ”جھاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر گاڑی روک لینا۔“

”جی اچھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں کیا ان جھاڑیوں میں گاڑی کو چھپانا ہے؟“ سفیر نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ایک اتر جائے گا۔ وہ دور سے جھاڑیوں پر نظر رکھے گا۔ مجھے امید نہیں کہ انہیں چھ گھنٹے سے قبل ہوش آئے پھر بھی کسی کو رہنا ضروری ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم پھر آئیں گے اور اسے لے جائیں گے۔“

”میں اتر جاتا ہوں۔“ عبد اللہ نے کہا۔

”نہیں تم پہلے ہی زخمی ہو۔ شہر پہنچتے ہی تمہیں میں اسپتال لے جانے کی سوچ رہا ہوں۔ وسم اتر جائے گا۔“ میں نے عبد اللہ سے کہا۔

”وسم نہیں میں اتروں گا اور آپ سب سے موبائل کے ذریعہ رابطے میں رہوں گا۔“ سفیر بولا۔

”ہاں سفیر اتر سکتا ہے۔“ میں نے کہا تھا کہ مرتجس نے گاڑی روک لی۔

سفیر اور وسم نیچے اترے۔ میں بھی ان کی مدد کے لیے نیچے اتر چکا تھا۔ ہم سب نے ان دونوں کو نیچے اتارا اور ڈنڈا ڈولی کر کے جھاڑیوں میں پہنچا دیا۔ انہیں کافی اندر لے جا کر لٹایا تھا تا کہ گزرنے والوں میں سے کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

”کیوں نا بے ہوشی کی ایک سوئی اور ان کے جسم میں چھو دی جائے؟“ مرتجس نے کہا۔

”نہیں، یہ خطرناک بات ہوگی۔ زورس سسٹم بری طرح متاثر ہو جائے گا۔“ میں نے اس کام سے اسے

روکا۔ کیونکہ وہ پستول نکال چکا تھا۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر میں گاڑی تک لے آیا۔ وسیم وغیرہ واپس آ گئے تو ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب یہ ڈرنہ تھا کہ پولیس والے گاڑی کی تلاشی لیں گے تو امداد اور ناصر انہیں مل جائیں گے۔

گاڑی پھر سے چل پڑی۔ ہم نے ایک بہت بڑا رسک لیا تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ امداد شاہ کے بندے آجائیں اور سفیر کو اکیلا پا کر اس پر قابو پالیں لیکن کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا اس لیے کہ پولیس والوں نے بھی ہماری گاڑی دیکھ لی ہوگی اور وہ اب ہمارے نزدیک آنے کے منتظر ہوں گے۔

یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ پولیس اس طرح ناکالگائے گی۔ ورنہ میں کوئی اور راستہ تلاش کرتا۔ جلد بازی میں جو بھی حکمت عملی آزمائی تھی اب اس کی کامیابی کی دعا کر رہا تھا اور گاڑی چکر دار راستے پر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ بالآخر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پولیس کا ناکالگا تھا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو پولیس موبائلوں کی سرخ بتی ہمارا منہ چڑھا رہی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے چند منٹ پہلے انہوں نے تلاشی روک دی تھی اور تمام پولیس والے واپسی کے لیے چل دیئے تھے۔ اسی کو کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکا۔ ہم اتنا ڈر رہے تھے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔ میں نے مرتجس کو کہا کہ وہ گاڑی کی اسپیڈ کم کر لے تاکہ پولیس کی گاڑیاں دور نکل جائیں۔ مرتجس نے رفتار کم کر لی۔ لیکن پوچھتے بنانہ رہ سکا:

”سر آپ لوگ پولیس سے خوفزدہ ہو گئے۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی؟“

”بات یہ ہے کہ ہم لوگ اپنا شکار پولیس سے بچا کر رکھتے ہیں تاکہ جو بھی کیس بنے وہ پکا ہو۔ پولیس والے کیس کمزور کر دیتے ہیں۔“ وسیم نے فوراً جواب دیا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔ ہمارے ہاں کی پولیس محنت ہی نہیں کرتی۔“ مرتجس نے جواب دیا۔

”اسی لیے ہم لوگ پولیس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”یہ پولیس والے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ آپ کا ادارہ اگر نہ ہو تو پورا ملک جرائم کی آماجگاہ بن جائے۔“

وہ بے چارہ زبردستی ہمیں محکمہ خفیہ سے منسلک کیے جا رہا تھا۔ ابھی اس سے کام لینا تھا اس لیے میں نے بھی اسے مغالطے میں ہی رہنے دیا کہ اگر وہ ایسا کچھ سمجھ رہا ہے تو سمجھنے دو۔ مرتجس کی سست روی نے کام دکھایا اور پولیس کی موبائلیں دور نکل گئیں۔ اب ان کی ٹیل لائٹ کی سرخی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے مرتجس سے کہا۔ ”ایسا کرو کہ گاڑی موڑ لو۔ ہم اپنا سامان ساتھ لے لیں۔“

”جی بہتر ہے۔“ کہہ کر اس نے گاڑی کو نہایت چابک دستی سے موڑ لیا۔ میں نے سفیر کو کال کر کے بتا دیا تھا کہ ہم واپس آ رہے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا تھا کہ کہیں وہ اندھیرے میں ہماری گاڑی کو دشمن کی گاڑی نہ سمجھ لے۔ کچھ ہی دیر میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ ابھی گاڑی رکی ہی تھی کہ سفیر جھاڑیوں سے برآمد ہوا۔

”ہاں بھائی ہمارے مال کی پوزیشن کیا ہے؟ لوڈ کیا جاسکتا ہے یا کوئی کلبالا رہا ہے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”دونوں خوابِ خرگوش کا مزہ لے رہے ہیں۔ فی الحال ان کے بیدار ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔“ سفیر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر آپ صاحبان نیچے آ کر انہیں دوبارہ سے گاڑی میں سوار کرائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے میری کمر میں درد اٹھنے لگا ہے۔“

میرے اترتے ہی مرتجس اور وسیم بھی نیچے اتر آئے اور ان دونوں کو دوبارہ سے ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں لائے۔ ان کے جسموں کو اندر پیٹنے کے بعد پھر سے سفر شروع ہو گیا۔

جس مکان میں ہم ٹھہرے تھے اس تک پہنچتے پہنچتے اذان کی شیریں آواز گونجنے لگی۔ گویا ساری رات بھاگ دوڑ میں کٹ گئی تھی۔ مرتجس نے بریک دبایا تو میں نے اطمینان کی سانس لی کہ کچھ دیر کو آرام مل جائے گا۔ گاڑی سے اتر کر میں نے دروازہ کھولا تا کہ قیدیوں کو فوراً اندر لایا جاسکے اس لیے کہ کسی بھی وقت کسی کے بھی گھر کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ کوئی بھی گھر سے نکل سکتا تھا۔ مسجد جاتے ہوئے وہ ہماری کارگزاری دیکھ سکتا تھا کہ ہم کسی بے ہوش آدمی کو اتار رہے ہیں۔

میرے نیچے اترتے ہی وسیم اور سفیر نے پہلے امداد شاہ کو ڈنڈا ڈولی کر کے اندر پہنچایا پھر ناصر کو۔ ان دونوں کو اندر والے کمرے میں پہنچا کر سفیر نے کہا۔ ”آپ ایک بار چیک کر لیں کہ انہیں ہوش میں آنے میں کتنی دیر لگے گی۔“

”ہوش میں آنے کا تعین تو وسیم کر سکتا ہے کہ وہ سوئی والی گن اس کی دریافت ہے۔“ کہتے ہوئے میں نے ان دونوں کے ہاتھ پیروں کی رسی کو چیک کیا کہ کہیں ڈھیلی تو نہیں ہو گئی ہے لیکن بندھن مضبوط تھے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے خود کو بستر پر گرادیا۔ دیکھا دیکھی سب ہی لمبے لمبے لیٹ گئے۔ شاید یہ تھکن اور شب بیداری کا نتیجہ تھا کہ کچھ ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔

سونا آسان ہے مگر جاگنا کب اپنے اختیار میں ہے۔ میں بھی سویا تو خوب سویا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب سورج چڑھ آیا تھا۔ ہر طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔ میں نے نظریں موڑ کر ادھر دیکھا جہر دوسرے سو رہے تھے۔ وسیم اور سفیر بھی بے خبری کی نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن عبداللہ بیدار تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا کھڑکی سے آتی دھوپ سینک رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے؟“

”فرسٹ کلاس، میں نے زخم کا معائنہ کر لیا ہے۔ زیادہ گہرا نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”نہیں..... میں خود دیکھوں گا۔“ کہہ کر میں عبداللہ کے قریب بیٹھ گیا۔ ابھی میں اس کا پانچہ اٹھا ہی رہا تھا کہ وسیم کی آواز گونجی:

”او بھائی..... یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے۔“

”وہی جو تم دیکھ رہے ہو۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔

”میں تم سے نہیں شہباز سے پوچھ رہا ہوں کہ اسے شرم نہیں آ رہی ہے تو آپ بھی..... ارے بھائی سب

کے سامنے تو اسے برہنہ نہ کریں۔ مانا گولی لگی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے بے شرم بنادیں۔“

”بکواس بند کرو مجھے زخم کا معائنہ کرنا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے دیکھ لیا ہے۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ دوا میں نے ہی لگائی تھی۔ ان صاحب کو بھی خبر نہیں کہ

کب زخم کی ڈریسنگ ہوئی۔“ وسیم نے کہا۔

”اچھا، وہ تم تھے۔ شاید اس وقت مجھ پر غشی چھائی تھی۔ مجھے احساس تو ہوا تھا کہ کوئی میرے زخم کو چھیڑ رہا

ہے۔“ عبداللہ بولا۔

”آپ کی اطلاع کہ لیے عرض ہے کہ زخم کو صاف کرنے بعد میں نے راجا صاحب کا دیا ہوا انجکشن بھی لگا دیا تھا جو انہوں نے وادی میں جاتے ہوئے دیا تھا کہ زخمی کو لگانے سے کمزوری فوراً دور ہو جاتی ہے۔“

”تجھی میں کمزوری محسوس نہیں کر رہا ہوں۔“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے جواب میں کہا۔

زخم کو دیکھا تو واقعی وہ گہرا نہیں تھا لیکن کافی لمبا تھا۔ گولی نے گوشت کو جلا دیا تھا لیکن اس زخم کی حالت بتا رہی تھی کہ کافی سارا خون بہا ہے۔ اس لیے کہ پینٹ کا پورا پائینچہ خون سے لت پت تھا۔ میں نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ پینٹ بدل لے۔ عبداللہ لنگڑاتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا جہاں اس کا بیگ رکھا ہوا تھا۔

عبداللہ کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ سفیر بھی اٹھ چکا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ مرتجس نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”مرتجس مجھے بتا کر گیا ہے۔“ عبداللہ نے کمرے کے اندر سے جواب دیا۔ ”وہ گاڑی لینے گیا ہے۔“

”کچھ بھی ہو، یہ بندہ ہے کام کا۔ لگتا ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں ایک کا اضافہ ہونے والا ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”رات جس طرح اس نے مدد کی ہے یہ بھلانے کے لائق نہیں۔“

”بس تھوڑی سی پالش کر دی جائے تو بہت کام کا آدمی نکلے گا۔“ سفیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”موقع ملتے ہی میں اسے نشانہ بازی سکھا دوں گا۔ رات میں اس نے سوئی فائر کرنے میں خاصہ وقت لیا تھا۔ بار بار اس کا نشانہ خطا جارہا تھا۔“ وسیم بولا۔

”میں اسے کراٹے بھی سکھا دوں گا۔ اس لیے کہ وہ میرا بہت ادب کرتا ہے۔“ سفیر نے لقمہ دیا۔

”ایسا کون بندہ ہے جو تمہارا ادب نہیں کرتا۔ پوری دنیا ادب کرتی ہے صرف ایک مونا ہے جو تمہیں مکھی کی طرح اڑا دیتی ہے۔“ وسیم نے چوٹ کیا۔

”کون ہے جو بیوی سے ڈرتا نہیں..... سب اس شہد کی مکھی کو ہنی کہتے ہیں۔“ سفیر نے جوابی چوٹ کی۔

”ویسے سادی تو تمہارا اتنا ادب کرتی ہے جسے موٹے موٹے حرفوں میں لکھنا چاہیے۔“

وہ دونوں ایک دوسرے پر جملے کس رہے تھے کہ کمرے کے اندر سے عبداللہ کی آواز آئی۔ ”مانی کا فون آ رہا ہے۔“

”تو رسیو کرونا۔ اس کے لیے بھی اجازت لینی ہے کیا؟“ وسیم بولا۔

عبداللہ فون کانوں سے لگائے کمرے سے باہر آیا۔ اس نے دوسری طرف کی بات سن کر کہا۔ ”ہاں یہاں ہم سب موجود ہیں۔“ پھر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

”کیا کہہ رہا ہے بتاتے بھی جاؤ۔“ وسیم چپ نہ رہ سکا۔

”مانی کا کہنا ہے کہ اس نے آمنے سامنے کے دو اپارٹ منٹ دیکھ لیے ہیں۔ کم قیمت میں مل رہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو بات کر لیا جائے۔“ عبداللہ نے وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل بات پکی کر لے۔ مرشد سے نمٹتے ہی ہم دبی آ جائیں گے۔“ میں نے عبداللہ سے کہا۔ عبداللہ نے میری بات مانی تک پہنچا دی۔ پھر ادھر کی بات سن کر بولا۔ ”وہ آج ہی اپارٹمنٹ والوں سے بات کر لے گا۔“

پھر اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

”ایسا کرتے ہیں کہ سادی کو یہ خوش خبری سنا دیتے ہیں۔ وہ خوش ہو جائے گی۔ اسے یہ بھی کہہ دوں گا کہ وہ گھر کے ہر فرد کو یہ بات بتا دے کہ فراق کی گھڑیاں بیتنے والی ہیں، وصال کا موسم قریب ہے۔“ وسیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے ہارن کی تیز آواز گونجی۔

”لگتا ہے مرتجس آ گیا۔“ سفیر نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ دروازہ کھلا اور مرتجس کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے چہرے پر جوش تھا۔ اس نے اندر آتے ہی کہا: ”بالکل نئی پراڈ ولایا ہوں اور وہ بھی بہت کم کرایہ پر۔ راستے میں پتا ہی نہیں چلے گا کہ ہم بائی روڈ جا رہے ہیں۔“

”کیا تمہاری پراڈ ہوا میں اڑتی ہے؟“ وسیم نے اسے چھیڑا۔

”ہوا میں اڑتی نہیں ہے لیکن ایسی سبک چال چلتی ہے کہ کیا بتاؤں۔ اسے چلا کر مجھے بھی بہت مزہ آیا۔“

مرتجس نے چہکار بھری آواز میں کہا: ”تھی تو میں اڈوانس میں ایک لاکھ روپے دے آیا ہوں۔“

”چلو ہاتھ کٹنگن کو آرسی کیا۔ راستے میں دیکھ لیں گے کہ تمہارے دعوے میں کتنی صداقت ہے۔“ وسیم نے

کہا۔

میں نے اٹھ کر ان دونوں کو چیک کیا کہ کہیں وہ ہوش میں تو نہیں آ گئے لیکن وہ دونوں اسی طرح بے ہوش پڑے تھے۔ اب ان کو پنڈی تک لے جانا تھا اور یہ بھی ایک دشوار معرکہ تھا۔ میں نے کافی غور کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ ان دونوں کے جسم میں ایک ایک سوئی اور اتار دی جائے تاکہ راستہ آرام سے کٹ جائے ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی پریشانی کھڑی کر دیں۔ اس لیے کہ راستہ بھی لمبا ہے اور اس بات کا بھی بھروسہ نہیں کہ راستے میں ان کے لوگ ہمیں روکنے کی کوشش کریں۔

”کیا ارادہ ہے سر۔“ مرتجس نے پوچھا تو میرے خیالات بکھر گئے۔ میں نے سفیر کی طرف دیکھا تو اس

نے وسیم اور عبداللہ پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں نکل جانا چاہیے تاکہ وقت پر ہم پنڈی پہنچ سکیں۔“

”تو پھر مہمانوں کو نہایت احتیاط سے سوار کرادو۔ یہ خیال رہے کہ ہم ایک طویل راستے پر جا رہے ہیں اور

راستے میں جگہ جگہ چیکنگ بھی ہوتی ہے۔“ میں نے ہدایت دی تو سفیر نے اثبات میں سر ہلایا لیکن وسیم خاموش نہ

رہ سکا۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

”آپ بے فکر رہیں..... ہم مہمانوں کو احتیاط کے ساتھ ہی نہیں احترام کے ساتھ پچھلی طرف پنچیں

گے۔“

”سر میں کہوں۔“ مرتجس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ضرور بولو۔“

”سر اگر آپ کہیں تو میں اسپتال سے مریضوں کے پہننے والے کپڑے لے آؤں۔ آپ میں سے ایک

ڈاکٹر بن جائے گا۔ راستے میں کہیں پولیس کا ناکاملا تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم مریض کو لے جا رہے ہیں۔“

”واہ جیتے رہو..... اچھا آئیڈیا دیا ہے۔ دل کر رہا ہے کہ ہاتھ چوم لوں۔“ وسیم نے شرارت بھری

مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کا یہ آئیڈیا مجھے بھی پسند آیا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
”لا جواب آئیڈیا ہے۔ فوراً لباس لے آؤ۔“

”میں نے یہ بات راستے میں ہی سوچ لی تھی لیکن ذکر کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ آپ نے بھی میرے خیال کو پسند کیا تو میں کہہ دوں کہ وہ کپڑے میں آتے ہوئے لے آیا ہوں۔ گاڑی میں ہی رکھے ہوئے ہیں۔ نہ صرف کپڑے لائے ہیں بلکہ آکسیجن دینے کا پورا سامان اسپتال سے اٹھالایا ہوں۔ ایک ہفتے کے وعدہ پر خالی سیلنڈر دیگر سامان لایا ہوں۔“

”واہ..... یہ تو بڑی عقلمندی کا کام کیا ہے۔ جس سے لائے ہو اس سے کیا کہا تھا۔“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے تعریف کی۔

”اس سے کہا کہ ایک ڈراما پارٹی آئی ہوئی ہے۔ ایک ہفتے کے لیے یہ سامان چاہیے۔ کرایہ کے طور پر اسے ہزار روپے دیئے ہیں۔“

”تو پھر دیر کیسی..... مہمانوں کو لے جا کر سیٹ کر دو۔“

اس وقت مرتجس کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا وہ بہت پُر جوش ہوا تھا تھا۔ اس نے اندر والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”آپ میں سے کوئی ایک شخص آجائے۔ ہم دونوں مل کر ایک بندے کو اٹھاتے ہیں۔ پھر دوسرے کو اٹھائیں گے۔ میں نے پچھلی دونوں سیٹوں کو پھیلا دیا ہے۔ دونوں بندوں کو آرام سے لٹایا جاسکتا ہے۔“

وسیم اس کی مدد کے لیے اندر چلا گیا۔ پھر جب باہر آیا تو ان دونوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے امداد شاہ کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ اسے باہر لے کر نکل گئے۔ سفیر بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ضروری چیزیں سمینا شروع کر دیا۔ اس نے دو چکر لگالیا تھا کہ وسیم واپس لوٹا اور اس نے ناصر کو بھی اسی طرح باہر پہنچا دیا۔ میں نے گھر پر ایک نظر ڈالی۔ اچھی طرح سے جائزہ لیا کہ کوئی ضروری چیز رہ تو نہیں گئی ہے لیکن سفیر نے ایسی کوئی چیز چھوڑی نہیں تھی۔ آخر میں عبداللہ کو سہارا دے کر ہم باہر آئے۔

دروازے پر کھڑی پراڈ بالکل نئی تھی۔ رنگت سیاہ تھی۔ گاڑی کی حالت بتا رہی تھی کہ زیادہ استعمال نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا، دونوں کو ایسے سلا یا گیا تھا جیسے واقعی وہ مریض ہوں۔ امداد شاہ کی ناک پر گیس ماسک بھی لگا دیا گیا تھا۔

ان کی کارگزاری دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا۔ اب اگر کوئی روکتا تو ہم آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ یہ دونوں بے ہوش ہیں اور انہیں طبی امداد کے لیے ہم لے جا رہے ہیں۔ وسیم نے عبداللہ کو ایک سفید کوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر پڑھ لکھ لیتے تو ڈاکٹر بن جاتے..... پھر بھی افسوس کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے بن جاؤ۔ اسٹیج سکوپ بھی ہے اسے گلے میں لٹکا لینا۔“

تیاری ہو چکی تو میں نے مرتجس کو اشارہ کیا اور وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھنے لگا۔ ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ ایک تو مرتجس مشاق ڈرائیور اور پراڈ کی کنڈیشن بھی اچھی، لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ہم سفر میں ہیں۔ ہچکولے تک محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ہم شہر سے کافی دور پہنچ گئے۔ چلاس قریب آتا جا رہا تھا۔ وقت بھی تیزی سے گزر رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وسیم اور سفیر بھی خاموشی سے بیٹھے تھے کوئی کسی پر طنز نہیں کر رہا تھا۔ عبداللہ تو یوں بھی چھیڑنے پر ہی بولا کرتا تھا۔ اپنی طرف سے وہ کبھی ابتدا نہیں کرتا تھا۔ میں نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر پیچھے والے حصے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں مردے کی طرح پڑے ہوئے تھے مگر باقی لوگوں سے زیادہ آرام میں تھے اس لیے کہ وسیم عبداللہ اور سفیر بالکل شخص کر بیٹھے تھے۔ خود میں بھی بے آرام تھا لیکن ناصر اور امداد شاہ کافی جگہ گھیرے لیٹے تھے۔ ان کے جسم پر اسپتال کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔ میں نے امداد شاہ کی ناک سے ماسک ہٹا دیا تھا۔ وجہ پوچھنے پر سفیر کو بتا چکا تھا کہ جیسے ہی کسی نے رکنے کا اشارہ دیا تو ماسک پھرتی سے لگا دیا جائے گا۔

اندر کا جائزہ لینے کے بعد میں نے وینڈ اسکرین سے باہر دیکھا۔ وہی چٹیل میدان اور سنگلاخ پہاڑیاں۔ دور دور آبادی۔ آتی جاتی گاڑیاں بھی کم۔ دور بہتی ہوئی ندی جو صرف چمکتی ہوئی لکیر نظر آتی تھی۔ تبھی دور بہت دور ایک بڑی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔

”کیا ہم چلاس پہنچ رہے ہیں؟“ میں نے مرتجس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔ ہم چلاس کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔“ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

چلاس کی اپنی خوبصورتی ہے۔ اپنا مقام ہے۔ فطرت کا حسن کچھ زیادہ ہی یہاں نمایاں ہے۔ میں پہاڑوں کی خوبصورتی کو دیکھنے میں محو تھا کہ وسیم بولا۔ ”صبح سے پیٹ میں انتڑیوں نے قل کا درد تو اتر سے کیا ہے۔ شہر ابھی بھی کافی دور ہے تو کیوں نہ اس ڈھابے پر رک کر کچھ کھا لیا جائے۔“

میں نے نظر گھما کر اس طرف دیکھا جدھر وسیم نے اشارہ کیا تھا۔ وہ ہوٹل دور سے ہی صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ دوسروں کے ساتھ میں نے بھی صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا وسیم نے اشارہ کیا تو یاد آیا کہ مجھے بھی کچھ کھالینا چاہیے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وسیم نے مرتجس سے کہا۔ ”بھائی میاں۔ ادھر جانے پر کوئی پابندی تو نہیں ہیں نا تو کیوں نا اس طرف کا ایک چکر لگا لیا جائے۔ اس طرح بھوکوں کو کھانا کھلانے کا ثواب مفت میں حاصل کر لو گے۔“

مرتجس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی اور اس نے گاڑی کا رخ اس ڈھابے کی طرف موڑ دیا۔ جیسے ہی گاڑی رکی ایک بچہ بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ”صاحب جی کیا لانا ہے؟“

ہمارے اترنے سے پہلے اس نے آرڈر مانگ لیا تھا۔ میں کچھ کہتا کہ وسیم بولا۔ ”جو فوراً مل جائے وہ لے آؤ۔ لیکن روٹی گرم ہونا شرط ہے۔“

”جی بہتر۔“ اس نے ادب سے کہا اور اندر کی طرف بھاگا۔

ہم نیچے اتر آئے۔ سفیر، وسیم اور مرتجس بھی اتر آئے تھے۔ عبداللہ بھی لنگڑاتا ہوا نیچے اتر کر منجھی کی طرف بڑھنے لگا۔ اتنی دیر سے سب ہیک ہو کر بیٹھے تھے۔ یہاں منجھی نظر آئی تو سب کے سب کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ میں نے بھی نلکے سے چہرے پر چھینٹے ماریں اور پھر آ کر ایک منجھی پر لیٹ گئے۔

”یار پتا تو کر لو چکن اویل مرغ کا ہے یا فارم زدہ۔“ وسیم نے لیٹے لیٹے ہانک لگائی۔

”یہاں صرف دیسی مرغ استعمال ہوتا ہے۔ ورنہ ان سرک کے ہوٹلوں میں کون آئے گا۔“ مرتجس نے

”کہاں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نیچے..... سڑک جب گھوم کر وہاں پہنچے گی تو نظر آئے گا۔ مجھے بھی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔“

”اب کیا کیا جائے۔ میرے پاس تو پستل ہے۔“

”پستل تو میرے پاس بھی ہے۔ ایک رسک لیتے ہیں۔ پستل یہیں جھاڑیوں میں پھینک دو۔“ کہتے

ہوئے میں نے اپنی کمر سے پستول نکالا اور اسے جھاڑیوں میں اچھال دیا۔ مرتجس نے بھی میری تقلید کی۔ پھر اس

نے وہ والی پستول نکالی جو پلاسٹک کی بنی ہوئی تھی اور اس سے سوئی نکلتی تھی۔ جس نے ہمیں ایک بڑی مصیبت

سے نجات دلائی تھی۔ وہ اسے پھینکتا کہ میں نے منع کر دیا کہ نہیں، ابھی نہیں۔ یہ کھلونا پستول جیسا ہے۔ اسے مجھے

دے دو۔“

اس نے ہاتھ پیچھے کر دیا۔ میں نے پستول کو بایک کے ساتھ لٹکتے تھیلے میں ڈال دیا۔ ”اب اگر وہ اسے

نکالتے بھی ہیں تو کھلونا پستول سمجھ کر توجہ نہیں دیں گے۔“

”بالکل..... آپ دور کی کوڑی لاتے ہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ، یہ جگہ جگہ ناکا کیوں لگایا جا رہا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا؟“ میں نے مرتجس سے

پوچھا۔

”دراصل بابوسر میں ایک بڑا حادثہ ہو گیا تھا تب سے پولیس نے چیکنگ بڑھادی ہے۔ چلاس ہی نہیں

ملگت میں بھی چیکنگ عام ہے تاکہ شریپندوں کو موقع نہ مل سکے۔ اس سے غیر قانونی کام کرنے والوں پر بھی اثر

پڑا ہے اور وہ علاقے سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔“ مرتجس نے کہا تو میں ہنس پڑا۔

”ابہادشاہ اینڈ کمپنی تو کھلے عام قانون شکنی کر رہی ہے۔“

”صاحب جی قانون توڑنے والے کہاں نہیں ہوتے۔ سنتے ہیں امریکا جیسے ملک میں ہر روز اتنا جرم ہوتا

ہے جو ہمارے ملک میں ایک ہفتے میں نہیں ہوتا۔“ مرتجس بولا۔

”ہاں یہ تو ہے۔ جرائم پیشہ اپنی راہ خود ہی نکال لیتے ہیں۔ اس لیے کہ شیطان ہر جگہ بہکا سکتا ہے۔ جرم

کرنے والے دراصل شیطان کے مرید ہوتے ہیں۔“

باتوں کے درمیان راستہ کٹ گیا اور ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پولیس رکاوٹ کھڑی کر کے گاڑیوں کی

تلاشی لے رہی تھی۔ ہماری پراڈو بھی گاڑیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ اس میں ایک ہی بندہ بیٹھا نظر آیا۔ اس کا

چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ پراڈو کئی گاڑیوں کے درمیان تھی اور ایک پولیس آفیسر اس کے نزدیک

کھڑا اس سے کچھ پوچھتا چہرہ کر رہا تھا۔ مرتجس بایک سے اتر کر ادھر بڑھنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ

لیا اور بولا۔ ”یہاں پولیس کے سامنے کوئی بات نہ کرو۔ اسے ناکے سے نکلنے دو۔ ہم آگے جا کر اسے گھیریں گے۔

اس لیے کہ ہماری بایک ہے اس لیے ہمیں آگے جانے کی اجازت جلدی مل جائے گی۔“

مرتجس رک گیا تھا۔ میں نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ ہم پیدل آگے بڑھے۔ مرتجس بایک کو

دھکیلتا ہوا گاڑیوں کے درمیان سے آگے نکل رہا تھا کہ میں نے سرگوشی میں اس سے کہا کہ وہ سننے کی کوشش کرے

کہ پولیس والا کیا کہہ رہا ہے۔

”بہتر۔“ کہہ کر اس نے اپنی رفتار کم کر دی۔ ہم پراڈو کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پولیس والا شینے رہان میں ڈرائیور سے پوچھ رہا تھا کہ تم نے نا کا دیکھ کر ایک فرلانگ پہلے گاڑی موڑنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ مرتجس سرگوشی میں مجھے ترجمہ سنا رہا تھا۔ اس بندے نے کہا۔ ”گاڑی روکی نہیں ایک خرابی آرہی تھی اسی لیے بریک دبا دیا تھا۔“

”دیکھنے میں تو گاڑی بالکل نئی ہے۔ کہاں جانا ہے؟“

”چلاس۔“

”گاڑی کس کی ہے؟“ اس سوال پر اس نے جس کا نام بتایا وہ ایک مشہور سیاسی شخصیت تھی۔ میں نے بھی نام سن رکھا تھا۔ اس کا نام تعلق بھی اسی پارٹی سے تھا جس سے مرشد نے ٹکٹ لیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مرشد ہی کے اشارے پر مجھے گھیرا جا رہا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں چونک گیا۔ گویا ناصر اور امداد شاہ اسی کے کہنے پر چل رہے ہیں۔ یہ ایک خطرناک بات تھی۔ کہ مرشد نے یہاں تک جال پھیلا رکھا ہے۔

ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ افسر نے کہا۔ ”گاڑی کسی کی بھی ہو تلاشی تو دینی ہوگی۔ کاغذات دکھاؤ۔“

”کاغذات تو صاحب جی کے پاس ہیں۔ ایک ضروری کام سے گلگت گیا تھا۔ جلد بازی میں کاغذات لینا بھول گیا۔“

”ٹھیک ہے ابھی تلاشی لے کر فارغ کر دوں گا۔ کچھ لانے گئے تھے؟“

”جی نہیں۔ صاحب نے اپنے دوست کو کچھ چیزیں دی تھیں اسے پہنچا کر آ رہا ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“ کہتے ہوئے افسر نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ جیسے ہی سپاہی نزدیک آیا۔ افسر نے کہا۔

”ان کی گاڑی کی پہلے تلاشی لو تا کہ یہ جا سکیں۔ جلدی کرو کیونکہ یہ گاڑی.....“

اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دو سپاہی گاڑی کی طرف بڑھے اور ایک نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی وہ چیخا۔ ”صاحب ادھر آئیں۔“

”کیوں اس میں کیا سانپ بیٹھا ہے؟“ افسر نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

”سر، اس میں دو لاشیں ہیں۔ انسان کی لاشیں۔“

افسر اس طرح چونکا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا مارا ہو۔ وہ اپنی موٹی توند کے ساتھ پھدکتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے ڈرائیور کا کالر چھوڑا نہیں تھا۔ وہ اسے تقریباً کھینچتا ہو گاڑی کی سمت بڑھا۔ پراڈو تک پہنچ کر اندر بھاگنے لگا۔ وہاں کھڑے تماشین بھی لاش کا ذکر سنتے ہی چونک گئے تھے اور اب ان سب کی نظریں پراڈو پر ٹک گئی تھیں۔ ڈرائیور کرنے والے نے بھی اندر جھانکا اور پیچھے کی طرف لیٹے ہوئے امداد شاہ و ناصر شاہ کو دیکھ لیا۔ ابیں دیکھتے ہی اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ رنگت سفید پڑ گئی۔

اس کے خوفزدہ چہرے پر نظر ڈال کر افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کیا سمجھا تھا۔ میرے ایریا سے قتل کر کے نکل جاؤ گے۔ میں کوئی ایسا دیوانہ نہیں ہوں۔ میرے ایریا میں کوئی مجرم چھپ ہی نہیں سکتا۔“ پھر اس نے اپنا موبائل نکالا اور بولانا ممبر بولو۔ ”میں ابھی فون کر کے صاحب سے پوچھتا ہوں کہ یہ لاش کس کی ہے۔“

ڈرائیور کے گرد سپاہیوں نے گھیرا ڈال دیا تھا۔ تماشا دیکھنے والے بھی بھیڑ لگا رہے تھے۔ چیکنگ کرنے

والے تمام سپاہی اپنا کام چھوڑ کر ڈرائیور کے گرد کھڑے ہو گئے تھے جیسے انہیں شبہ ہو کہ یہ دوڑ لگا دے گا۔
ڈرائیور کی حالت دیکھنے والی تھی۔ یا تو وہ نیا تھا یا پھر اس بات سے ڈر گیا تھا کہ اب اس پر قتل کا الزام لگنے والا ہے۔ اس نے گھبرا کر باضابطہ رونا شروع کر دیا تھا۔ اتنا بڑا کام کرنے چلا تھا اور ایسا بزدل تھا، یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آرہی تھی۔ وہ رونے کے ساتھ بولتا جا رہا تھا۔ ”سریہ میری گاڑی نہیں ہے۔ اور نہ میں نے قتل کیا ہے۔ میں تو عام سا چور ہوں۔ گاڑیاں چرانا میرا پیشہ ہے۔ آپ گلگت تھانے سے پتا کر لیں ایک سال پہلے بھی میر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔“

”تو اس بار تم نے گاڑی چرانے کے لیے مالک کو ہی قتل کر دیا۔ ساری کہانی سمجھ میں آگئی ہے۔ تم نے گاڑی چرائی۔ مالکان نے روکا تو تم نے انہیں قتل کر دیا، اب لاش کو ٹھکانے لگانے کی کوشش میں تھے۔ کس دیرانے میں لاش کو پھینکنے والے تھے کہ پکڑے گئے۔“ اس وقت آفیسر شرلاک ہومز بنا ہوا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے ایک سپاہی کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا جس نے ڈرائیور کی کلائی میں ہتھکڑی پہنا دی تھی۔
”یقین کریں سر۔ میں نے مرڈر نہیں کیا ہے۔“ وہ گڑگڑا رہا تھا۔

جوش میں اس کی تو ند کچھ زیادہ ہی پھول چک رہی تھی۔ بار بار اس کی پینٹ کھسک کر نیچے آجاتی جسے د پھر سے اوپر کر لیتا تھا۔ شاید کسی بڑے مجرم کو پکڑنے کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے کہ اس کی سانس بھی پھول رہی تھی۔ وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بول رہا تھا۔ ”ابھی پتا چل جائے گا کہ یہ کس کی لاش ہے اور تو قتل کر کے اسے کہاں لے جا رہا تھا۔“

اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے افسر کو رعب جمانے کا پہلی بار موقع ملا ہے۔ یوں بھی یہ علاقہ دیگر علاقوں سے زیادہ ہراسنا ہے۔ جرائم کی شرح بہت کم ہے۔ ایسی حالت میں قتل کے مجرم کا ہاتھ آجانا بڑی بات ہے۔
”سریہ یقین کریں میں نے یہ گاڑی پیچھے رہ گئے ہوٹل سے چرائی ہے۔ آپ مجھے ہوٹل تک لے چلیں۔ وہاں اب بھی اس کا مالک بیٹھا ہوگا۔ جلدی سے چل کر اسے گرفتار کر لیں۔ وہی قاتل ہے۔“
”ہمیں کیا حق سمجھ رکھا ہے جو میں تجھے وہاں لیے جاؤں اور وہاں تیرے ساتھی گھات لگا کر پولیس پارڈ پر حملہ کر دیں۔“

”نہیں سر۔ میں سچ بول رہا ہوں۔ آپ چل کر تو دیکھیں۔ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں گا تو آپ مجھے شوٹ کر دینا۔“

”ساری بات کا پتا چل جائے گا۔ بس تھوڑا اور صبر کر لے۔ تھانے پہنچ کر ٹو فر فر بولے گا۔“ افسر۔
کہا پھر مڑ کر تماشا بینوں سے بولا۔ ”اے تم لوگ کیوں کھڑے ہو، سب جاؤ۔ بھاگو۔ اپنی اپنی گاڑی راستے سے ہٹاؤ۔“

پولیس افسر کی ڈانٹ سنتے ہی وہاں جمع ہو گئے لوگ اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ اب صرف ہم رہ گئے تھے میرا ذہن تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ معاملہ مزید الجھنے جا رہا تھا۔ اگر نا صر شاہ اور امداد شاہ پولیس کے ہتھے چڑ جاتے تو ہماری محنت برباد ہو جاتی۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کو پولیس سے کیسے چھینا جائے۔ وہ انہیں مردہ سمجھ رہے تھے اس لیے کہ انہوں نے اب تک ان دونوں کو دور دور سے ہی دیکھا تھا۔ بند کھڑکی کے شیشوں

سے۔ اگر نزدیک سے دیکھتے یا چیک کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ دونوں صرف بے ہوش ہیں۔
 ”کیا سوچنے لگے۔ پولیس والے کی نظر ہم پر پڑ گئی تو وہ پھر چیخے گا۔“ مرتجس نے نیچی آواز میں کہا۔
 تبھی وہ افسر موبائل کی طرف ڈرائیور کو کھینچتے ہوئے بڑھا اور اندر بیٹھتے ہوئے ایک سپاہی سے بولا۔ ”تم
 پراڈ کو ڈرائیور کرو گے۔ تھانے لے کر آؤ گے۔ میں ملزم کو لے کر جا رہا ہوں۔“
 میں نے مرتجس سے سرگوشی میں کہا۔ ”اب ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔“
 ”کیا؟ کیا کرنا ہوگا؟“

”اگر ہمارے مجرم پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو بات الجھ جائے گی۔ انہیں دوبارہ قبضے میں لینے کے لیے
 اسلام آباد سے آرڈر نکوانا پڑے گا۔ اگر آرڈر آنے میں دیر ہوگئی تو یہ پولیس والے رشوت لے کر اسے چھوڑ بھی
 سکتے ہیں۔“
 ”ہاں یہ تو ہے۔ ہمارے ہاں کی پولیس رشوت خوری میں نمبر ون ہے۔ واقعی انہیں پولیس کے چنگل سے
 چھڑانا پڑے گا۔“

موبائل تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اب اس جگہ صرف ہم اور پراڈ کو اسٹارٹ کرنے والا سپاہی رہ
 گیا تھا۔ وہ ابھی پراڈ کو اسٹارٹ ہی کر رہا تھا۔ کہ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ شیشہ لگا ہوا تھا اس لیے وہ میری
 بات سن نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے کھڑکی کے بندشیشے پر دستک دے کر اسے شیشہ کھولنے کو کہا۔ سپاہی نے
 حیران نظروں سے مجھے دیکھا پھر اس نے شیشہ نیچے کرنے کے لیے بٹن دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی شیشہ نیچے آ گیا۔
 سپاہی نے کڑے لہجے میں شینے زبان میں مجھ سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“
 میں نے اترتے ہوئے بانیک کے تھیلے سے کھلونا پستول نکال لیا تھا۔ جیسے ہی شیشہ نیچے ہوا اور سپاہی نے
 سر باہر نکال کر سوال کیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے گال کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک ننھی سی سوئی نکلی اور اس
 کے گال میں بیوست ہوگئی۔ اس نے اضطرابی طور پر اپنے گال پر ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ سیٹ پر لڑھک گیا۔ موبائل
 دور جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس شرلاک ہومز افسر کے سر پیٹنے کا سامان ہو گیا تھا۔ جب وہ تھانے پہنچے گا تو اپنے
 افسران کے سامنے خوب بولے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی بہادری کے فرضی قصے بھی گھڑ لے لیکن جب بے چارہ سپاہی
 ہوش میں آنے کے بعد پورٹ کرنے پہنچے گا تو وہ افسر اپنے بال نوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس وقت اس کا چہرہ
 دیکھنے کے لائق ہوگا۔

یہی کچھ سوچ کر میں اس بے ہوش سپاہی کو کھسکا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور مرتجس کو اشارہ کیا کہ وہ
 پیچھے آئے۔ پھر میں نے اسمیٹرنگ سنبھال لی۔ آٹومینک گاڑیوں کو ڈرائیو کرنے کا ایک اپنا مزہ ہے۔ گاڑی بھاگتی
 چلی گئی۔

ہمارا نیا سفر شروع ہو چکا تھا گوکہ میرا رخ شہر کی طرف تھا لیکن میں شہر میں داخل ہونے کی بجائے آگے
 نکل جانے کا سوچ رہا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ شہر میں داخل ہوتے ہی آفت نوٹ پڑے گی۔ اس پورے
 علاقے میں شاید ہی کسی کے پاس پراڈ ہو اس لیے اسے دیکھتے ہی لوگ پہچان لیں گے۔ پولیس والے پہلے ہی
 اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اندر کچھ نہ بھی ملتا پھر بھی وہ ہمیں بری طرح رگڑ دیتے۔ اس لیے میں نے مرکزی

”کیا؟“

”نہایت اسپید سے اس علاقے سے نکل جاؤں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”یہی کرنا ہوگا۔ اسے یہاں سے نکالو۔ ہمیں تیزی سے اس علاقے سے نکل جانا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ

اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور جھاڑیوں کو روندتے ہوئے پراڈ کو نیچے لے آیا۔

سفیر اور وسیم جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے نیچے آئے۔ ہم سب کو آتے دیکھ عبداللہ نے پوچھا۔ ”کیا بات

ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی سوزو کی میں نہیں بیٹھا؟“

”اس لیے کہ اب تم پراڈ میں بیٹھو گے۔“ وسیم نے کہا۔ ”پلان بدل چکا ہے۔“

”تو کیا باقی سب سوزو کی میں بیٹھیں گے؟“

”نہیں، اب ہم سب پراڈ میں سوار ہو کر پنڈی جائیں گے۔“

”اور یہ سوزو کی؟“

”یہ بھی ساتھ جائے گی اس لیے کہ اس کی قیمت ادا کر کے کاغذات لے لیے ہیں۔ وہاں پہنچ کر اسے سیل

کر دیں گے۔ بائیک بھی ساتھ جائے گی لیکن سوزو کی میں لا کر۔“ میں نے کہا۔

”چلو یہ اچھا ہوا..... ورنہ اس کھٹارا سوزو کی میں تو جوڑ جوڑا ہل جاتا۔“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے جملہ

کسا۔ ”تمہاری پسند ہوتی ہی ایسی ہے۔“

”شکر کرو کہ بروقت میرے دماغ میں یہ بات آگئی کہ سوزو کی خرید لی جائے۔ ورنہ ابھی تک اسی ہوٹل پر

بیٹھے تسبیح گن رہے ہوتے۔“ وسیم نے جوابی وار کیا۔

میں نے پراڈ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بیکار کی بحث چھوڑو اور جلد از جلد آ کر بیٹھو۔ سوزو کی وسیم ڈرائی

کرے گا۔ اور ہمارے پیچھے پیچھے آئے گا۔“

وسیم سفیر اور مرتجس نے مل کر بائیک کو سوزو کی پر لا دیا اور پھر ہمارا نیا سفر شروع ہو گیا۔ مرتجس تیز رفتار

سے پراڈ و بھگا رہا تھا۔ ہمیں جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا تھا۔ مرتجس کا کہنا تھا کہ وہ شام سے پہلے نار

پہنچا دے گا۔ اسپید بھی تائید کر رہی تھی۔ سوزو کی کافی پیچھے رہ گئی تھی لیکن موبائل پر رابطہ قائم تھا۔ دراصل وسیم ابا

ہوٹل پر بھی رکا تھا کیونکہ سوزو کی کا انجن گرم ہو گیا تھا جب کہ پراڈ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی خطرہ تھا تو پرا

پر۔ پولیس آفیسر کو جب احساس ہوگا کہ پراڈ و پہنچی نہیں یا سپاہی تھا نے پہنچ گیا تو وہ وائرلیس میسج سے تمام تھانور

الٹ کر دے گا۔ پھر اندر لیٹے ناصر اور امداد شاہ بھی مسئلہ کر سکتے تھے۔ میں نے ایک گھنٹا پہلے جائزہ لیا تھا۔

اسی طرح بے ہوش تھے۔ گو کہ بے ہوشی کا دورانیہ کافی طویل کر دیا تھا اس لیے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ

خطرناک ثابت نہ ہو۔ منزل پر پہنچ کر چیک کروں تو پتا چلے کہ دونوں کی روح نکل چکی ہے یا دماغی حالت بگا

ہے۔ اس خیال نے مجھے فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں جلد سے جلد انہیں کسی محفوظ مقام پر لے جا کر ہوش میں

چاہتا تھا۔ اسی خیال سے میں نے مرتجس سے پوچھا۔ ”اگر شام تک ہم نار ان پہنچ گئے تو ٹھہریں گے کہاں؟“

”ٹھہرنے کی ضرورت کیا ہے۔ ہم چلتے رہیں گے۔“

”میں کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہاں کوئی محفوظ جگہ مل جائے۔ تم تو اس عل

میں آتے جاتے رہے ہو گے۔ کیا یہاں کوئی گھر حاصل نہیں کر سکتے؟“ مجھے ان دونوں کی بے ہوشی پر فکر ہونے لگی تھی۔ میں نے ایک پروگرام بنالیا تھا۔ اس پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے کسی جگہ رکنا ضروری تھا۔ مرتجس کو میں ابھی بتانا نہیں چاہتا تھا اس لیے تھکن کا بہانہ بنایا تھا۔

”ہوٹل تو کئی ہیں لیکن گھر حاصل کرنا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی میں بات کرتا ہوں۔“ مرتجس نے کچھ دیر سوچا پھر جیب کو بائیں ہاتھ سے نٹولا اور موبائل نکال کر بولا۔ ”سر اگر ہو سکے تو اس میں حسن پینٹر کا نام ڈھونڈ دیجئے۔“

میں نے موبائل کو ہاتھ میں لیا اور نام تلاش کرنے لگا۔ ایچ میں جاتے ہی حسن پینٹر کا نام نظر آ گیا۔ میں نے نمبر پیش کر کے موبائل مرتجس کو تھما دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے موبائل کو کان سے لگایا۔ ادھر سے سوال ہوا تھا کہ مرتجس بولا۔ ”میں مرتجس بول رہا ہوں گلگت والا مرتجس۔ میں چلاس آ رہا ہوں۔“

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف کی باتیں سننے لگا پھر بولا۔ ”میرے ساتھ ایک ٹورسٹ پارٹی ہے۔ وہ ہوٹل میں نہیں بلکہ کسی گھر میں ٹھہرنا چاہتی ہے۔ کرایہ مناسب دے گی اگر ممکن ہو تو کوئی گھر ڈھونڈ لو۔“ ادھر سے آئے جواب کو سن کر اس نے کہا۔ ”واہ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہارا گھر خالی ہے۔ میں بس پہنچنے ہی والا ہوں۔“ کہہ کر اس نے موبائل بند کیا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ میرے دوست کا گھر خالی ہے۔ اس کے گھر والے پشاور گئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنا گھر کرایہ پر دینے کے لیے تیار ہے۔“

”آدمی تو اعتبار کا ہے نا؟“ سفیر نے پوچھا۔

”میرا دوست ہے۔ فکر نہ کریں۔“

”دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا..... ہر کسی پر فوراً اعتبار نہ کیا کرو۔ ویسے ہم اپنی آنکھیں کھلی رکھیں گے۔“ سفیر ہنس کر بولا۔ جواب میں مرتجس بھی ہنسنے لگا۔ سفیر کی بات پر اس کے چہرے پر ناگواری کی جھلک آئی تھی لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔

”بات یہ ہے کہ ہم نے اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ لوگوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ جب کہ تم نے ابھی تک صرف دوست دیکھے ہیں اسی لیے فوراً اعتبار کر لیتے ہو۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو انسان کی پہچان سیکھ لو گے۔“ سفیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو مرتجس نے فہمہ لگایا اور بولا:

”سر آپ لوگوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ہم لوگ سیدھے سادے اتنی چالاکی کہاں سے لائیں۔“

”فکر نہ کرو ہمارے تجربے سے بہت کچھ سیکھ لو گے۔“ سفیر خلاف توقع مزے کے انداز میں باتیں کر رہا تھا جب کہ یہ انداز وسیم کا تھا۔ اسی کے اندر چلبلا پن تھا۔ عبداللہ اس وقت بھی خاموش تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے اگر وسیم ہوتا تو اس کی سنجیدگی پر ایک دو کمٹ ضرور کرتا۔

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ چلاس نزدیک آتا جا رہا تھا۔ چھوٹا سا قصبہ۔ پختہ مکانات نظر آنے لگے تھے۔ آبادی نزدیک آتی جا رہی تھی کہ میں نے مرتجس سے کہا۔ ”رفقار کچھ آہستہ کر لو۔ وسیم کافی پیچھے رہ گیا ہے۔“

”آپ ان کو موہاں پر خبر کر دیں کہ وہ چلاس ہوٹل کی طرف آجائیں۔ مشہور ہوٹل ہے وہیں ہم انہیں مل جائیں گے۔ ہوٹل کے قریب ہی میرے دوست کا گیراج ہے۔“

میں نے عبداللہ کو اشارہ کیا کہ وہ فون کر دے اور میں خود باہر کے مناظر کو دیکھنے لگا۔ ایک جانب پہاڑیاں اور دوسری جانب چمکتی ہوئی لکیر جیسی ندی اور درمیان سے گزرتا ہوئی سانپ کی طرح لہراتی سڑک۔ اس سڑک پر بھاگتی پراڈو۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم ایک دوسری دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ وادی کی سرزمین بھی خوبصورت تھی لیکن ایسی خوبصورتی اسے کہاں سے ملتی جو خدا نے میرے وطن کو عطا کر رکھی ہے۔ اس کے بوئے بوئے میں حسن ہے۔ اس کے ذرے ذرے میں سحر ہے جو ہر محبت وطن کو مسحور کر لیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہی کچھ اپنوں نے اس سرزمین سے اپنے اجداد کی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے کچھ سانپ پال لیے ہیں جو ہم پر ہی پھنکارنے لگے ہیں۔ ایسے ہی غداران وطن میں ایک نام ہمارے پرانے دشمن مرشد کا بھی آتا ہے جو پہلے تو اپنی حاکمیت برقرار رکھنے کے لیے غنڈا گردی کیا کرتا تھا۔ سیاست کی سیڑھی لگا کر حکومتی ارکان میں شامل ہونا چاہتا تھا لیکن اب وہ کھل کر دشمنان وطن کا ساتھ دینے لگا ہے۔ گو کہ یہ ابھی تک تحقیق کی طالب تھی لیکن مجھے تو اسے ہر حال میں سلاخوں کے پیچھے پہنچانا تھا۔ اپنا بدلہ لینا تھا۔

میرے خیالات کی روتب ٹوٹی جب پراڈو کی۔ وہ سڑک کنارے بنا ایک گیراج تھا جس میں کئی پرانی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو مزدور بچے ایک پرانی کار کو گھس رہے تھے۔ بچے وطن کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ان پھولوں کی آبیاری کرنا ضروری ہے لیکن حالات ان ماؤں سے بھی یہ کہلوادیتا ہے کہ جابیٹا ان ننھے ننھے ہاتھوں میں اواز سنجال کر مزدوری پر جٹ جا جو میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ تجھے اونچی کرسی پر بیٹھنے کا خواب دیکھا تھا لیکن پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے مجھے تیری قربانی دینی پڑ رہی ہے۔ آہ زندگی بھی کیسا جوا ہے کہ جیت کی امید میں ہر کوئی کھیلنے پر مجبور ہے۔ مجھے بچوں کے ننھے ہاتھوں پر ترس آ رہا تھا لیکن اس وقت میں کچھ بھی کر نہیں سکتا تھا اس لیے اپنی نگاہوں کو ان کی طرف سے موڑ لیا اور اس آدمی کو دیکھنے لگا جو مرتجس سے جو گفتگو تھا۔ کچھ دیر ان دونوں میں باتیں ہوئیں اور پھر مرتجس مڑ کر عبداللہ کے پاس آیا اور بولا۔ ”صاحب جی یہ ایک دن کا پانچ سو روپے کہہ رہا ہے۔ آپ زخمی ہیں اس لیے میں نے ہاں کہہ دیا ہے۔“

عبداللہ سمجھ گیا کہ مرتجس دانستہ اسے گروپ لیڈر قرار دے رہا ہے اس لیے وہ بولا۔ ”اسے بلاؤ۔“

مرتجس نے اشارہ کیا اور وہ بندہ اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

”دیکھو بھائی۔ میں کراچی کا بندہ ہوں۔ پیسوں کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ پہاڑی سے پھسل جانے کی وجہ سے پیر میں موج آگئی ہے۔ اسی لیے میں ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے گھر کو ترجیح دے رہا ہوں۔ تاکہ آرام سے دو چار دن گھر جیسے ماحول میں وقت گزار سکوں۔“

”جی..... مرتجس نے بتایا ہے کہ آپ پہاڑی سے پھسل گئے تھے۔“ اس نے کہا تو میں نے اطمینان کی سانس لی کہ دونوں کا بیان ایک جیسا ہے۔ اگر پیر میں موج والی بات میں فرق آجاتا تو اسے شک ہو جاتا۔ میں نے بات کو مختصر کرنے کے لیے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ فوراً میرے قریب آگیا۔

”دیکھو بھائی، صاحب جی ذرا غصے والے ہیں۔ وہ جو دے رہے ہیں لے لو..... باقی پیسے میں تمہیں چپکے

سے دے دوں گا۔“ میری بات پر اس نے سر ہلا دیا اور پھر جیب سے چابی نکال کر مرتجس کو دیتے ہوئے بولا۔
 ”گھر کی ہر چیز استعمال کر سکتے ہو لیکن احتیاط کرنا کہ جو چیز جہاں سے اٹھائی ہو اسے وہیں رکھنا۔“
 ”جی بہتر ہے۔“ مرتجس نے چابی لیتے ہوئے کہا اور واپس پراڈو میں آ گیا۔ اس نے بمشکل پانچ منٹ کی
 ڈرائیو کی اور ایک مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ مرکزی سڑک سے ایک ذیلی سڑک نکلی تھی جو آگے جا کر ایک
 بڑے سے خالی میدان پر ختم ہو رہی تھی۔ یہ مکان اسی سڑک پر تھا جو نیم پختہ تھا۔

اس نیم پختہ مکان کا دروازہ کھول کر اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ معمولی فرنیچر سے سجادہ کرا اسیا
 تھا کہ گزار کیا جاسکتا تھا۔ میں دوبارہ سے باہر آیا اور آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ کافی
 دوری پر ایک میدان تھا۔ اس میں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ادھر سے نظریں ہٹا کر میں نے مرتجس سے کہا۔
 ”وسیم اور سفیر کے ساتھ مل کر ان دونوں کو اندر لاؤ۔“

یہ ایک ایسا گھر تھا جس کے آس پاس کوئی دوسرا گھر نہیں تھا۔ اس معنوں میں یہ ایک مناسب گھر تھا۔
 ایسے گھر میں کسی سے تفتیش کرنا۔ کوئی بات اگلوانی بہت آسان ہوتا ہے۔ میں نے اس بار بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا
 کہ اس نے میری راہ آسان کی ہے۔ مرتجس اور وسیم نے مل کر امداد شاہ کو گاڑی سے باہر نکال لیا تھا اور اسے اٹھا
 کر اندر لے جا رہے تھے۔ سفیر ان کو دیکھ رہا تھا کہ میں نے کہا۔ ”چلو اب اس ناصر شاہ کو بھی اتار لیتے ہیں۔“
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر گاڑی میں سوار ہو گیا پھر اس نے ناصر شاہ کے کندھے
 پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے باہر کی جانب دھکیلا۔ نیچے میں تھا میں نے اسے سنبھال لیا اور اتارنے کی کوشش کرنے
 لگا۔ اتنے میں سفیر باہر آ گیا اور اس نے ہاتھ لگا کر اسے باہر نکالا پھر ہم دونوں ہاتھوں پر اٹھائے اسے لے کر اندر
 کی طرف بڑھے۔ وسیم اور مرتجس امداد شاہ کو اندر والے کمرے میں لے جا چکے تھے۔ ہم بھی ادھر ہی بڑھے۔
 دوسرا کمرے میں صرف ایک ڈبل بیڈ تھا۔ فرش کچا تھا۔ امداد شاہ مٹی پر پڑا تھا۔ اسی کے برابر میں ہم نے ناصر شاہ
 کو بھی لٹا دیا۔ پھر میں نے سفیر سے کہا۔ ”اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کو ہوش میں کیسے لایا جائے؟“
 ”بہت آسانی سے ہوش میں لایا جاسکتا ہے۔ اپنا دیسی نسخہ ہے نا..... منہ پر پانی کے چھینے ماریں۔ پانچ
 دس منٹ میں ہوش میں آجائے گا۔“

”تو پھر شروع ہو جاؤ۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ صبح ہوتے ہی ہم راولپنڈی کے لیے نکل پڑیں گے۔“
 میں نے اپنا پروگرام بتایا۔

”صبح تک اس سے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا لیکن ایک بات کی جانب آپ نے توجہ نہیں دی ہے۔“

سفیر بولا۔

”پراڈو کے مسئلہ کے سلسلے میں تم کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“

”مجھے احساس ہے کہ اب تک نار ان تک کی پولیس جاگ چکی ہوگی اور کالے رنگ کی پراڈو کو ڈھونڈ رہی
 ہوگی۔ اسی لیے میں رکا ہوں کہ کوئی آسان سا طریقہ تلاش کیا جائے۔“ میں نے کہا۔
 ”میرے ذہن میں ایک بات ہے۔“ وسیم نے باہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اتفاق ہے کہ ہم جس کے مکان میں اترے ہیں یہ مکان ایک پینٹر کا ہے تو کیوں نا اس کی مدد لی جائے۔“

”یعنی اس گاڑی کا رنگ بدل دیا جائے؟“ مرتجس نے ذہل دیا۔

”ہاں۔“

”کھر کرنے میں پورا ایک ہفتہ لگ جائے گا۔“ مرتجس نے کہا۔

”کوئی اور راستہ؟“ میں نے مرتجس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں ایسا کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں امجد یعنی اس پینٹر سے بات کرتا ہوں۔ شاید اس کے پاس کوئی حل ہو۔“ مرتجس بولا۔

”ایسا کرو کہ اسے یہیں بلا لو۔ یوں بھی اب وہ دکان بند ہی کر رہا ہوگا۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے میں اسے بلاتا ہوں۔“ کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”اس سے کہنا کہ آج کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے، بازار کچھ اچھا لے لینا۔“

”کھانے کے معاملے میں یہاں کے ہوٹل بہت مشہور ہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ ہر قسم کے کھانے یہاں مل جاتے ہیں۔“ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

وسیم ان دونوں کے چہروں پر پانی کے چھینٹے مسلسل مار رہا تھا لیکن اب تک انہیں ہوش نہیں آیا تھا۔ تنگ آ کر اس نے آواز لگائی۔ ”پتا نہیں کس قسم کی دوا ان سوئیوں پر لگی ہے کہ یہ لوگ جاگ کر نہیں دیتے۔“

”یہ بھی تو سوچو دوسوئی کا نشہ ہے۔ اترنے میں کچھ دیر تو لگے گا ہی۔“ ابھی میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے سے مرتجس داخل ہوا۔ اس کے ساتھ امجد بھی تھا۔ میں نے سفیر کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔

مجھے ڈرتا تھا کہ کہیں وسیم پھر کوئی ہانک نہ لگائے اور امجد ان دونوں قیدیوں کو دیکھ لے۔ سفیر کے اندر جاتے ہی وسیم باہر آ گیا۔ اس کا ہاتھ خشک ہو رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ باہر آنے سے پہلے ہی ہاتھ پونچھ چکا تھا۔ مرتجس نے باہر نکلنے سے پہلے ہی زمین پر چٹائی بچھا دی تھی۔ میں اسی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ انہیں بھی بیٹھنے کا کہا۔

کچھ دیر تو ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر میں مطلب کی بات پر آ گیا۔ ”امجد صاحب آپ تو پینٹر ہیں۔ جلد سے جلد کتنی دیر میں ایک گاڑی کو پینٹ کر سکتے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ایک ہفتہ تو لگے گا ہی۔“ وہ بولا۔

”دراصل ہماری گاڑی ایک چٹان سے رگڑ کھا گئی تھی۔ گوکہ رگڑ بہت ہلکی ہے پھر بھی صاحب کا خیال ہے

کہ اس عیب کو چھپا لیا جائے۔ آپ اس کی پینٹنگ کے لیے کتنا ٹائم لیں گے؟“

”اگر صرف کھر ملانا ہے تو ایک دن لیکن فل باڈی کھر کرائیں گے تو ایک ہفتہ لگے گا اگر آپ کے پاس اتنا

ٹائم نہیں ہے تو میں ایک آسان حل بتا سکتا ہوں۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ شروع ہو جائیں۔ اتنی دیر میں مرتجس کھانا لے آتا ہے۔“

”کچھ دنوں پہلے ایک کار ریلی کے شرکا ادھر سے گزرے تھے۔ ان میں سے ایک گاڑی کی سروس میں

نے کی تھی۔ اس نے خوش ہو کر انعام کی جگہ مجھے کچھ اسٹیکر دیئے تھے۔ اگر اسے لگا دیا جائے تو وہ عیب چھپ جائے گا۔ ایک ایک اسٹیکر تین سے چار فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا ہے۔ میں اسے آپ کی گاڑی کے اسکرین کے علاوہ دائیں اور بائیں جانب بھی لگا دوں گا۔ اسٹیکر لگتے ہی گاڑی کا عیب بھی چھپ جائے گا اور گاڑی کی لک بھی بدل جائے گی۔ بالکل حلیہ بدل جائے گا۔ دونوں طرف کارریلی کی تصاویر ہوں گی۔ ایشیا کا نقشہ ہوگا۔ گویا گاڑی بالکل نئے ماڈل جیسی بن جائے گی۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اب یہ بھی بتا دو کہ پیسے کتنے دینا ہوں گے؟“ میں زیادہ فیاضی دکھا کر اس پر آشکار کرنا نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے پاس بڑی رقم ہے۔

اس نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ ”پانچ ہزار تو حق بنتا ہے۔ پینٹ کرائیں گے تو زیادہ ہی لگ سکتا ہے۔ اسٹیکر سے خوبصورتی بھی آجائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ کھانا کھانے کے بعد شرع ہو جانا۔ بلکہ گاڑی کو گیراج میں لے جا کر اسٹیکر لگاؤ۔“

”جیسا آپ کہیں..... ویسے بھی زیادہ دیر تو لگے گی نہیں۔ صرف ایک سے ڈیڑھ گھنٹے میں اسٹیکر لگ جائے گا۔“

”اس سلسلہ میں تم ہی بہتر جانتے ہو کہ یہاں اسٹیکر لگانا مناسب ہے یا اپنے گیراج میں۔“

”میرے خیال سے یہیں بہتر رہے گا۔“ امجد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کام زیادہ الجھن کا ہے نہیں۔ ایک طرف میں رہوں گا دوسری طرف میرا شاگرد، ہم دونوں مل کر بہ آسانی لگالیں گے۔“

”اگر شاگرد کو نہ بلا کر ہمارے بندے سے وہی کام لے لو؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ دسیم صاحب بھی ایک بڑے گیراج کے مالک ہیں۔ کراچی میں ان کا گیراج ہے جہاں ڈیننگ پیننگ کے علاوہ بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ ان سے کہہ دوں گا۔ یہ ہاتھ بٹا دیں گے۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے..... اس طرح میرے کچھ پیسے بھی بچ جائیں گے۔ شاگرد کو بلاؤں گا تو اس کی دیہاڑی دینی ہوگی نا۔“

میں اس کے خسامت پن پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر وہ بچے کو بلاتا بھی تو اسے سو پچاس سے زیادہ نہ دیتا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”چلو اس بہانے تمہارے کچھ پیسے بچ جائیں گے۔“

اتنی دیر میں مرتجس کڑھائی بنوا لایا تھا۔ ساتھ میں نان بھی تھے۔ کھانا دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ”بس کھانا کھالوں تو گیراج سے اسٹیکر لے آتا ہوں۔“

ہم سب کھانے بیٹھ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر امجد اپنے گیراج چلا گیا۔ میں نے کمرے میں آکر امداد شاہ اور ناصر شاہ پر نظر ڈالی۔ وہ اس وقت بھی بے ہوش پڑے تھے۔ دسیم اپنے ادھورے کام کو پورا کرنے کمرے میں آیا تھا کہ میں نے کہا۔ ”ابھی نہیں۔ امجد شاہ کی واپسی کے بعد ہم اس کی طرف توجہ دیں گے۔ کیونکہ اگر انہیں ہوش آگیا تو چیخ و پکار کریں گے جو ہمیں پھسانے کے لیے کافی ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ سفیر نے سر ہلا کر کہا۔

”تو پھر ایسا کرو کہ باہر جا کر مرتجس سے گپیں لڑاؤ تاکہ امجد کو ذرا بھی شک نہ ہو کہ ہم پانچ کے علاوہ چھٹا

بھی کوئی ہے۔“ میری بات سنے۔ ہی وہ باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور وسیم کے پاس آ گیا۔ وسیم اور عبداللہ چٹائی پر آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ عبداللہ خاموش تھا۔ ویسے بھی وہ بہت کم بولتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے چہرے پر ایک خاص خوشی نظر آرہی تھی۔ چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ شاید کسی نے شازیہ کا ذکر چھیڑ دیا ہوگا۔ میں نے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”لگتا ہے سب گھر جانے، کسی سے ملنے، چاندنی راتوں میں خوش گپیاں کرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔“ میرا اندازہ وسیم جیسا تھا۔

”بجدا آپ کشف کی منزل سر کرنے والے ہیں۔ آپ تو دلوں کے بھید بھی جان لیتے ہیں۔“ وسیم نے لیٹے لیٹے ہانک لگائی۔ اس کا لہجہ شرارتی تھا۔ اس وقت بھی اس کی نگاہیں عبداللہ پر لگی ہوئی تھیں۔

”میری طرف دیکھ کر یہ کہنے سے شہباز صاحب تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کر لیں گے۔ میں خود بتاتا ہوں کہ تم اپنے کس منصوبے کا ذکر کر رہے تھے۔“ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ میری طرف کر لیا اور بولا۔ ”شہباز صاحب، ان کا خیال ہے کہ یہ پرسوں کے بعد والے دن سادی باجی سے پھین لڑانے پہنچ جائیں گے اور بندوق میرے کندھے پر رکھ رہے ہیں کہ میں گھر جانے کے لیے بے چین ہوں۔ مجھے چھیڑنے سے پہلے خود کیا کہہ رہے تھے یہ بھول گئے۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ جاہل را حافظہ ناشد۔“

وسیم پلٹ کر کچھ کہتا کہ امجد کی گاڑی آ کر رکی اور اس نے آواز دی۔ ”بھائی صاحب۔“

میں نے وسیم کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے عبداللہ سے کہا۔

”میرے کندھے پر وزن ڈال کر باہر چلو۔ تمہیں سب کا ہیڈ بنا کر پیش کیا گیا ہے اس لیے گاڑی کا معائنہ کرنا ضروری ہے۔“

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ کرسی پر وزن ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور ہم باہر کی طرف بڑھے۔

باہر پہنچے تو دیکھا۔ ایک دروازہ مکمل ہو چکا ہے۔ بیک گراؤنڈ کالا تھا اس لیے اسٹیکر پر سفید اور سرخ رنگ سے بنا نقشہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس وقت وہ سب سامنے کی طرف کھڑے بونٹ پر اسٹیکر چپکا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وسیم بولا۔ ”دوسری طرف والا نقشہ بھی دیکھیں۔ کیا لا جواب نقشہ تلاش کیا ہے۔ پیچھے کی طرف بھی عمدہ نقشہ لگایا گیا ہے۔“ میں نے دو کی بجائے چار اسٹیکر استعمال کر لئے ہیں۔ پیسا ڈبل لگ رہا ہے لیکن خوب صورتی بڑھ جائے گی۔“

میں سہار دے کر عبداللہ کو پیچھے کی طرف لے گیا۔ شاید وہ کارریلی کا منظر تھا۔ آگے پیچھے کئی گاڑیاں بھاگتے ہوئے دکھائی گئی تھیں۔ پھر میں دوسری طرف کے دروازے پر پہنچا۔ ادھر بھی کسی کارریلی کا منظر تھا۔ پھر ہم بونٹ کی طرف پہنچے۔ وہاں لگایا جانے والے اسٹیکر چسپاں ہو چکا تھا۔ بہ مشکل آدھا گھنٹا لگا ہوگا اور کام ختم ہو گیا تھا۔ امجد نے اپنی دانست میں فری کا اسٹیکر دس ہزار میں دے کر ہمیں ٹھگ لیا تھا لیکن ہم جان رہے تھے کہ اس نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اب کوئی بھی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی گاڑی ہے جو کچھ دیر قبل پولیس کے ہتھے چڑھی تھی۔ اسٹیکر کی وجہ سے گاڑی کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ میں نے جیب سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”صاحب نے پانچ ہزار دیئے کو کہا ہے اسی لیے پانچ ہزار ہی دے رہا ہوں۔“

اس نے نوٹ گنتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس نے شکریہ کہہ کر نوٹ لے لیے۔ اور واپسی کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں واپس مڑا اور عبداللہ کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ وسیم اور سفیر بھی اندر آ گئے۔ سب سے آخر میں مرتجس اندر آیا۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کیا اور چٹنی لگا دی۔ اسے دیکھ کر میں نے کہا۔ ”مرتجس ہم اندر والے کمرے میں جا رہے ہیں۔ کسی کی زبان کھلوانے کے لیے کبھی کبھی تشدد بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تمہارا وہاں رہنا ضروری نہیں۔“

”جی بہتر ہے۔ میں اسی کمرے میں لیٹا ہوں۔ اگر میری ضرورت سمجھیں تو آواز دے لیجیے گا۔“ کہہ کر وہ چٹائی پر لیٹ گیا۔

ہم سب اندر والے کمرے میں گئے اور امداد شاہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ وقت خاصہ گزر چکا تھا۔ بے ہوشی کی دوا کا اثر یقیناً کم ہو گیا ہو گا۔ اس امید پر ہم کوشش کر رہے تھے۔ وسیم ٹھہر ٹھہر کر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ اب ہر بار پانی پڑتے ہی اس کے چہرے کے عضلات تن جاتے تھے جو اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ اسے ہوش آرہا ہے۔

بالآخر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میں نے اسے کھینچ کر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ اب بھی بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ ”اب بولو تم کس کے لیے کام کر رہے ہو۔“

”میں تو بتا چکا ہوں کہ مجھے ناصر نے نوکری دی ہے۔ وہ جو کہتا ہے میں وہی کرتا ہوں۔ اسے رقم کون دیتا ہے مجھے پتا نہیں۔“ امداد شاہ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

”اور اگر یہ بات جھوٹ نکلی؟“

”میں آپ کے سامنے ہوں آپ مجھے گولی مار دینا۔“

”ابھی پتا چل جائے گا۔ اب تک کیا کیا کر چکے ہو؟ کہیں دھماکا شما کا بھی کیا ہے؟“

”جی نہیں۔ یہ کام مجھ سے کسی نے کبھی نہیں لیا؟“

”تمہیں ناصر ہر ماہ کتنا دیا کرتا ہے۔ کتنی رقم دیتا ہے؟“

”بیس ہزار روپے ہر ماہ اور جب کوئی کام کرتا ہوں تو الگ سے بھی کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔“ اب تک صرف

دو بار مجھ سے کام لیا گیا ہے۔ ایک بار ایک سوٹ کیس یہاں آ کر ایک بندے سے لیا، دوسری بار پنڈی ہی کے ایک بندے کو راہ چلتے اغوا کیا اور اسے ناصر کے ڈیرے پر پہنچایا۔ یہ تیسرا کام تھا جو امداد شاہ کو دیا گیا۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم خاموشی سے ایک جانب بیٹھ جاؤ۔“ کہہ کر میں نے سفیر کو اشارہ دیا۔ وہ اٹھ کر اس

کے پاس پہنچا۔ اس نے اس کے ہاتھ کے بندھن کو دیکھا، مضبوطی کو جانچا اور پھر اسے اٹھا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

وہ کرسی پر بیٹھا تھا لیکن اس کے ہاتھ پیچھے ہی کی طرف تھے۔ اس لیے کہ سفیر نے کلائی کورسی کے بندھن سے آزاد

نہیں کیا تھا۔ میں نے وسیم کو اشارہ کیا کہ وہ اب ناصر شاہ پر کوشش کرے۔ اس بار جیسے ہی اس کے چہرے پر پانی

کے چھینٹیں پڑیں اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ میں نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا پھر بولا۔ ”ناصر شاہ،

اپنی حالت سے تمہیں اندازہ ہو چکا ہو گا کہ تم اس وقت کہاں ہو۔“

اس نے پہلے اپنے بازو کو ہلایا اور جان لیا کہ اس کے دونوں ہاتھ موڑ کر پیٹھ پر باندھ دیئے گئے ہیں۔ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا پھر کہا۔ ”ہاں، سمجھ گیا ہوں کہ میں اس وقت تمہاری قید میں ہوں۔“

”دیکھو ناصر شاہ، ہم عوام کے دشمن نہیں ہیں۔ ہمارا کام وطن کو دشمنوں سے پاک رکھنا ہے۔ ہم چہرہ شناس بھی ہیں۔ تم جب باتیں کرتے تھے تو میں تمہارے چہرے کا مطالعہ کرتا تھا۔ میرا دعوا ہے کہ تم ویسے نہیں ہو جیسا پوز کراتے ہو۔“

اس نے جواب نہیں دیا تب میں نے اسے اپنے شکبے کے مزید قریب کرنے کے لیے پوچھا۔ ”پختون ہو؟“

اس نے سر ہلادیا۔ اندازہ تو مجھے بھی تھا۔ اس کا لہجہ چغلی کھار ہا تھا صرف اسے اعتماد میں لینے کے لیے میں نے پوچھا تھا۔ میرا تجربہ کہہ رہا تھا کہ یہ بندہ بہت ڈھیٹ ہے۔ اسے پیار سے ہی شکار کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے میں نے کہا۔ ”دیکھو بھائی ایک بات میں پہلے ہی بتا دوں کہ میں پختونوں کا بہت احترام کرتا ہوں اس لیے کہ پختون محبت وطن ہی نہیں ایماندار اور جفاکش بھی ہوتے ہیں۔“ میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا پھر سلسلہ کلام کو جوڑا۔ ”برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد اسی لیے بڑھی کہ اندرون ہند پختونوں نے اپنی جگہ بنائی۔ روہیل کھنڈ ہو یا بندیل کھنڈ، رام پور ہو یا بلند شہر یا مظفر نگر، دس مسلمان سے پوچھیں تو ان میں آٹھ خود کو پٹھان کہیں گے اس لیے کہ ہر بادشاہ کی فوج میں پٹھانوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور ان کی اولادیں علاقے علاقے میں پھیلتی چلی گئیں۔ بہار بنگال اڑیسہ مدراس کہیں بھی چلے جاؤ۔ ہر جگہ پٹھان برادری ضرور ملے گی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی زبان وقت کے دھارے میں بہہ کر الگ ہو گئی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پختون ایک بہادر قوم ہے اور بہادر ہمیشہ بہادری سے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ ملک فروش نہیں ہوتے۔ یقیناً تم بھی ملک فروش نہیں محبت وطن ہو۔ اگر حالات نے کچھ غلط کر دیا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی بندوں کو معاف کر دیتا ہے۔“

میں نے اپنی تقریر روک کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس لمبی گفتگو کا کچھ کچھ اثر نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلتی سوچ کی لکیریں یہ بتا رہی تھیں کہ اثر ہو رہا ہے۔ میں نے سلسلہ کلام کو جوڑا۔ ”تم خود بھی عقلمند ہو۔ سمجھ لو کہ اب تمہاری چڑی اتاری جائے گی۔ کیسے اتاری جائے گی یہ ہم میں سے ہر ایک کو پتا ہے کیونکہ اس کام میں ہم چاروں مہارت رکھتے ہیں۔ تم نے چکن کی دکان پر دیکھا ہو گا کہ مرغی کو کس طرح لٹکاتے ہیں اور لٹکانے کے پہلے کس طرح اس کی کھال اتارتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں تمہارا یہ ساتھی جس نے اپنا تعارف امداد شاہ کے نام سے کرایا تھا، وہ دیکھے گا۔“ کہہ کر میں نے وسیم کو اشارہ دیا۔ وسیم نے بیگ سے ایک بلیڈ نکالا اور پھر اس کے رپر کو کھول کر پھینک دیا اور ایک قدم آگے بڑھا۔ میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر ناصر کی طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا یہ دوست انسان کی جلد کو اتنی صفائی سے چھیلتا ہے کہ ڈاکٹر بھی انگلی نہیں اٹھا پاتے۔ اس کے ہاتھ میں جادو ہے۔ اب تم بھی اس کی مہارت کا نمونہ دیکھو لیکن سن لو۔ یہ مکان ایک ویرانے میں ہے اور یہاں تمہاری چیخیں سننے والا بھی کوئی نہیں ہے۔“

ناصر شاہ کے چہرے پر الجھن تیر رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہے، اسے خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ”ناصر شاہ، تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں کون ہوں اور کس لیے تم پر ہاتھ ڈالا ہے۔ بہت کچھ امداد شاہ نے

بتا دیا ہے باقی کی معلومات تم دو گے۔ اگر تمہارے دل میں ذرا سی بھی وطن کی محبت ہے تو جواب ضرور دو گے۔“
ناصر شاہ نے نظریں اٹھا کر امداد شاہ کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ”پوچھیں۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“ اس کا لہجہ
بتا رہا تھا کہ وہ ٹوٹ چکا ہے۔

امداد شاہ کے پیچھے وسیم کھڑا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ جھول رہا تھا جس میں اس نے بھی بلیڈ پکڑ رکھا تھا۔
امداد شاہ شاید اسی لیے خاموش تھا کہ اگر اس نے ایک لفظ میں زبان سے ادا کیا تو وہ بلیڈ اس کی گردن پر چل
پڑے گا۔ ناصر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ خاموش کیوں ہیں پوچھیں جو پوچھنا چاہتے ہیں؟“
”مجھے ان لوگوں کے نام چاہیے جن سے تمہیں رقم ملتی ہے اور یہ بھی اگل دو کہ اب تک کیا کیا کر چکے
ہو۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا محکمہ ہم جیسے لوگوں کی پوری معلومات رکھتا ہوگا۔ ہم نے کیا کیا کیا ہے یہ سن
لیں۔ اب تک صرف ایک کام کیا ہے جو قابل ذکر ہے۔ ہم یہاں سے صرف بندے کو گزارتے ہیں۔ یہی ہمارا
کام ہے۔ ہمیں جس بندے کا نام بتایا جاتا ہے وہ خود ہمارے پاس آتا ہے اور ہم اسے اسکرود کی راہ داری سے
کارگل کے راستے لداخ پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اب تک صرف ایک آدمی کو پار کرکرایا ہے یا پھر ایک بار ایک بڑا سا
سوٹ کیس وصول کر کے پنڈی پہنچایا ہے۔“

”تم کب سے ان لوگوں کے ساتھ ہو اور تمہاری ٹیم کا سربراہ کون ہے؟“ میں نے سوال کیا۔
”ہم تقریباً چھ ماہ سے ان لوگوں کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن وہ کون لوگ ہیں اب تک میں نے انہیں
دیکھا نہیں ہے۔“

”پھر تمہیں ہدایت کون دیتا ہے؟“

”ہدایت موبائل فون پر موصول ہوتی ہیں۔“

”تمہاری ان لوگوں سے ملاقات کس نے کرائی تھی؟“

”میں مرشد جی کا مرید تھا۔ وہیں رہتا تھا کہ ایک دن دربار سے نکلتے ہوئے ایک آدمی ملا۔ وہ مجھے جانتا
تھا لیکن میں اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے دروازے سے نکلتے ہوئے مجھ سے کہا کہ مرشد سائیں کا ایک کام ہے
اگر چاہو تو میرے ساتھ آ جاؤ، میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ مجھے لے کر ایک کھلے میدان میں آیا۔ ابھی تک
اس نے کچھ کہا نہیں تھا اس لیے میں الجھن میں تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے اور مجھے کہاں لے جا رہا ہے لیکن جب وہ
خانقاہ سے کافی دور پہنچ کر اس میدان میں رکا تو میں نے پوچھ ہی لیا کہ وہ کس کام سے نکلا ہے؟ اس پر وہ بولا کہ تم
نوکری کے لیے پریشان ہونا؟ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس پر وہ بولا کہ تمہارا یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔
جب سے خانقاہ پر حملہ ہوا ہے اور بہت سے لوگ مارے گئے ہیں تو مرشد سائیں خود پریشان ہیں۔ لیکن وہ اپنے
مریدوں کو پریشان دیکھ نہیں سکتے۔ تم ان کے خاص آدمی ہو اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ تمہاری نوکری کا مسئلہ حل ہو
جائے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تو مجھے یاد آ گیا ہے کہ میرے ایک جاننے والے نے ایک اعتماد کا آدمی مانگا ہے۔
اگر تم چاہو تو اس نمبر پر بات کر لو۔ یہ کہہ کر اس نے ایک موبائل فون کا نمبر دیا اور بولا کہ مجھے ایک ضروری کام سے
رات کو دہائی جانا ہے۔ اس شخص سے جو باتیں ہوں وہ مجھے دہائی سے آنے پر بتا دینا لیکن اس دن کے بعد سے وہ

آدمی پھر مجھے ملا نہیں لیکن موبائل نمبر پر جس شخص سے بات ہوئی اس نے فوراً مجھے رکھ لیا اور ایڈوانس میں کچھ رقم بھی دے دی۔“

”وہ رقم تمہیں کس ذریعہ سے ملی تھی؟“

”فون پر مجھے بتایا گیا کہ پنڈی کے راجا بازار میں چاند اسٹور کے سامنے ایک آدمی کھڑا ہے اس سے مل لو۔ میں راجا بازار پہنچا تو اسٹور کے سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھتا کہ وہ خود ہی آگے چلا آیا۔ نزدیک پہنچ کر بولا۔ ”آپ ناصر ہیں؟“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ”اگلے ماہ بھی اسی تاریخ، اسی وقت، اسی جگہ آئیں گے۔ آپ کی تنخواہ مل جائے گی۔“ اتنا کہہ کر وہ بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ ہر ماہ ایک نیا بندہ اس جگہ نظر آتا ہے لیکن رقم پوری ہوتی ہے۔ باقی باتیں فون پر ہو جاتی ہیں لیکن جب میں کال کرتا ہوں تو موبائل بند ملتا ہے۔“

”تم نے اس بارے میں کبھی تجسس محسوس نہیں کیا کہ جو فون صرف ہدایت دینے کے لیے کھلتا ہے وہ یقیناً صحیح لوگوں کا نہیں ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میں اتنا مجبور ہو گیا ہوں کہ کسی قسم کا سوال کر ہی نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں غلط کر رہا ہوں۔ اسٹنگلنگ میں مدد دے رہا ہوں لیکن کچھ کر ہی نہیں سکتا ہوں۔“

”کیوں؟“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اس طرح تو تم وطن کو بیچ رہے ہو۔“

”میں اسٹنگلنگ ضرور کرتا ہوں لیکن وطن سے غداری نہیں کر رہا۔“ اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

”دیکھو میرے بھائی، میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم وطن دشمنوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے ہو۔ اسٹنگلنگ نہیں وطن دشمنی میں تم ملوث ہو چکے ہو۔ وطن دشمن طاقتیں تمہیں گھیر چکی ہیں۔ وطن کے نام پر میرا استدعا کروں گا کہ تم ہمارا ساتھ دو اور اصل مجرموں کو پکڑنے میں ہماری مدد کرو۔ اس لیے کہ وطن ہے تو ہم تو سب ہیں۔“

”یہ صحیح ہے کہ میں رہزنی، چوری، اسٹنگلنگ کرنے میں ہچکچاتا نہیں لیکن وطن سے غداری کرنے کا سوز بھی نہیں سکتا۔“

”مگر تم نے غداری کی ہے۔ وطن کا سودا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن لوگوں کے لیے کام کر رہے ہو وہ وطن دشمن ہیں اور تمہارے اس گناہ کی سزا آنے والی نسل بھی معاف نہیں کرے گی۔“

”نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”ایسا سوچنا معصومیت ہے۔ تم وطن دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہو۔ تمہارا انداز بتا رہا ہے کہ تم سبج نہیں پائے ہو کہ تمہیں کس طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ خیر..... اب اصل بات بتاؤ کہ تم ان کے چنگل میں پھنسنے کیسے تاکہ میں تمہارے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کر سکوں۔“

میری بات پر اس نے سر جھکا لیا۔ ویسے مجھے امید تھی کہ وہ میرے ٹرانس میں آجائے گا۔ وہ حقیقت اگلا ہی دے گا۔ وہی ہوا۔ کافی دیر تک سر جھکائے وہ سوچتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میرا ماضی ایک زخم ہے جس پر میں نے پھاہا رکھا ہوا ہے۔ اگر اس پھاہے کو ہٹایا تو زخم تازہ ہو جائے گا۔ میں ہن

ہوں، مخروں جیسی حرکت کرتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ میرے اندر کا ناصر شاہ مردہ رہے، زندہ نہ ہو جائے۔ میں جاہلوں جیسی حرکتیں کرتا ہوں جب کہ میں بی ایس سی ہوں۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ٹوٹ رہا ہے۔

میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر کہا۔ ”میری ایک بات گراہ میں باندھ لو۔ انسان کی فطرت میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں، اچھائی یا برائی۔ برائی سے دور رہو۔ اس لیے برائی نہ کرو کہ دل کہتا ہے۔ برائی کا انجام ہر حال میں برا ہوتا ہے۔ اچھائی بھی اتنی نہ کرو کہ زندگی مذاق بن جائے۔ زندگی گزارنا ایک فن ہے اور فن اعتدال میں ہے۔ نادانی میں جو کچھ ہوا سے بھلا دینا ہی بہتر ہے۔“

”میں ابتدا سے ایک بات تفصیل سے بتاتا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ میں کس طرح پھنسا ہوا ہوں۔ مجھے خود بھی احساس ہوتا جا رہا تھا کہ میں کسی غلط راہ پر بڑھ رہا ہوں لیکن حالات ہی ایسے ہو جاتے کہ میں چاہ کر بھی کچھ کر نہیں پاتا۔“ اس نے رک کر مجھے دیکھا تھا کہ میں نے وسیم کو آواز دی۔

”وسیم ان دونوں کے ہاتھ کھول دو۔“

وسیم نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کھول دیئے۔ وہ کچھ دیر تک کلائی پر اس جگہ کو مسلتا رہا جہاں رسی بندھی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”پانی مل جائے گا۔ گلا خشک ہو رہا ہے۔“

سفیر نے پاس رکھے جگ سے پانی نکال کر گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ تبھی میں نے پکار کر مرتجس سے کہا کہ وہ چائے کا انتظام کر دے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سے اندازہ ہو گیا کہ مرتجس حکم سنتے ہی باہر نکل گیا ہے۔ ناصر کو خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ”تم اگر چاہو تو اپنی کہانی جاری رکھ سکتے ہو تا کہ میں کوئی راستہ نکال سکوں۔ ویسے حکومت سے معافی کی قوی امید رکھو۔“

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ”میرا تعلق کالا ڈھاکا سے ہے لیکن میرے والد پنڈی میں عرصہ دراز سے مقیم ہیں۔ والدہ کا میرے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ والد نے میری خاطر شادی نہیں کی۔ گھر کے کام نوکروں کے سہارے چل رہے تھے۔ اسکول سے کالج تک کا سفر میں نے نوکروں کے سہارے طے کیے تھے۔ پھر میں پشاور چلا گیا۔ وہاں کی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اسی دوران ایک دن پنڈی سے فون آیا کہ آپ ناصر شاہ بول رہے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں تو ادھر سے بتایا گیا کہ میں مقامی تھانے سے بول رہا ہوں۔ آپ کے والد اسپتال میں ہیں۔ فوراً پنڈی آ جائیں۔ میں بھگم بھاگ پنڈی پہنچا تو پتا چلا کہ والد اسپتال میں داخل نہیں ہیں، ان کا انتقال ہو چکا ہے اور انہوں نے خود کو گولی مار کر خودکشی کی ہے۔ انہوں نے میرے نام ایک رقعہ بھی لکھا تھا کہ وہ بہت شرمندہ ہیں۔ والد نے ایک مکان اور مارکٹ میں ایک بڑی سی دکان لے رکھی تھی۔ یہ سب ان کی محنت کا ثمر تھا۔ والد کا سوئم ہوا تھا کہ مجھ پر افتاد کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ حیرت کی انتہا نہ تھی کہ والد نے وہ دکان جو مین مارکٹ میں تھی اور کافی بڑی تھی اسے انہوں نے بیچ دیا تھا۔ دکان جس نے خریدی تھی اس کے پاس صرف ایک کاغذ تھا۔ والد صاحب نے نوٹ لکھا تھا کہ اگر میں نے ایک سال میں پندرہ لاکھ واپس نہ کیے تو وہ دکان اس شخص کی ہو جائے گی۔ بزنس میں ادھار چلتا رہتا ہے۔ بابا بھی لیتے تھے لیکن مال آتے ہی رقم واپس کر دیتے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ انہوں نے دو سال میں رقم کیوں ادا نہیں کی۔ ابھی اسی سوچ میں تھا لوگوں سے بھی پتا

کر رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ بابا کا بزنس اچھا چل رہا تھا۔ انہیں بھی حیرت تھی کہ رقم واپس کیوں نہیں کی گئی۔ اسی دوران میری ملاقات چچا قاسم سے ہوئی۔ وہ بابا کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لگتا ہے کہ عاقل نے جعل سازی کی ہے۔ وہ اسی فطرت کا مالک ہے۔ اس سے کبھی تمہارے بابا نے رقم لی ہوگی لیکن وہ ادا کر دی ہوگی۔ کیونکہ میں تمہارے بابا کی فطرت جانتا ہوں۔ وہ کسی کا ادھار نہیں رکھتے تھے۔ عاقل ایک بد فطرت بندہ ہے۔ سیاسی لوگوں سے مل ملا کر وہ اپنا قد بڑھاتا ہے اور مجلسازی منڈا اگر دی کر کے پیسے بناتا ہے۔

یہ اطلاع میرے لیے بہت اہم تھی۔ اسے سبق سکھانا ضروری تھا اس لیے میں نے عاقل کا پتا ان سے لیا اور اس کے گھر جا پہنچا۔ اس کا گھر کیا تھا ایک حویلی تھی۔ اتنا بڑا بنگلا کہ دیکھتے رہو۔ میں جب اس کے پاس پہنچا تو وہاں اور بھی کچھ لوگ تھے۔ بابا کا نام سن کر اس نے سب لوگوں کو جانے کے لیے کہا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ ہاں بتاؤ کس لیے آئے ہو؟ جواب میں ہمیں نے کہا کہ مجھے حقیقت سننا ہے کہ میرے والد نے خودکشی کیوں کی؟ میری بات پر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ میرا دوست ضرور تھا لیکن اتنا قریبی نہیں کہ اپنی ہر بات مجھے بتاتا، عام طور پر لوگ خودکشی رقابت میں کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہو اور اسے کوئی دوسرا لے اڑا اسی لیے اس نے خودکشی کر لی۔ اپنے بابا کے بارے میں ایسی واہیات بات سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اسے دھنک کر رکھ دیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کے منہ کو تھیلی سے ڈھک دیا تھا۔ گردن میں بازو پھنسا دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بے بس ہو گیا تھا۔ بے بس ہو گئے شخص کو مارنے کا اپنا مزہ ہے۔ بائیں بازو میں اس کی گردن پھنسا کر میں نے دل کی بھڑاس نکالنا شروع کر دی تھی۔

دہانے ہاتھ سے لگاتار مارتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بے ہوش ہو گیا۔ تب میں اسے وہیں پٹخ کر باہر نکل آیا۔ میرے بال الجھے ہوئے تھے اور کپڑے مسلے ہوئے۔ مجھے اس حالت میں نکلتے دیکھ باہر بیٹھے لوگ چونکے لیکن کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی اور میں باہر نکل گیا۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد میں نے رکشالیا اور اپنے گھر آ گیا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔ اس لیے میں نے فوراً اپنا لٹیچی کیس لیا اور باہر نکل آیا۔ میں واپس پشاور جانا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی کارروائی کرے گا۔ ابھی میں بس اسٹینڈ پر پہنچا ہی تھا کہ ایک موبائل آکر رکی۔ اس میں سے ایک بندے نے ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے اشارے سے مجھے دکھایا۔ میں بھاگتا کہ پولیس والوں نے گھیر لیا۔ تھانے لا کر میری جو درگت بنی وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کئی لوگ مجھ سے ملنے آئے لیکن تھانیدار نے کسی سے ملنے نہیں دیا۔ دو دن تک مار مار کر میرا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔ اس درمیان دوبار عاقل آیا تھا اور اس نے سپاہیوں کو شاباشی دی تھی۔ میں نے لاکھ کہا کہ مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرو لیکن کسی نے میری نہ سنی۔ مجھے جیل بھیجنے سے پہلے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے میری حالت دیکھ کر سب کچھ سمجھ لیا تھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ صرف اتنا پوچھا کہ تمہارا کوئی وکیل ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں تو اس نے کہا کہ عدالت تمہیں وکیل کی سہولت دے گی۔ ایک گھنٹے بعد ایک شخص آیا اس نے مجھ سے کاغذات پر دستخط لیے کہ وہ میرا وکیل ہے۔ پھر مجھے جیل میں تین دن گزارنے پڑے۔ مجھ پر ایک شریف شہری پر

گھر میں گھس کر قاتلانہ حملہ کرنے، بھتے کی رقم کے لیے دھمکی دینے کا الزام تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھے بری طرح پھانسا ہے۔ تیسرے دن وکیل آیا اور مجھ سے وکالت نامے پر دستخط کرا کر چلا گیا۔ چوتھے دن آکر اس نے ایک عجیب بات کہی۔ اس نے مشورہ دیا کہ اس کیس کو ختم کر دینا بہتر ہے ورنہ عاقل ایک دوسری چال چلنے والا ہے۔ اس کے ایک نوکر کا کل قتل ہوا ہے۔ وہ اس قتل کا الزام تم پر ڈالنا چاہتا ہے۔ اس الزام سے بچنے کا محفوظ ترین راستہ یہ ہے کہ تم کہہ دو کہ اسے جانتے بھی نہیں ہو، تم اس کے گھر میں ڈاکا ڈالنے کی نیت سے داخل ہوئے تھے۔ اس نے روکا تو تم نے فرار ہونے کے لیے اس پر حملہ کر دیا۔ اس طرح یہ کیس ہلکا ہو جائے گا اور میں ضمانت کرا لوں گا۔ کیونکہ قتل کی نیت سے گھر میں داخل ہونے سے کم سزا چوری کی نیت سے کسی گھر میں داخل ہونا ہے۔ میں تین روز میں بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ پولیس کی مارنے دماغ معاف کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے بغیر کچھ سوچے اس کے کہنے پر دستخط کر دیئے۔“ وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے کہا:

”اس کا مطلب ہے کہ وکیل بھی اس سے ملا ہوا تھا۔“

”جی ہاں، اس کے بعد عاقل کا ایک بندہ آیا کہ تم اپنے گھر کے کاغذات عاقل صاحب کے نام کر دو ورنہ کیس واپس نہیں لیا جائے گا۔ تم نے جرم قبول کر ہی لیا ہے اس لیے اب سزا تمہارا مقدر ہے۔ مجھے اس طرح سے گھیر لیا گیا تھا کہ میں چاہ کر بھی پھندے سے نکل نہ پایا اور مزید دلدل میں اتر گیا۔ میں نے کوئی راہ نہ دیکھ گھر کے کاغذات بھی اس کے نام کر دیئے لیکن اس نے پھر بھی کیس واپس نہ لیا اور مجھے سزا ہو گئی۔ میں جیل میں تھا کہ ایک بندے نے مجھ سے کہا، اگر تم یہاں سے نکلنا چاہو تو میں ایک راستہ بتا سکتا ہوں۔ مجھے سزا ہونی تھی اس لیے میں ڈرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کیسے؟ تو اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ایک بندے سے میری بات کرادی۔ جیل میں موبائل ناممکن سی بات تھی لیکن اس کے پاس موبائل تھا۔ اس لیے میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی خاص بندہ ہے۔ اس نے جس بندے سے بات کرائی تھی۔ اس نے کہا کہ کل تمہیں کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ وہاں میرا وکیل ہوگا۔ وہ تمہیں جیسا کہے ویسا بیان دینا۔ میری تاریخ ایک ہفتے بعد کی تھی لیکن دوسرے ہی روز مجھے عدالت میں طلب کر لیا گیا اور صرف ایک پیشی پر عدالت نے ریمارک میں لکھ دیا کہ بندہ بے قصور ہے اس لیے رہا کیا جاتا ہے کیونکہ جو ثبوت پیش کیے گئے ہیں وہ ناکافی ہیں۔ اور میں رہا ہو گیا۔ باہر آیا تو ایک بندہ منتظر تھا وہ مجھے لے کر مرشد کی خانقاہ میں پہنچا۔ اس خانقاہ میں مجھے ایک کمرارہنے کے لیے دے دیا گیا۔ اب میں وہیں رہتا ہوں۔ جب کوئی کام ہوتا ہے تبھی باہر آتا ہوں۔ مجھے دھمکی دی گئی ہے کہ اگر میں نے ان کی بات نہیں مانی تو وہ عدالت کو ثبوت فراہم کر دیں گے کہ میں نے جعل سازی سے ثبوت بنا کر عدالت کو گمراہ کیا ہے اور مجھے پچھلے کیس کے ساتھ نئے کیس بھی فیس کرنے ہوں گے۔ اسی ڈر سے میں کسی کتے کی طرح اس کے آگے دم ہلاتا رہتا ہوں۔“ بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جو اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ اندر سے دکھی ہے۔

”صاف ظاہر ہے کہ تمہیں گھیرا گیا اور جب تم پھنس گئے تو اپنے کام کے لیے تیار کر لیا۔“

”جی ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“

”ایسا ہی ہوتا ہے۔ وطن دشمن قوتیں اپنی مطلب براری کے لیے ہجور و بے بس انسانوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ اب فکر نہ کرو میں تمہیں دوبارہ سے معاشرے میں عزت دلاؤں گا۔ لیکن وعدہ کرنا ہوگا کہ پھر کوئی جرم نہیں

”کرو گے۔“

”آپ یقین کریں کہ اگر مجھے اطمینان ہو جائے کہ مجھ پر کوئی کیس نہیں رہا تو میں دوبارہ سے چھوڑی ہوئی پڑھائی پوری کرنے میں لگ جاؤں گا۔“

”اطمینان رکھو ایسا ہی ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ تم پر سے سارے کیس ختم کرادوں۔“

”میں اور میرا یہ دوست امداد شاہ آپ کے لیے جان بھی قربان کر دیں گے۔“

”تو پھر تیار ہو جاؤ، ہم جلد پنڈی پہنچ کر مرشد کو ایسا سبق دیں گے کہ آئندہ وہ وطن دشمنوں سے کبھی ساز باز نہیں کر سکے گا۔“

”میں لاکھ براہی لیکن وطن دشمن نہیں ہوں۔ یقین کریں کہ اب تک جتنے بھی کام کیے وہ میرے خیال میں وطن دشمنی نہیں۔ اگر مجھے پہلے شک ہوتا تو شاید میں اس سے ٹکرا جانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ میں تو اس گلنگ سمجھ کر اس کے کام میں معاونت کر رہا تھا۔“

”غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ معاف کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ بے فکر رہو۔ حکومت سے معافی میں میں بھرپور معاونت کروں گا۔ اب تیار ہو جاؤ۔ میرے وطن کی ان دیمک کو تباہ کرنے کے لیے۔ پہلے یہ مرشد صرف غنڈا اگر دی اور دوسرے جرائم کر رہا تھا۔ سیاست کا سہارا لے کر خود کو بچائے ہوئے تھا لیکن جب اس کا مرکز یعنی اس کی خانقاہ تباہ ہو گئی تو اس نے اپنی تباہی کا نقصان پورا کرنے کے لیے ملک دشمن طاقتوں سے مدد لے لی۔ اب میں اسے کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ اپنا پرانا حساب تو لوں گا ہی۔ مادر وطن کی حرمت سے کھیلنے پر سزا بھی دوں گا۔“

”ہمیں آپ اپنے ساتھ پائیں گے۔“ اس نے بلند لہجے میں جواب دیا۔

اتنی دیر سے باقی سب خاموش تھے۔ سب اس کی باتیں سن رہے تھے۔ مرتجس تو بار بار اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ تبھی سفیر نے فریج میں کہا۔ ”آپ کو اس کی کہانی پر یقین ہے؟ یہ ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے؟“

میں نے بھی فریج میں جواب دیا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کبھی کسی اجنبی پر مکمل بھروسہ نہیں کرتا۔ مجھے یوں بھی مرشد سے نمٹنا ہے ہی اور اس کے لیے میں ان دونوں کو چارابناؤں گا۔“

مرتجس میری طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے خاموش ہوتے ہی پوچھا۔ ”یہ آپ لوگ کس زبان میں باتیں کر رہے تھے۔“

”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علم ہر ایک کو ہونا نہیں چاہیے اس لیے ہم ایسی زبان میں باتیں کرتے ہیں جو دوسروں کی سمجھ میں نہ آئے تاکہ راز، راز ہی رہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسی کئی زبانیں سیکھ لو گے۔“

”مجھے تو بس ایک ہی زبان سیکھنا ہے، وہ ہے انگلش۔ جب کبھی میری ٹیکسی میں انگریز بیٹھتے ہیں تو مجھے شرم

آتی ہے۔“

”ایسا کرنا کہ جب تک وسم ساتھ ہے روز اس سے دوچار انگریزی کے الفاظ سیکھتے رہو۔ جب ڈھیر سارے الفاظ یاد ہو جائیں تو انہیں جملوں میں استعمال کرنے کا طریقہ سیکھ لینا۔“ کہہ کر میں باہر نکل آیا تاکہ

گاڑی چیک کرلوں اس لیے کہ پنڈی کے لیے نکلا جاسکے۔ میں گاڑی چیک کر رہا تھا کہ سفیر آگیا اس نے کہا: ”شہباز مجھے ان دونوں پر شک ہے کہ یہ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔“

”پہلے پنڈی پہنچ لوں پھر ان کو آزمائوں گا۔ اگر کام کے بندے نہیں ہوئے تو کوئی علاج سوچ لوں گا لیکن پہلے امتحان تو لینے دو۔“

میں نے سفیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھالے لیکن اس کے سوچ کی سوئی تو ایک ہی جگہ انگی ہوئی تھی۔ اس نے کہا: ”میرا مشورہ ہے کہ ان دونوں کو دن بھر کے لیے پھر سے بے ہوش کر دیا جائے۔ ایک ایک سوئی کافی ہوگی۔“

”سوچتا ہوں۔“ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ ”صبح سویرے نکلنا ہے اس لیے فی الحال تو جا کر سو جاؤ۔“ میں نے سفیر کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اسے اندر بھیج کر میں پھر سے پراڈ میں بیٹھ گیا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اندر کی لائٹ بند کر دی تھی اسی لیے وہ دونوں سمجھ نہ پائے کہ میں اندر بیٹھا ہوا ہوں۔ ناصر اور امداد شاہ باہر نکل آئے تھے۔ جہاں پر گاڑی کھڑی تھی اس سے کچھ دوری پر ایک سنگی بنج بنا ہوا تھا۔ ایسے بنج عام طور پر پارک وغیرہ میں رکھے جاتے ہیں۔ شاید مکان مالک اسے کسی پارک وغیرہ سے اٹھالایا تھا۔ وہ دونوں جا کر اس پر بیٹھ گئے۔ امداد شاہ پشتو میں پوچھ رہا تھا کہ ایسی کیا بات تھی کہ وہ یکا یک بڑے صاحب اپنے ساتھی سے ایک عجیب زبان میں باتیں کرنے لگے تھے۔

”وہ عجیب زبان نہیں فرنج زبان تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں فرنج نہیں جانتا۔ میں فرانس میں دو سال گزار چکا ہوں۔“ ناصر نے ہنس کر کہا تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ بندہ تو پرت در پرت کھل رہا ہے۔ سفیر کا شک مجھے بھی سچ لگنے لگا تھا مگر میں نے کچھ کہا نہیں۔ وہ کچھ اور بولتا کہ مرتجس بھی باہر آگیا۔ انہیں وہاں بیٹھا دیکھ وہ ان کے قریب آگیا۔

”آپ لوگ یہاں بیٹھے ہوا کھا رہے ہیں اور میں سوچ رہا تھا کہ آپ لوگ کہیں فرار تو نہیں ہو گئے۔“ مرتجس نے کہا اور قہقہہ لگایا۔

مرتجس کی بات پر وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔ ان کی نظروں میں حیرت تھی، انہیں خاموش دیکھ مرتجس بولا۔ ”کہیں آپ لوگوں نے میرے مذاق کا برا تو نہیں منایا۔“

”نہیں نہیں برا کیوں مناؤں گا۔“ ناصر جلدی سے بولا اور کھڑا ہو گیا۔ ”چلو اندر چلتے ہیں۔“ کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھا تھا کہ مین روڈ پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ چمکی۔ روشنی کی وجہ سے میں بھی چونک گیا کیونکہ وہ گاڑی ہماری طرف ہی آرہی تھی۔

ناصر، امداد اور مرتجس اندر جا چکے تھے۔ صرف میں گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ گاڑی مرکزی شارع کے موڑ پر آکر رک گئی اور اس میں سے دو آدمی باہر نکلے۔ ان کا حلیہ کچھ ایسا تھا کہ میری نظریں ان پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ گاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے گھر کے قریب پہنچے اور پھر وہ اس طرح سے جائزہ لینے لگے جیسے ایک ایک گوشے کو دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ پھر نیچی آواز میں چترالی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ مجھے

چترالی کی بالکل سمجھ نہ تھی اس لیے میں سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ان کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ میں بغور ان کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ کب کوئی غلط حرکت کرتے ہیں۔ لیکن اب تک انہوں نے ایسی کوئی حرکت کی نہیں تھی کہ میں دخل دیتا۔ وہ دونوں سامنے سے جائزہ لے کر پیچھے کی طرف جانے لگے تھے کہ ان کے قدم رک گئے۔ اس لیے کہ باہر اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں کمرے کے کھلے دروازے سے آتی ہوئی روشنی کی لمبی لکیر بڑی واضح تھی۔ اس روشن لکیر میں کسی آدمی کی پرچھائی نظر آئی تھی جیسے کوئی دروازے کی سمت آرہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ دونوں ٹھنک گئے تھے۔ انہوں نے خود کو اندھیرے میں چھپا لیا تھا۔ جدھر وہ دونوں کھڑے تھے اس کے قریب ایک ٹوٹی ہوئی دیوار تھی جو کسی مقصد سے بنائی گئی ہوگی اور بعد میں اسے ڈھادیا گیا ہوگا لیکن اب بھی چار فٹ کی دیوار باقی تھی۔ وہ دونوں اس دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئے تھے۔ اس بات نے ان کے مشکوک ہونے پر مہر ثبت کر دی تھی۔ وہ دونوں دیکے ہوئے اسی روشنی کو دیکھ رہے تھے۔ تبھی روشنی کو پار کر کے ناصر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا دھردھیر دیکھتا رہا پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور سیٹی پر فلمی دھن بجانے لگا۔ عین اسی وقت دروازے سے سفیر نمودار ہوا۔ اس نے ناصر سے سوال کیا۔ ”آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو پتا ہے ناکہ ابھی آپ نگرانی میں ہیں۔ اگر بڑے صاحب نے آپ کو باہر دیکھ لیا تو سب کی شامت آ جائے گی۔“

سفیر کی بات سن کر اس نے کہا۔ ”اندر گرمی ہے اسی لیے باہر آ گیا۔“
میں نے غور کر لیا تھا کہ دیوار کے پیچھے بیٹھے وہ دونوں سیٹی سن کر چونکا ہو گئے تھے۔ میں نے ان کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر سفیر کی طرف دیکھا۔ وہ ناصر سے کہہ رہا تھا۔
”کوئی بات نہیں لیکن اب تو اندر چلیں۔ صاحب واک پر گئے ہوں گے۔ اب وہ آتے ہی ہوں گے۔“
ان دونوں پر میری نگاہیں مرکوز تھیں اور میں سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر پستول تلاش کر رہا تھا کہ وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔



وہ دونوں انہیں اندر جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر دیوار کے پیچھے سے نکلے اور سڑک کی طرف بڑتے چلے گئے۔ ان کا انداز مشکوک تھا۔ میں نے سوچا کہ باہر نکل کر انہیں روکوں۔ اسی خیال سے نیچے اترا تھا اور سڑک کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

میں تیز قدموں سے سڑک پر پہنچا تھا لیکن وہ دونوں نظر نہیں آئے۔ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ دور ہوتی ٹیل لائٹ نظر آئی۔ وہ ریڈ لائٹ کسی بائیک کی تھی۔ انہوں نے جھاڑیوں میں بائیک چھپا رکھی تھی اسی پر سوار ہو کر فرار ہو گئے تھے۔ ان کا ارادہ کیا تھا۔ کس مقصد سے آئے تھے، یہ میں سمجھ نہیں پایا۔ کچھ دیر تک میں وہیں کھڑا ان کے بارے میں سوچتا رہا پھر واپس پلٹ آیا۔

واپسی کے وقت بھی وہی دونوں میرے دماغ پر سوار تھے کہ وہ کیوں آئے تھے۔ جس طرح وہ دونوں مکان کا جائزہ لے رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ وہ ریکی کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ناصر اور امدا شاہ تھے۔ کہیں وہ دونوں ان کے ساتھی تو نہیں؟ ابھی مکان کا جائزہ لے کر گئے ہیں اور بعد میں وہ ساتھیوں کے ساتھ حملہ کریں

گئے۔ اس خطرے کا تدارک ضروری تھا۔ میں نے اس سلسلے میں سب کو ہوشیار کرنے کا سوچا اور برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ خیال آیا کہ امداد شاہ اور ناصر بھی ساتھ ہیں۔ ابھی تک وہ دونوں مشکوک ہیں۔ ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ پھر جب میں باہر بیٹھا تھا اور وہ دونوں اجنبی ریکی کر رہے تھے تو ناصر شاہ باہر آ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انہی اجنبیوں کی وجہ سے وہ باہر آیا ہو لیکن مرتجس کی مداخلت پر وہ واپس چلا گیا تھا۔ اگر وہ دونوں اسی کی تلاش میں ہیں تو یہ خطرناک بات تھی۔ مرتجس نے ایک بات اور بتائی تھی کہ ان دنوں علاقے میں جرائم عام ہو رہے ہیں۔ جب پیٹ کی آگ تیز ہوتی ہے اور ذرائع کم ہو جاتے ہیں تو جرائم کا پینا حیرت کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں جرائم پیشہ ہوں اور اپنی جیب بھرنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کر رہے ہوں۔ دونوں ہی وجہ ہوش میں رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان دونوں کی بابت سب کو نہیں بتاؤں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے خوشگوار انداز میں اندر قدم رکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وسیم نے چہکار بھری۔ ”جب اکیلا پن بھانے لگے۔ چاند اور چاندنی رات اچھی لگنے لگے تو ایک ہی بات دل میں سرگوشی کرتی ہے۔“ اس نے کچھ توقف کیا پھر شعر پڑھا۔

”لو چاند چھپا بدلی چھائی..... شاید کہ تمہاری یاد آئی۔“

”یاد تو آرہی ہے لیکن تمہارا اندازہ غلط ہے۔ مجھے مرشد بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے۔“ میں نے ہنس کر

جواب دیا۔

”اسے تو میں بھی شدت سے یاد کر رہا ہوں۔ پتا کر لیں اسے رہ رہ کر بچکی اٹھ رہی ہوگی۔ ایک وہی تو ظالم سماج بنا ہوا ہے ورنہ سادی کب سے دبئی جانے کا خواب دیکھ رہی ہے اور میں اس کے خواب میں رنگ بھرنے سے قاصر ہوں۔“

”تم آج ہی دبئی چلے جاؤ، میری طرف سے پوری آزادی ہے۔“ سفیر نے ہانک لگائی۔

”ہاں ہاں میں بھی اجازت دے رہا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”چلا تو جاؤ لیکن کیا کروں کہ وہاں اکیلے میں دل نہیں لگے گا، سفیر تمہارے بغیر جان نہیں سکتا اور میں سفیر اور تمہارے بغیر جان نہیں سکتا اور تم مرشد کا خاتمہ کیے بغیر جان نہیں سکتے۔ یعنی کہ ہم سب ایک الجھی ڈور کا گولا بن چکے ہیں جو سلجھ کر نہیں دیتی اور ہمیں اپنی بیویوں کی گالیاں کھاتے رہنا پڑے گا۔“ وسیم نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

”اللہ تعالیٰ شکر خورے کو دیتا ہے شکر اور موزی کو دیتا ہے ٹکر۔ اس لیے گالیاں شیریں دہن تمہاری قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مونا گالیاں دینے کے فن سے نابلد ہے۔“ سفیر نے مسکراتے ہوئے چوٹ کی۔

”یا اللہ اس صدی کے سب سے بڑے جھوٹ کی پردہ پوشی کرنا۔“ وسیم نے دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کی۔ ”ہم تو ازلی بہرے ہیں، ہمیں مونا کی گالیاں سنائی نہیں دیتیں۔“

”جسے تم گالیاں کہہ رہے ہو وہ اظہارِ محبت کا اپنا انداز ہے۔“ سفیر بولا۔

”یقیناً جب اظہارِ محبت میں مونا کو شدت پیدا کرنا ہوتی ہوگی تو وہ بیلن کو تمہاری پیٹھ پر بجا بجا کر یقین

دلاتی ہوگی۔“

”میری طرف سے اجازت ہے کہ جو جانا چاہے وہ جاسکتا ہے۔“ میں نے خوشگوار انداز میں پرانا جواب

دہرایا۔

”اور ہم سے کوئی بھی اپنی سانس یہاں رکھ کر جانیں سکتا اور ہماری سانسوں کا نام شہباز ہے یعنی کہ کوئی بھی آپ کے بغیر جائے گا نہیں۔“ وسیم نے کہا۔

”تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ ایک بہت عمدہ کام کر سکتے ہیں۔“

”کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بس اتنا سا کام کریں کہ یہاں وقت برباد نہ کر کے سیدھے پنڈی چلیں۔ وہاں پہنچ کر دیکھتے ہیں کہ

مرشد کو کیسے دام میں لایا جاسکتا ہے۔“

”لیکن ہم تو جا ہی رہے ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ نے کہا تو یہی ہے لیکن ہر روز ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس میں آپ کا کوئی قصور ہے۔ بس آپ ہر کام میں مداخلت کرنے کی روش تیاگ دیں تو شاید ہم وقت پر پہنچ جائیں۔“ وسیم نے دل میں جمع تمام باتیں ایک ہی سانس میں کہہ دیں۔

”اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔“ کہہ کر میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی پوری طرح ہمتن گوش تھا۔ میں نے اسے قریب آنے کا کہا۔ جب وہ قریب آ گیا تو میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”ناصر فریج سمجھ سکتا ہے۔ اس نے اقرار کیا ہے اس لیے کچھ دیر ہم باہر وقت گزاریں گے۔“

اچھے دوست، اللہ تعالیٰ کا انعام ہیں اور مجھے سفیر و وسیم کی شکل میں بہت ہی اچھے دوست ملے ہیں۔ میری ابرو کی شکن کا مطلب بھی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے صرف سرگوشی کی تھی اور وسیم بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے اسی وقت اونچی آواز میں کہا۔ ”اتنی لمبی چوڑی پلاننگ کی ضرورت کیا ہے۔ سیدھے سیدھے یہاں سے نکلنا ہے اور پنڈی پہنچنا ہے۔..... بس۔“ اس نے کچھ توقف کیا اور پھر کہا۔ ”اگر بند کمرے میں یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تو چلیں۔ باہر چاندنی میں بیٹھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ سفیر نے کہا اور آگے کی طرف بڑھا۔ اسے بڑھتے دیکھ میں نے بھی چٹائی چھوڑ دی اور باہر کی جانب چل پڑا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے دو بندے ریکی کرنے آئے ہوئے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آج کی رات اہم ہے۔ ہمیں سوتے ہوئے بھی جاگنا پڑے گا۔“ سفیر نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ اس کی پیشانی پر فکر کی لکیر ابھر آئی تھی۔

”بالکل۔“ میں نے کہا۔

”آپ آرام سے سو جائیں۔ میں ساری رات آنکھیں بند کیے جاگتا رہوں گا۔“

”صرف تم نہیں میں بھی جاگوں گا۔“ میں نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ مجھے جو کہنا تھا میں نے اس کا رد عمل سفیر اور وسیم کے چہروں پر دیکھ لیا تھا۔ وہ آج کی رات جاگنے پر آمادہ تھے۔ مجھے واپس مڑتے دیکھ وہ دونوں

بھی مزگئے تھے۔

دروازہ پار کر کے اندر داخل ہوتے ہی وسیم نے کہا۔ ”دوستوں صبح سویرے ہم یہاں سے نکل پڑیں گے اس لیے سب فجر کی اذان کے ساتھ اٹھ جائیں گے۔“

”ہم تیار ہیں۔“ مرتجس بولا۔ لیکن ناصر کا چہرہ جذبات سے عاری نظر آیا۔

ناصر اور امداد شاہ کے دل میں کیا ہے یہ ابھی تک ظاہر نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی شکوک کے دائرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر ہمہ وقت مرکوز رہی تھیں۔

”تو پھر آؤ۔ اب آرام کرنے لیٹ جاتے ہیں۔ فجر کے وقت نکلنا ہے اس لیے ایک نیند لے لینا ضروری ہے۔“ سفیر نے کہا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔

”آپ اور شہباز صاحب اندر سو جائیں اندر بیڈ بھی ہے۔ ہم یہاں چٹائی پر سو جائیں گے۔“ ناصر نے کہا۔

”اصل میں مجھے بیڈ پر سونا اچھا نہیں لگتا۔ بیڈ پر روئی کا گدا ہے جو مجھے پسند نہیں۔ فوم کا گدا ہوتا تو اور بات تھی۔“ میں نے کمبل کو اپنے گرد مزید لپیٹ کر جواب دیا۔

”اس علاقے میں فوم کے گدے پسند نہیں کیے جاتے۔ فوم ٹھنڈی ہوا میں مزید ٹھنڈا اور گرمی میں مزید گرم ہو جاتا ہے لیکن روئی کے گدے صرف گرمی دیتے ہیں۔“ مرتجس بولا۔

”مجھے معلوم ہے اسی لیے تو میں ہوٹل میں نہیں ٹھہرا۔“ میں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ پھر ناصر پر نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ میں نے سفیر کے برابر میں بیٹھے وسیم سے کہا۔ ”تمہیں یاد ہے نا وہ جو چورن کی پڑیا تم اور مرتجس لے کر آئے تھے وہ پراڈ میں کہاں پر رکھی ہے؟“

اتنا اشارہ کافی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں ان ہتھیاروں کی بات کر رہا ہوں جو وہ خرید کر لایا تھا اور اسے پراڈ کے مختلف حصوں میں چھپا دیا تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے بیزار لہجے میں کہا۔ ”آپ بھی نا..... ابھی لے کر آتا ہوں۔“

عبداللہ بھی میرا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے سفیر سے کہا۔ ”یار ٹو بھی اس کے ساتھ چلا جا ورنہ یہ ایک پڑیا کے لیے پورے ڈیش بورڈ کا خانہ خراب کر دے گا۔“

”یہ بات تو ہے۔“ کہتے ہوئے سفیر اٹھ کر وسیم کے پیچھے چھلا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ جب وہ دونوں لوٹیں گے تو ان کے کپڑوں میں اسلحے چھپے ہوں گے۔ اسی لیے تو سفیر کمبل کا بکل مار کر گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں واپس آئے تو وسیم کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک پڑیا تھی۔ اس نے اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لیے یہ پڑیا ایک دو گھنٹے بعد ہی کھائیں۔ تب تک ہم سو چکے ہوں گے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے پڑیا لے لی اور اسے جیب میں رکھ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس میں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ وہ خالی پڑیا ہوگی۔ پڑیا دینے کے بعد وسیم میرے کمبل میں گھس گیا کہ سردی لگ رہی ہے۔ کمبل میں آنے کے بعد اس نے ایک پستول اندر ہی اندر میری طرف بڑھا دیا جسے لے کر میں نے کمر میں اڑس لیا۔ کچھ دیر بعد وسیم کمبل سے نکل کر چلا گیا۔

مرتب جس اندر سے دری لے آیا تھا، اسے چٹائی پر بچھا کر اوپر سے چادر ڈال دی۔ امداد شاہ تکیہ اٹھا لایا۔ لیکن جب وہ لیٹنے لگا تو وسیم نے کہا۔ ”تم اندر جا کر سو جاؤ۔“

”ویری بیڈ..... وہ اگر یہاں سونا چاہتا ہے تو سونے دو۔ تم اور ناصر اندر بیڈ پر سو جاؤ۔“

میری بات اس نے فوراً سمجھ لی کہ میں ان دونوں کورات بھر خود سے دور رکھنے پر تیار نہیں۔ دونوں کے ساتھ اپنے بندے رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ان پر نظر رہے۔

ناصر شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وسیم بھی اٹھ کر بیڈ پر سونے چلا گیا۔ دروازے کے پاس سفیر لیٹا۔ پھر میں اور میرے برابر میں مرتب جس۔ آخر میں امداد شاہ۔

دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ باہر کی ٹھنڈی ہوا اندر نہ آئے۔ ارشد حسن پینٹر کے بکس سے کئی کبل نکل آئے تھے۔ سب کو ایک ایک کبل مل گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کبل کی گرمی نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے مرتب جس کے خرائے گونجے پھر ناصر شاہ کے۔ میں بس آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اندر وسیم اور دروازے پر سفیر بھی سونے کی اداکاری کر رہا ہوگا۔ وہ لوگ بھی ہوشیار ہوں گے۔ ہم وقت گزار رہے تھے۔

ہر شک کو تقویت نہیں ملتی کچھ شک بے فائدہ بھی ہوتے ہیں۔ رات کا ایک پہر بیت چکا تھا اور ہر طرف امن چین تھا۔ مجھے یقین آنے لگا کہ میرا خدشہ غلط ہے۔ اس لیے آنکھوں میں آتی ہوئی نیند کو آنے دوں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے تھکن تو تھی۔ ذہن کو سونے پر آمادہ کیا ہی تھا کہ آنکھوں میں نیند اتر آئی اور میں بے خبر ہو گیا۔

یہ میری سرشت میں شامل ہے کہ میں کتنی ہی گہری نیند میں کیوں نہ رہوں اگر ہلکا سا کھڑکا بھی محسوس ہو تو آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا اور میری آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بغیر سراٹھائے میں نے آنکھیں کھول دیں اور محسوس کرنے کی کوشش کی کہ یہ کیسی آہٹ تھی۔ پوری قوت سماعت سے سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے آواز کے مخرج کا ادراک ہو گیا اور میں نے ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ صاف پتا چل گیا تھا کہ کسی نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا ہے۔ میں نے آنکھوں کو بند کر کے ہلکی سی جھری پیدا کر لی اور دروازے پر نظریں نہا دیں۔ دروازے پر آٹومیٹک لاک لگا تھا۔ اسے چابی کے بغیر کھولنا ممکن نہیں تھا۔ اور میری سماعت اس ہلکی ہلکی آواز کو سن رہی تھی جو چابی آزمانے کی تھی۔ کوئی باہر سے کسی اوزار سے یا تار یا چابی سے تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری نظریں دروازے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ تبھی دروازے کا لاک کھلنے کی کلک سنائی دی اور میں پوری طرح ہوشیار ہو گیا۔

دروازہ ہلکے ہلکے کھل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دروازہ کھولنے والا احتیاط کے ساتھ دروازہ کھول رہا ہے۔ تھوڑا سا ایک پٹ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ نیلی روشنی میں بھی وہ مجھے اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس دور میں بھی کوئی چاقو استعمال کرتا ہے۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھا۔ اس کے داخل ہونے کے کچھ دیر بعد ایک اور شخص اندر آیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک بڑا سا تھیلا پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک کھڑے کمرے کا جائزہ لیتے رہے پھر وہ دونوں اندر کی طرف بڑھے۔ اس کمرے کی طرف جس میں ناصر سو رہا تھا۔ میں نے اپنی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وسیم کا دیا ہو وہ پستول جو کمر میں اڑس

رکھا تھا اس کے دستے پر ہاتھ جمادیا تاکہ فوراً پستول باہر لاسکوں۔

ان دونوں نے اندر والے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اندر جھانکا تبھی ہمارے کمرے کی لائٹ جل اٹھی۔ ساتھ ہی سفیر کی آواز گونجی۔ ”اپنے چاقو کو نیچے پھینک دو۔“

اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی۔ سفیر ہوشیار نہ ہوتا تو چاقو اسے زخمی کر چکا ہوتا۔ اس نے عقل مندی یہ کی تھی کہ کمبل کو آگے کی جانب پھیلا کر پکڑ لیا تھا اور ایسا اس نے اتفاقاً کیا تھا۔ وہ کمبل کو اتارنے کے لیے پھیلا رہا تھا کہ چاقو اڑتا ہوا کمبل سے ٹکرایا تھا اور اسے پھاڑتا ہوا نیچے گر گیا تھا۔ کیونکہ اس کی قوت کمبل نے روک دی تھی۔ میں نے اچھل کر بکھڑے ہوتے ہی اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے انداز نے بتا دیا تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں ہے۔ ہاں جسم میں جان ضرور تھی جس کی وجہ سے وہ میری جکڑ سے نکلنے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں چلانے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ لڑائی کے فن میں کور ہے۔ وسیم بھی پستول تانے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ پستول دیکھ کر وہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ گئے تھے۔ ان کی مزاحمت کی قوت تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ سفیر نے کمبل کے پیچھے سے کلاشکوف نکال لی تھی۔ اتنے ہتھیاروں کے سامنے وہ دونوں بے بس ہو چکے تھے۔ میں نے جس پر چھلانگ لگائی تھی وہ اب میرے نیچے دبا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سفیر نے دوسرے کو چھاپ لیا تھا۔ وہ دونوں اب اس طرح کانپ رہے تھے جیسے انہیں سردی کا بخار سرسری چڑھ گیا ہو۔ ان کی حالت دیکھ کر نہیں لگ رہا تھا کہ وہ دونوں ٹرینڈ بندے ہیں۔ وہ تو باضابطہ رونے دھونے لگے تھے۔ مرتجس ہی نہیں ناصر اور امداد شاہ بھی اٹھ گئے تھے۔ مرتجس نے ہی پلاسٹک کی ڈوری کا ایک بنڈل کہیں سے ڈھونڈ نکالا اور اسی رستی سے ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھ کر ایک کونے میں بٹھا دیا۔

ان دونوں کو قابو میں کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”اب بتاؤ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

”جی ہم خود آئے ہیں۔ ہمیں پولیس کے حوالے نہ کریں۔ اب ہم کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”دیکھو اگر تم لوگ صحیح نہیں بتاؤ گے تو خود تمہارے لیے مشکلات کھڑی ہوتی جائیں گی۔“ میں نے نرم لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”ابھی تو ٹریلر بھی شروع نہیں ہوا اور تم لوگ رونے لگے۔“ وسیم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”ابھی تو ہم تمہاری پہلے چوڑی چھیلیں گے پھر ایک ایک عضو کاٹیں گے۔“

”صاحب جی اس بار معاف کر دیں۔ اب ہم ہمیشہ کے لیے چوری سے توبہ کر لیں گے۔“ ان میں سے ایک نے روتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ چوری کے لیے آئے تھے؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔ ہم لوگ ٹورسٹوں کو اکیلا پا کر ان سے سامان چھین لیتے ہیں۔ ان کے لٹچ غائب کر دیتے ہیں، کل جب ہمیں معلوم ہوا کہ ارشد مستری نے ایک ٹورسٹ پارٹی کو اپنا مکان کرایہ پر دیا ہے تو ہم نے آپ لوگوں کے ہاں چوری کرنے کی ٹھان لی۔ ہم عرصہ سے یہی کام کرتے ہیں۔ اس علاقے کے تمام لوگ جانتے ہیں آپ ارشد حسن سے پوچھ لیں۔“

”پتا کر لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ اس تھیلے کو کیوں لے کر آئے تھے؟ کیا اس میں ہمارے سرکاٹ کر لے جانا تھے؟“ وسیم نے اس کے تھیلے کو اٹھا کر دکھاتے ہوئے پوچھا۔

”سرجی یہ تھیلا اس لیے لائے تھے کہ اس میں سامان بھر کر لے جائیں گے۔“ اس نے جواب دیا۔

ان کے انداز و اطوار بتا رہے تھے کہ وہ سچ بول رہے ہیں لیکن کسی کے بارے میں اتنی جلدی فیصلہ دیا بھی نہیں جاسکتا۔ تھیلے کی موجودگی اور ان کا انداز عکاسی کر رہا تھا کہ وہ لوگ واقعی چور ہیں اور چوری کی نیت سے گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ دو چار سوالات کے بعد میں نے کہا کہ انہیں اسی طرح بندھے رہنے دو۔ اور میں جا کر لیٹ گیا۔ لیٹنے کے بعد کہا۔ ”تم سب بھی جا کر سو جاؤ۔ صبح سوچیں گے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔“

وہ دونوں سکتے رہے اور تمام لوگ لائٹ بجھا کر اپنی اپنی جگہ جا کر لیٹ گئے۔ مجھے اس بات کی ذرا بھی فکر نہیں تھی کہ وہ لوگ فرار ہو جائیں گے۔ نیند نے بے حال کر دیا تھا اور مجھے خود پر بھروسہ بھی تھا کہ اگر دروازہ کھلا تو آہٹ سے فوراً میری آنکھ کھل جائے گی۔ یہی حال سفیر کا تھا۔ وہ بھی ہلکی سی آہٹ پر اٹھ جایا کرتا تھا پھر دروازے کے درمیان وسیم نے بستر بچھالیا تھا۔ کمرے سے نکلنے والے کو اس پر سے ہو کر گزرنا تھا۔ انہی سب باتوں کی وجہ سے میں کچھ حد تک مطمئن ہو کر سویا تھا۔ یوں بھی رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اس لیے فکر بھی نہیں تھی کہ کیا ہو گا۔

میں سو رہا تھا کہ مرتجس نے آواز دے کر مجھے اٹھایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ مجھے کچھ پریشان سا لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔“

اس وقت بھی کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ میں جواب کی امید پر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں بتایا کہ وہ دونوں فرار ہو گئے ہیں۔

”کیسے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا اس لیے کہ یہ ناممکن نہیں لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ وسیم کو پھلانگ کر گیا اور اسے خبر نہ ہوئی جب کے ہوا کی سرسراہٹ پر بھی وہ اٹھ جاتا ہے۔ پھر دروازہ کھلا تو مجھے خبر کیوں نہیں ہوئی۔ جب کہ میں ہلکے سے کھٹکے سے اٹھ جاتا ہوں۔

اس خبر کے بعد نیند کہاں آتی۔ میں نے اٹھ کر کمرے میں دیکھا۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی میں گرل نہیں تھی اس لیے کوئی بھی اس راستے سے باہر کو دیکھتا تھا۔ وہ دونوں اسی راستے سے باہر نکلے ہوں گے۔ میں نے بیڈ پر نظر ڈالی ناصر شاہ نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

انہوں نے کھڑکی کھولی اور فرار ہو گئے یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے ہاتھوں کو وسیم نے باندھا تھا اور یہ کام اس سے پہلے بھی وہ کئی بار کر چکا تھا۔ اس نے کمزور بندھن باندھنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ یقیناً اس نے بہت سنبھل کر گانٹھ لگائی ہوگی۔ ایسی گانٹھ جو آسانی سے نہ کھل سکے..... پھر بھی کھل گئی مگر کھلی کیسے؟ اس کی باندھی ہوئے گانٹھ کو جب تک کوئی کھولے نہیں کیسے کھل سکتی ہے؟

مجھے حیرت زدہ اور پریشان دیکھ کر مرتجس بولا کہ آپ فکر نہ کریں۔ وہ لوگ جہاں بھی ہوں گے صبح اس کا پتہ لگالوں گا۔ حسن پینٹر کو پتا ہوگا۔ وہ یہاں کے ہر اینٹ پتھر کو جانتا ہے۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی افسردہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”وہ فکر نہ کرے۔ وہ اتنے بھی اہم

مرجس نے جواب دیا۔ ”صاحب جی وہ بھاگے نہیں بھگائے گئے ہیں۔ اس لیے کہ میں جاگ رہا تھا جب اس کمرے سے سرگوشیاں سنائی دیں تھی۔ کسی نے ان کے ہاتھ کھولے تھے مگر وہ کون تھا اس کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔ جس نے بھی یہ کام کیا ہے وہ اذلی کمینہ ہے۔“

میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”فکر نہ کرو اگر ہمیں جلدی نہ ہوتی تو میں اسے چوہے کے بل سے بھی باہر نکال لاتا۔ لیکن ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ پنڈی پہنچنا ضروری ہے۔“

اسے اطمینان دلا کر میں واپس اپنی جگہ آ گیا۔ اب دوبارہ نیند آنے کا سوال نہ تھا پھر بھی میں سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ وسیم قریب ہی تھا اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہی ارشد حسن پینٹر کھڑا تھا۔ اس نے وسیم کو دیکھتے ہی کہا۔ ”آپ کے ہاں سے کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی ہے؟“

”چوری..... نہیں تو لیکن یہ بات تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ اس کے چہرے پر فکر کا پرتو تھا جو صاف نظر آ رہا تھا۔ ”اندر آ جائیں۔“

وہ اندر آ کر چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہ گھر ارشد حسن پینٹر کا ہے۔ اس کی ہر اینٹ جواب دہ ہے۔ ایک ایک ذرہ اس کی نگرانی کرتا ہے پھر بھی وہ دونوں ہمارے گھر میں گھسے۔ انہوں نے کیا سمجھا تھا کہ میری آنکھیں بند ہیں۔“

وہ کسی فلمی اداکار کی طرح ڈانگوں بول رہا تھا۔ گاؤں قصبوں کے لوگ ذرا ذرا سی بات میں خوش ہواٹھتے ہیں، اس کا علم بخوبی تھا۔ وہ میں سمجھ رہا تھا کہ اسے پتا لگ گیا ہے کہ کوئی ہمارے گھر میں داخل ہوا تھا اور اسے ہم نے پکڑ لیا تھا اسی لیے اب وہ خود کو ہیر و ثابت کرنے کے لیے آ گیا تھا۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے پوچھا۔ ”ہوا کیا ہے؟“

”ارے جناب! آپ لوگ تو سو رہے تھے مگر میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں اپنے مہمانوں کا خاص خیال رکھتا ہوں۔ یہ گھر آپ لوگوں کو دیا تو آپ لوگوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔“ وہ گردن اکڑا کر بول رہا تھا۔ ”رات میں میرا چھوٹا گلگت سے واپس آ رہا تھا۔ اذان سے کچھ پہلے اس نے دیکھا کہ یہ والی کھڑکی کھلی۔“ اس نے اشارے سے دوسرے کمرے کی کھڑکی دکھائی۔ ”اور اس کھڑکی سے کوئی کودا۔ وہ سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ وہ اسے روکتا کہ ایک اور شخص باہر کودا۔ وہ دو تھے اور چھوٹا اکیلا۔ اس لیے اس نے مداخلت نہ کی اور ان دونوں کا تعاقب کرنے لگا کہ وہ دونوں جاتے کہاں ہیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ سڑک پر پہنچے اور شاہ جی کے حجرے کے سامنے سے گزرے تو اس نے ان دونوں کا چہرہ دیکھ لیا۔ گھر کے باہر جولاٹ لگی ہوئی ہے اس کی روشنی میں اس نے انہیں پہچان لیا اور سیدھا گیراج پہنچا اور مجھے اٹھا کر بولا.....“

وہ پوری تقریر کرنے پر آمادہ تھا اور مجھے اس کی تمہید سے الجھن ہو رہی تھی لیکن میں اسے روکنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ معصوم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن وسیم چپ نہ رہ سکا اس نے کہا۔ ”کیا بولا..... اب وہ بھی بتا ہی دیں۔“

”وہی تو بتا رہا ہوں کہ اس نے کہا، استاد آپ کے گھر سے فیکا اور لعل کھڑکی سے باہر کودے ہیں۔ وہ

دونوں چور ہیں اور ان کا اس طرح آپ کے گھر سے نکلنا بتا رہا ہے کہ کچھ چوری کر کے نکلے ہیں۔ میں نے دو آدمیوں کو ان کے گھر بھیجا ہے وہ انہیں پکڑ کر لاتے ہی ہوں گے۔ آپ کو خبر کرنا ضروری تھا اس لیے میں بھاگتا ہوا آیا ہوں۔“

”نہیں، وہ لوگ کچھ چر کر نہیں بھاگے ہیں لیکن چوری کرنے آئے ضرور تھے۔ ہم نے پکڑ لیا تھا پھر بھی وہ لوگ فرار ہو گئے۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”پھر بھی ان کو سزا دینا ضروری ہے۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میرے گھر میں داخل ہوئے۔“ ارشد حسن پُر جوش انداز میں بولا۔

شاید اسے امید تھی کہ میں اس سے خوش ہو کر اسے کچھ اور انعام دوں گا۔ لیکن جلد ہی اس کی سوچ دم توڑ گئی جب میں نے کہا۔ ”وہ کچھ چر کر لے جانے سکا تو اسے بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ یوں بھی ہم کچھ دیر میں واپسی کے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔“

”نہ جی نہ..... میں اسے چھوڑنے والا نہیں۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میرے گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہو۔“

”یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔ اس میں ہمیں نہ گھسیٹو..... ہم اب یہاں سے جانے ہی والے ہیں۔ تمہیں جو رقم ایڈوانس دی ہے۔ وہ تمہاری ہوئی۔ اسے واپس نہیں کرنا۔“ میرا اتنا کہنا جادو جیسا کام کر گیا۔ اسے یاد آ گیا ہو گا کہ اصولی طور پر ایڈوانس کی رقم واپس بھی ہوتی ہے۔ ہم اسے مانگ نہیں رہے اس بات پر وہ خوش ہو گیا۔

”جی جناب آپ لوگ بڑے آدمی ہیں۔ ہم غریبوں پر یہ ایک احسان ہو گا۔ یوں بھی میں اپنے ہاں کام کرنے والے بچوں کو اضافی پیسے دیتا ہوں۔ اس کا رخیہ میں آپ کا بھی حصہ بن جائے گا۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

میں نے اسے جواب دینے کی بجائے وسیم سے کہا۔ ”او بھائی راستہ طویل ہے۔ تیاری کرنا شروع کر دو۔“ دراصل مجھے ارشد حسن کی مکاری پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ کچھ دیر کی واقفیت تھی پھر بھی میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ ایک مکار اور چالپوس بندہ ہے اور ایسے لوگ اپنی مطلب براری کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں اور ایسے لوگوں پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

سفیر نے میرے کہنے سے پہلے ہی سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ مرتجس بھی کام میں لگا ہوا تھا لیکن امداد شاہ اور ناصر بالکل خاموش کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے وسیم نے کہا۔ ”او بھائی ناصر، تم بھی تو ہاتھ بٹاؤ۔“

”سامان ہے ہی کتنا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں کروں تو کیا کروں؟“

”سامان سمیٹنا ہی کام نہیں کہلاتا۔ تم ایسا کرو کہ ہم سب کے لیے چائے ہی بنا لو۔“ وسیم نے بیگ کی چین بند کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی لیجئے۔“ کہہ کر وہ کچن کی طرف چلا گیا۔

چائے کا سن کر ارشد حسن کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیں۔ چائے لانے تک ہم سب پوری طرح تیار ہو چکے

تھے۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے کر میں نے ارشد حسن سے کہا۔ ”اچھا جناب، ہمیں اجازت دیں۔ اگر زندگی میں پھر کبھی ادھر آنا ہو تو آپ سے ملاقات ضرور کروں گا۔“

”جی جی۔“ اس نے چائے کا کپ لے کر کہا۔

چائے پی کر ہم سب پراڈ میں آکر بیٹھ گئے۔ اسٹیرنگ پر حسبِ معمول مرتجس تھا۔ راستے میں ہمیں ایک بائیک اور سوزو کی کیری بھی مل گئی تھی۔ اسے بھی ساتھ لینا ضروری تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”تم اور عبداللہ سوزو کی میں بیٹھ جاؤ۔“

”عبداللہ کے زخم بھرے نہیں ہیں اسے پراڈ میں ہی رہنے دیں میں سوزو کی سے آ رہا ہوں۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ کہہ کر میں نے پراڈ کا گیٹ بند کر لیا۔

ہمارا نیا سفر شروع ہو چکا تھا۔ مرتجس ہوا کی رفتار سے گاڑی بھگا رہا تھا۔ ایک تو اترائی کی طرف جاتی سڑک دوسرے ٹریفک بس نام کو، اس لیے رفتار تیز لگ رہی تھی۔

میں کھڑکی سے باہر مظاہر قدرت سے لطف لے رہا تھا۔ ایسے حسین مناظر سے منہ موڑ لینا زیادتی ہوتی۔ ابھی میں پہاڑیوں، جھاڑیوں سے اُلٹے میدانوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ چونک گیا۔ کافی نیچے پولیس کا ناظر آ یا جو ابھی کافی دور تھا۔ ویرانی سے گزرنے والی سڑک پر گاڑیاں دور سے ہی نظر آ جاتی ہیں۔ وہ لوگ پراڈ کو دیکھ کر ہوشیار ہو گئے تھے۔ انہوں نے سڑک پر پوزیشن لینا شروع کر دیا تھا۔ ہماری گاڑی کچھ دیر تک پولیس کی تحویل میں رہ چکی تھی۔ انہوں نے اس میں دو لاشیں بھی دیکھی تھیں۔ گو کہ وہ لاشیں اب انسانوں کی طرح شرافت سے بیٹھی تھیں لیکن ڈرتو باقی تھا کہ کہیں وہ گاڑی کو پہچان نہ لیں۔ ایک نظر میں بھلے ہی گاڑی پہچانی نہیں جاسکتی تھی پھر بھی دل میں ڈرتو باقی تھا۔ شاید ایسا ہی ڈر مرتجس کے دل میں بھی تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”سر آگے پولیس والوں نے نا کا لگا رکھا ہے۔ کیا ہمیں رکنا ہوگا؟“

”بالکل رکیں گے۔ اس لیے کہ ہم قانون نہیں توڑ سکتے۔ خیال رہے تم انہیں اپنا میرا تعارف نہیں کرانا۔ ورنہ وہ لوگ زبردستی چائے کے لیے روک لیں گے۔ اس لیے کہ دور سہی لیکن ایک ہوٹل نظر آ رہا ہے۔ اور وہ اس ہوٹل والے سے مفت کی بیگار لیں گے۔“ میں نے ناصر وغیرہ کو سنانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔

”جنیسا آپ کہیں۔“ مرتجس نے رفتار گھٹاتے ہوئے کہا اسپید ہلکی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر پولیس والے اشارہ کریں تو روک سکے۔

قریب پہنچنے پر پولیس والوں نے ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ مرتجس نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا۔ پراڈ کے رکتے ہی دو تین پولیس والے آڑ سے نکل کر سامنے آئے۔ نئے آنے والوں میں سے ایک کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی۔ اس لیے کہ یہ وہی آفیسر تھا جس نے پراڈ وچور کو پکڑا تھا اور اپنے ایک سپاہی کو پراڈ میں بٹھا کر چور کو تھانے لے گیا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ اس میں پہلے والی اکڑفون نہیں تھی۔ شاید وہ افسران سے جھاڑ کھا چکا تھا اور اب محتاط انداز میں تلاشی لے رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے پراڈ کو پہچان لیا تو کیا ہوگا۔ یوں تو سرسری نظر سے جائزہ لے گا مگر شک ہو گیا تو بال کی کھال نکالنے کی کوشش کرے گا اور پراڈ کے نیچے جو اسلحے ہیں وہ بھی برآمد کر لے گا۔ گو کہ جس طرح اسٹیکر سے ارشد حسن نے پراڈ کا حلیہ بدلا تھا، یہ مشکل

ہی تھا کہ وہ پہچان سکے پھر بھی ڈراپنی جگہ قائم تھا۔ میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ اس نے مرتجس سے پوچھا۔ ”گاڑی کے کاغذات ہیں؟“

مرتجس نے ڈیش بورڈ کے خانے سے کاغذات نکال کر آگے کر دیئے۔ اس نے کاغذات کا معائنہ کر کے واپس کیا اور پھر کہا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

”پنڈی۔“ اس نے جواب دیا

”کس لیے؟ کس کام سے؟“

”یہ ٹورسٹ لوگ ہیں۔ ان کو پہچانا ہے۔“ مرتجس کی بات سن کر اس نے باری باری سے اندر بیٹھے تمام افراد کا جائزہ لیا۔

”آپ لوگ کیا ٹریکنگ پر گئے تھے؟“ اس بار اس نے ڈائریکٹ مجھ سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ باتوں کے دوران پراڈو کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے بدلتے زاویہ کے ساتھ میری نگاہیں بھی زاویے بدل رہی تھیں اس لیے کہ دھڑک لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ اسٹیکر پر شک نہ کرنے لگے کہ یہ بعد میں لگی ہے۔ اسٹیکر لگ جانے کی وجہ سے کہیں سے بھی نہیں لگ رہی تھی کہ یہ وہی گاڑی ہے۔ پھر بھی دشمن کو کبھی بے وقوف نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ گاڑی کا معائنہ کرتے ہوئے پچھلی طرف چلا گیا اور ادھر سے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ ”یہ آکسیجن سلنڈر کیوں ہے؟“

سوال سنتے ہی مرتجس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ شاید اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ کھیل بگڑنے والا ہے تبھی داہنی جانب کی سیٹ پر بیٹھے سفیر نے کہا۔ ”ڈاکٹر غلام حسین نے کہا تھا کہ یہ دونوں سیلنڈر اور اسپتال میں استعمال ہونے والا کچھ سامان پنڈی میں ایک آدمی کو دینا ہے۔ وہ اسے بدل کر نیا دے گا جسے واپسی میں ساتھ لانا ہے۔“

”اوہ اچھا تو یہ سامان غلام حسین کا ہے۔ ان سے میرا سلام کہنا۔ میں گلگت آیا تو ان سے ضرور ملوں گا۔ انہوں نے میرے بچے کا علاج کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔“ انسپکٹر نے جواب دیا اور پھر سپاہیوں سے بولا۔ ”انہیں جانے دو۔“

میں نے جلدی سے سر باہر نکال کر کہا۔ ”سرجی، پیچھے والی سوزوکی جس پر پرائیک ہے وہ بھی ہماری ہے۔“ اس نے وسیم کو بھی تلاشی لیے بغیر آگے بڑھنے کا اشارہ دے دیا۔

بیرئیر ہٹ گیا اور ہم دوبارہ سے آگے بڑھنے لگے۔ پھر سے وہی راستہ تھا اور ہم تھے۔ چہار جانب ویرانہ تھا۔ سنگلاخ پہاڑیاں تھیں اور دوڑتی ہوئی پراڈو تھی۔ اس بے وجہ کی تلاشی نے موڈ بگاڑ دیا تھا۔ سفیر چہرہ شناس تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ میرے دل میں کیا کچھڑی پک رہی ہے۔ اس نے عبد اللہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یار عبد اللہ ذرا حویلی فون لگاتا۔“

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“ عبد اللہ نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے پوچھا۔

”خاص نہیں خاص الخاص..... ذرا سویرا بھابی سے بات کرنی ہے۔“ اس کی اس بات نے میرے کان کھڑے کر دیئے۔ میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کر لیا تا کہ سن سکوں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

”تم خود دیکھ کر لونا۔“ عبد اللہ نے اس کی طرف موبائل بڑھایا تھا کہ میں نے ہنستے ہوئے کہا:

”میں سب سمجھتا ہوں۔ میرا موڈ کسی اور وجہ سے بگڑا ہے۔“

میری ہنسی نے یک لخت اندر کا ماحول بدل دیا۔ سفیر بولا۔ ”اسی طرح چہرے پر شگفتگی قائم رہے تو سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہتا ہے پھر فکر کرنے سے کیا فائدہ؟“

”یہی تو میں کہتا ہوں۔ اس طرح سر جھکا کر بیٹھنا دوسروں کے مورال کو بھی ڈاؤن کرنا ہے۔“ عبداللہ

بولا۔

اس کی بات پر ناصر نے کہا۔ ”آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ ہم سے موت آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم سب پلنگ پر نکلے ہیں۔“

”بھائی میاں ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ایسے راز آشکار ہوں گے کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی تو ساتھ ہوا ہے۔ کچھ وقت گزرنے دو پھر تم بھی ہمارے رنگ میں رنگ جاؤ گے۔“ سفیر بولا۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ ناصر نے کہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے موبائل نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ کسی کا نام نہیں تھا، نمبر نظر آرہے تھے۔ میں نے موبائل کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو کون؟“

”شہباز، یہ میں ہوں۔“ ادھر سے آواز آئی تو میں بری طرح چونک گیا۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھے کال کرے گا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کو میں نے یہ نمبر نہیں دیا تھا اسے تو کچھ ہی دن پہلے لیا تھا پھر یہ نمبر اس کے پاس کیسے آ گیا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ادھر سے آواز آئی۔ ”کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو۔“

”پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ نمبر ملا کیسے؟ کس نے دیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈھونڈنے والوں کو خدا بھی مل جاتا ہے یہ تو صرف موبائل نمبر ہے جو بڑی آسانی سے کوئی بھی حاصل کر

سکتا ہے، صرف جیب میں پیسے ہونا چاہیے۔“

ادھر کی آواز نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

”بکو..... میرے پاس وقت کم ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں تو ہمیشہ ہی بکو اس کرتا ہوں۔ جاؤ میں وہ بات نہیں بتاتا جس کے لیے فون کیا ہے۔“ کسی روٹھی

ہوئی محبوبہ کی طرح اس نے کہا۔

”اب دوبارہ بکو اس کی تو یاد رکھو میرے پاس تمہارے گھر کا نمبر بھی ہے۔ میں اگر چاہوں تو ابھی تمہاری

بیوی کو فون کر کے بتا سکتا ہوں کہ اس وقت تمہارے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے اور تم دفتر کی بجائے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہو۔“

”بسم اللہ بسم اللہ..... ضرور فون کرو لیکن اطاعاً عرض ہے کہ میں اس وقت گھر پر ہوں۔ آج کورٹ میں

ہڑتال ہے اس لیے میں گیا ہی نہیں۔“ دوسری طرف سے قہقہہ کے ساتھ جواب آیا۔

”میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ اگر ہڑتال ہو بھی جائے تو تم گھر میں نہیں رہ سکتے۔ خیر جانے

دو۔ یہ بتاؤ کس لیے فون کیا ہے؟“

”یہ بتانے کے لیے کہ ایک اور کیس کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو گیا ہے۔ اب صرف دو کیس رہ گئے ہیں جن کا فیصلہ ہونا ہے۔ لیکن مرشد کا کیل حاضری لگا ہی نہیں رہا۔ جب کہ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ دونوں کیس اٹھا لے گا۔“

”تم نے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”بالکل کی تھی لیکن مرشد کے ہاں سے کوئی جواب ہی نہیں آ رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہاں بیٹھے لوگوں کو میرا نمبر دے کر کہا گیا ہے کہ اس نمبر کی کال رسیو ہی نہ کی جائے۔“
 ”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ مرشد اپنی سیاسی سرگرمیوں میں الجھا ہوا ہو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کی خانقاہ پر حملے کے بعد اس کی پارٹی نے ایک طرح سے اس سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اس لیے کہ کچھ سیکرٹریز نے پارٹی کے بھی لے لیے تھے۔ پارٹی کو بچانے کے لیے اسے کچھ دنوں کے لیے سیاست سے دور رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اگر وہ پارٹی کے کسی بھی جلسے میں نظر بھی آ گیا تو صحافی ہی نہیں حزب اختلاف بھی اس کے خلاف بولنا شروع ہو جائیں گے۔“
 ”پھر ایسی کیا بات ہو گئی کہ وہ گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گیا ہے۔“

”ویسے ایک بات بتا دوں کہ ان دنوں اس کی خانقاہ میں عام لوگوں کی آمد و رفت بھلے ہی کم ہو گئی ہو لیکن کچھ خاص لوگ وہاں برابر نظر آ رہے ہیں۔ یہ راز میرے ایک دوست نے اگلا ہے جو محکمہ خفیہ میں ہے اور اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”کال لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ شام میں تمہارے ساتھ چائے پیوں گا تو باقی باتیں بھی کر لوں گا۔ اب کال کاٹ رہا ہوں۔“

”فکر نہ کرو میں نے پیکیج لے رکھا ہے۔ اگر تم اکتا گئے ہو تو اور بات ہے۔“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
 ”لگتا ہے دوسری طرف وکیل صاحب تھے؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”ہاں وہی تھا ورنہ کسی اور سے میں اس لمحے میں بات کرتا ہوں۔“ میں نے ونڈا سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

باتوں کا سلسلہ دراز ہو رہا تھا کہ میری نظر بے اختیاری میں بیک ویو مرر پر پڑی اور میں چونک گیا۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ کافی دیر بعد کوئی ٹرک یا بس گزرتی تھی۔ زیادہ تر علاقے غیر آباد نظر آتے تھے اس لیے پیدل چلنے والے بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ سانپ کی طرح لہراتی ہوئی سڑک پر پراڈو بھاگتی جا رہی تھی۔ پیچھے بھی دور دور تک کوئی سواری نظر نہیں آرہی تھی کہ یکا یک ہی وہ سفید فور ویل ڈرائیو نظر آئی تھی جو بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ میرے چونکنے کا سبب کچھ اور تھا۔ فور ویل ڈرائیو اب بالکل قریب آ گئی تھی اسی لیے میری نظر اس کے داہنی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی نال نظر آ گئی تھی۔ نال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی آٹومینک رائفل کی تھی۔ میں نے اپنے سر کو نیچے کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”سب اپنے اپنے سر کو جھکا لیں۔“

میری آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور پراڈو کی باڈی سے کئی گولیاں

ٹکرائیں۔ میری طرف کا شیشہ چور ہو کر بکھر گیا تھا۔ کرچیاں میرے چہرے سے بھی ٹکرائیں تھیں اگر بروقت چھٹی حس اشارہ نہ دیتی تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی شکار ہو چکا ہوتا۔ یہ تو اللہ کا شکر تھا کہ ہم سب محفوظ رہے۔ تھے۔ کمال تو مرتجس کا تھا کہ اس نے سر نیچے کرنے کے بعد بھی اسٹیئرنگ پر قابو رکھا تھا ورنہ ہم کسی کھڈ میں پڑے ہوتے۔

میں نے بھاگتی ہوئی فور وھیل ڈرائیو کو دیکھا جو کافی دور جا چکی تھی۔ مرتجس نے بریک دبا کر گاڑی روک لی تھی اور پیشانی پر نمودار ہونے والے قطروں کو صاف کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت خوفزدہ ہے۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے سفیر نے کہا۔ ”مرتجس تم ہٹ جاؤ میں ڈرائیو کر لوں گا۔“

مرتجس کی حالت ہی ایسی تھی کہ اس سے ڈرائیو نہیں ہو سکتی تھی۔ موت اتنے قریب سے گزرے تو خوف کا عفریت دہلا ہی دیتا ہے۔ لیکن ناصر کے چہرے پر ایسا کچھ نہ تھا۔ وہ ایسا مطمئن تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ میری نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن میں ڈائریکٹ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ کن انھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اسی وقت میرے موبائل کی بیل بج اٹھی۔ میں نے موبائل کو جیب سے نکالا اور اسکرین پر نظر ڈالی نمبر دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں نے ٹہلنے کے انداز کے انداز میں سڑک کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ گاڑی سے کافی فاصلے پر آ کر میں نے کال ریسیو کی۔ موبائل کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو!“

”شہباز کیسے ہو..... کافی دن بعد بات کر رہا ہوں اس لیے حال احوال پوچھنا ضروری سمجھا۔“ دوسری طرف سے آتی مکروہ آواز نے میرے اندر نفرت کی تیز لہر اٹھادی تھی۔

”اصل مدد کی طرف آؤ..... کس لیے فون کیا۔ اس لیے کہ میری طرف سے بات کرنے کے لیے میں نے اپنے وکیل کو نامزد کر رکھا ہے۔“ میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

”میں جب کسی کو تحفہ دیتا ہوں تو اس سے پوچھتا ضرور ہوں کہ میرا تحفہ کیسا لگا؟“

”تحفہ کیسا تحفہ؟“ میں نے لہجے کو حیرت بھرا بنانے کی کوشش کی۔

”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اپنے دشمنوں کو بھول جاتا ہوں..... نہیں، کبھی نہیں..... تم تو میرے سب سے بڑے دشمن ہو۔ تمہیں کیسے بھلا دوں۔ جیسے ہی تمہارے بارے میں میرے ایک دوست نے خبر دی میں نے تم پر نظریں جمادیں۔ تم پر میری نظریں گلگت سے ہیں۔“

”واہ بہت خوب..... خانقاہ کی تباہی کے بعد تم نے ٹیم دوبارہ سے تشکیل دے دی ہے۔ کیا سیاست سے کنارہ کشی کرنے والے ہو۔“

”سو فیصد..... سیاست میں کیا رکھا ہے۔ اب میرے پاس سیاست سے زیادہ پاور ہے۔“

”اچھا..... تب تو تم سے مجھے ڈر جانا چاہیے۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”بالکل ڈر اس وقت سے جب میرا عتاب تمہیں تباہ کر دے اور وہ وقت جلد آنے والا ہے۔ اس کا ٹریلر تم نے دیکھ ہی لیا۔ اگر راتقل کی نال تھوڑی سی اونچی رکھنے کا حکم دے دیتا تو ابھی تم برف خانے میں پڑے ہوتے۔“

”اچھا تو یہ فائرنگ تمہارے گروں نے کی ہے۔“

”پنڈی آنے کا انعام ہے یہ۔ ہم اسی طرح استقبال کرتے ہیں۔ پنڈی پہنچتے ہی اس سے بھی شاندار طریقے سے میں استقبال کروں گا۔ آؤ تو سہی۔“

”اور اتنے سال سے تم کیا کرتے رہے؟“

”اس وقت تک میرے پاس صحیح قوت نہیں آئی تھی۔ اب میں اتنا قوی ہوں کہ تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔“

”ماشا اللہ..... گویا تم فرعون سے بھی زیادہ قوی بن گئے ہو لیکن یہ بھول رہے ہو کہ، ہر فرعون راموسیٰ است۔“

”میری قوت کا اندازہ پنڈی پہنچ کر ہو گا۔ آؤ تو سہی۔“

”بالکل آ رہا ہوں۔ تم استقبال کی تیاری کر لو۔“

”ہاں یہ بتا دوں تمہارے ساتھ میرے دو کتے ہیں جو میری پھینکی ہوئی ہڈی کھاتے رہے ہیں۔ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس بات کا خیال رکھنا۔ کافی طویل گفتگو ہوئی، باقی باتیں اس وقت ہوں گی جب تم میرے قدموں میں بیٹھے ہو گے۔“ اس نے کہہ کر کال آف کر دی۔

میں اسی جگہ کھڑا فکر میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے امید نہ تھی کہ مرشد اتنا طاقتور بن جائے گا۔ پہلے تو ڈیوڈ شا کے بل پر کود رہا تھا۔ اب اسے کس کا سہارا مل گیا جو ڈیوڈ شا سے بھی زیادہ قوی ہے۔ اس نے نیٹ ورک اتنا کیسے پھیلا لیا کہ گلگت تک اس کے آدمی پھیل گئے ہیں۔ ناصر اور امداد شاہ کی باتوں سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ صرف وہی دونوں اس کے کسی کام سے گلگت آئے تھے لیکن اب اندازہ ہو رہا ہے کہ اس نے یہاں پنچے گاڑ رکھے ہیں۔ وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس بات نے فکر میں ڈال دیا تھا۔ ہماری پوری ٹیم ایک ہی گاڑی میں ہے۔ اگر اس نے بھرپور حملہ کر دیا تو.....؟ اس تو کا جواب سوچ نہیں رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔ کیا سوچ رہے ہیں۔“ سفیر نے آواز دی تو میرے خیالات کا گرداب تھا۔ میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا۔ سفیر کی آواز نے مرتجس کو بھی چونکا دیا تھا۔ اتنی دیر میں اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ سفیر کو میری طرف بڑھتے دیکھ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور میری طرف آنے لگا۔ اسے آتے دیکھ میں منحصر میں پڑ گیا اس لیے کہ اس کے سامنے میں سفیر سے کوئی بات کر نہیں سکتا تھا۔ موبائل میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے جلدی جلدی ایک چھوٹا سا منبج بنایا کہ وہ مرتجس کو روکے۔ اور اسے میں نے وسیم کے موبائل پر سینڈ کر دیا۔ میری نظریں وسیم پر تھیں۔ وہ پراڈ کے قریب کھڑا گولیوں کے نشان کو چھپانے کے لیے اسٹیکر کی جگہ تبدیل کر رہا تھا۔ موبائل پر پیپ ہوتے ہی اس نے موبائل نکال کر دیکھا پھر وہیں سے آواز دی۔ ”مرتجس..... بات سنو۔“

مرتجس آگے بڑھتے ہوئے رک گیا۔ اس نے سر موڑ کر پیچھے دیکھا اور پھر وسیم کے اشارے پر اس کی جانب مڑ گیا۔ لیکن سفیر آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ میرے قریب پہنچ گیا تو میں نے کہا۔ ”ابھی ابھی مرشد کی کال آئی تھی۔ یہ حملہ اس کے گروں نے کیا ہے۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے کس دشمن نے ایسی حرکت کی۔ صرف گولیاں چلائیں اور بھاگ

لیے۔“ سفیر نے جواب میں کہا۔

”ہمیں دہلانے کے لیے ایسی حرکت کی ہے۔ مرشد کا کہنا تھا کہ شوٹر کو کہہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف خوفزدہ کر کے فرار ہو جائے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”مرشد کا کہنا ہے کہ وہ شروع سے ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس نے ہوا میں تیر چلایا ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ان لوگوں نے خبر دی ہو جنہیں ہم بے ہوش چھوڑ آئے ہیں۔ امداد شاہ کے غائب ہونے کی خبر دیتے وقت انہوں نے بتا دیا ہو کہ یہ کام شہباز کا ہے۔ وہ سب کے سب گلگت کے نہ ہوں ان میں سے کوئی ایک مرشد کا خاص آدمی ہو جو مجھے پہچانتا ہو لیکن اس وقت منہ سے پھوٹا نہ ہو۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بات کچھ بھی ہو میں نے سوچا ہے کہ پروگرام میں کچھ تبدیلی کر لوں۔“

”کیسی تبدیلی؟“

”تم پراڈ میں رہو گے اور تمہارے ساتھ امداد شاہ اور ناصر ہوں گے۔ تمہارے کچھ پیچھے وسم سوزو کی میں عبداللہ اور مرتجس کے ساتھ رہے گا، کچھ فاصلے سے کوردینے کے لیے۔ میں پبلک ٹرانسپورٹ سے آ جاؤں گا۔ اس طرح ہم سب الگ الگ ہوں گے تو اسے گھیرنے میں دشواری ہوگی۔“

”اگر آپ الگ سفر کرنے پر بضد ہیں تو ایسا کریں کہ بایک اتار لیں۔ بایک سے سفر اچھا گزرے گا۔“

سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے یہ مشورہ مذاق میں دیا تھا۔ اس لیے کہ بایک پر طویل سفر آسان نہیں ہے۔ ایسی بایک پر تو بالکل ہی نہیں لیکن میں نے کچھ سوچ کر کہا:

”ہاں بایک بہتر رہے گی اس لیے کہ بایک کے مسافر کو لوگ نزدیکی علاقے کا سمجھتے ہیں اور پھر جہاں چاہا اسے پارک کر دیا۔“

”شہباز صاحب عقل سے کام لیں۔ یہ کوئی کلو دو کلومیٹر کا سفر نہیں ہے۔ اتنا طویل سفر بایک پر کوئی صحیح العقل آدمی کر نہیں سکتا۔“

”جو کوئی نہیں کرتا وہ میں کرتا ہوں..... میں کچھ سوچ کر یہ رسک لے رہا ہوں۔ یوں سمجھو کہ میں دونوں گاڑیوں کو کور دوں گا۔ جیسے ہی خطرہ محسوس کروں گا تو میں مس کال دوں گا اور تم لوگ الرٹ ہو جانا۔“

’جب آپ ضد پر اتر آئے ہیں تو بایک اتر دلیجئے۔“

”جاؤ اتر دلو اور ان سب سے کہنا کہ شہباز کو ایک کام کی وجہ سے رکنا پڑ رہا ہے۔ وسم کے لیے کہنا کہ اسے راستے میں ایک کام کے لیے رکنا ہے اسی لیے وہ سوزو کی لے جا رہا ہے۔ لیکن سب ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔“

سفیر نے بایک اتار دی۔ مرتجس نے لاکھ کوشش کی کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ لے لوں تاکہ زبان کا مسئلہ آڈے نہ آئے لیکن میں نے اسے منع کر دیا کہ بس ایک دو دن کا معاملہ ہے میں جلد آملوں گا۔“

سفیر نے فوراً ہی اپنی گاڑی بڑھادی۔ جب وہ لوگ کافی دور نکل گئے تب میں نے اپنا سفر شروع کیا۔ اگر کوئی سن لیتا کہ میں بایک پر چلاس سے پنڈی جا رہا ہوں تو تعجب کا اظہار ضرور کرتا۔ لیکن میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا صرف اس لیے کہ میرے ساتھی محفوظ رہیں۔ وہ جلد سے جلد پنڈی پہنچ جائیں۔ اور اگر راستے میں وہ کسی دشواری کا سامنا کرتے ہیں تو میں ان کو با آسانی کوردے دوں گا۔ اسی خیال سے میں بایک پر تھا۔

ویران سڑک صرف آتی جاتی گاڑیاں ایسے میں بایک کا سفر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا مگر میں بایک دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ کافی دور آچکا تھا۔ پراڈو اور سوزوکی کافی آگے نکل چکی تھیں اور اب نظر بھی نہیں آرہی تھیں۔ چلاس بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ دھوپ کی تپش میں بایک کا سفر ایک عذاب بن گیا تھا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ خواہ مخواہ بایک کی ہامی بھری۔ اگر میں نے اکیلے سفر کا سوچ ہی لیا تھا تو مجھے سوزوکی لینے چاہیے تھی ورنہ پیٹھ ایسی اڑتی تو نہیں۔ اسی سوچ میں کافی سفر طے کر لیا تھا کہ احساس ہوا جیسے انجن میں کوئی خرابی آرہی ہے اس لیے کے بایک کی آواز بدل رہی تھی۔ تبھی مجھے ایک چھپر ہوٹل نظر آیا اور میں نے وہاں رک کر کچھ دیر سستا لینے کی ٹھانی۔ اگر انجن گرم ہو جانے کی وجہ سے ایسی آواز آرہی ہے تو وہ خود ٹھیک ہو جائے گی۔

ہوٹل میں قطار در قطار بہت سی چارپایاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پر میں بیٹھ گیا۔ وہ چارپائی نیم کے پیڑ تلے بچھی تھی۔ نیم کا پیڑ یوں بھی ٹھنڈک دیتا ہے اس کا پرانا ہونا سونے پر سہاگہ ہے۔ دھوپ کی شدت کو ایک لمحے میں نیم ٹھنڈک میں بدل دیتا ہے۔ میں نے چارپائی پر لیٹ کر اس بچے کی طرف دیکھا جو مجھے دیکھتے ہی بھاگا ہوا آیا تھا تاکہ آرڈر لے سکے۔

”کھانا کھا کر چلا ہوں اس لیے صرف چائے مل جائے گی۔“ میں نے پوچھا۔

”باد اس وقت چائے کہاں سے ملے گی اگر کہو تو تیار کرادوں۔“ بچے نے کہا اور اس انداز میں میری طرف دیکھنے لگا جیسے اسے امید ہو کہ میں اس کی بات کی تائید میں آرڈر ضرور دوں گا۔ یہ ہوٹلوں گیراج اور دیگر جگہوں پر کام کر کے اپنا پچپنا گنوا دینے والے بچے دراصل اپنے گھر کے لیے بڑے ہوتے ہیں۔ پورے گھر کا بوجھ اٹھانے والوں میں شامل ہوتے ہیں۔ قانونی طور پر چھوٹے بچوں سے کام لینا جرم ہے اور یہ جرم ہمارے ہاں عام ہے۔ میں دل سے اسے پسند نہیں کرتا۔ انسانیت کی اس تذلیل کو کون پسند کر سکتا ہے لیکن میں اسے مجبوری کی دلیل بھی کہتا ہوں اسی لیے ایسے بچوں کو ٹپ دینے میں، میں کبھی پیچھے نہیں رہا اسی لیے میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

”ہاں بنوادو لیکن ذرا جلدی کرنا۔“

بچہ آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بایک کا سفر ایسے ہی جوڑ جوڑ کو ہلا دیتا ہے۔ اس پر مرشد کی فکر الگ۔ مرشد کا نام ذہن میں آتے ہی میں نے سفیر سے بات کرنا چاہی اور موبائل نکال لیا۔ اسکرین پر نظر پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ سگنل کا کوئی پتا نہیں تھا۔ چلاس میں تو موبائل کام کر رہا تھا لیکن اب یہاں کسی کام کا نہ رہا۔ معمولی سا ڈبہ بن کر رہ گیا تھا جس پر گیم کھیلا جاسکتا تھا یا پھر ٹائم دیکھا جاسکتا تھا اس لیے میں نے موبائل کو دوبارہ سے جیب میں رکھ لیا اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے آرام سے راحت ملے گی یہی سوچ کر میں لینا تھا کہ بچے نے آکر اٹھا دیا۔

”صاحب جی چائے۔“ اس آواز پر میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی میں چائے کا سپ لے رہا تھا کہ ایک ہائی روف آکر رکی اور اس سے تین آدمی اترے۔ ان پر سرسری نظر ڈال کر میں نے چائے کا دوسرا سپ لیا۔ چائے کیا تھی۔ ایسا لگ رہا تھا دودھ کو گاڑھے محلول میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور شکر اتنی تھی کہ اس سے مزید دو کپ چائے بن جاتی۔ حلق تک میٹھا ہوا جا رہا تھا۔ جیسے تیسے میں نے چائے حلق میں انڈیلی اور دوبارہ سے آنکھیں بند کر لی۔ کافی دیر تک اسی پہلو لیٹا رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ اگر وقت یہیں گزار دیا تو ناراض پنہنچتے پنہنچتے رات کا پہلا پہر شروع ہو جائے گا اس لیے چل دینا چاہیے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تبھی میری نظر نئے آنے والوں پر پڑی۔ وہ لوگ کھانا آنے کے انتظار میں بیٹھے تھے لیکن ان کی نظریں ایسے گردش کر رہی تھیں جیسے وہ پورے ہوٹل کا سروے کر رہے ہوں۔ مجھے اٹھتے دیکھ وہ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ یہ کوئی عجیب بات تو نہیں تھی۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ غیر آباد علاقے میں کوئی انسان نظر آجائے تو وہ اسے بغور دیکھتے ہیں۔ یہاں بھی میرے علاوہ دو تین آدمی ہی تھے اس لیے اگر وہ میری طرف دیکھ رہے تھے تو تعجب کی بات کیا تھی اس لیے میں نے توجہ نہ دی اور بچے کو اشارے سے بلا کر سوکانوٹ دیا اور بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

میرا سفر دوبارہ سے شروع ہو گیا تھا۔ قراقرم ہائی وے کی ویرانی ہمرکاب تھی۔ سڑک تقریباً ویران تھی۔ کافی دیر دیر بعد کوئی گاڑی گزرتی تھی۔ ایسے سنان سڑک پر ڈرائیو کا اپنا مزہ ہے۔ میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہوٹل سے نکلے دو گھنٹے سے زائد ہو چکا تھا۔ اب شام اترنے لگی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ نازان سے پہلے رکنا نہیں ہے۔ اسپڈ بھی بڑھا دی تھی۔ آتی جاتی گاڑیوں سے زیادہ دشواری بھی نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹ کچھ پریشان ضرور کرتی لیکن ایسی باتوں پر میں توجہ نہیں دیتا۔ کیونکہ کافی دیر دیر بعد یہ گاڑیاں پریشان کرتی تھیں اس لیے سامنے سے آتی گاڑی کو دیکھ کر میں اسپڈ سلو کر لیتا تھا۔

اب میں کافی آگے آچکا تھا۔ ناراض زیادہ دور نہیں رہا تھا۔ قریب آتا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میرے آگے تک پہنچنے لگی۔ میں نے بائیک کو مزید کنارے کر لیا تھا۔ میری پوری توجہ سامنے کی طرف تھی۔ انسان ہوں، قدرت سے ٹکرا نہیں سکتا۔ انسان سانس نہ لے تو مر جائے لیکن جو سانس لیتا ہے اسے اپنے پیپڑے میں رکھ نہیں سکتا۔ خارج کرنا ہی پڑتا ہے۔ انسانی ضرورت کے تحت میں نے بائیک روک لی مگر زیادہ دور گیا نہیں۔ وہیں سڑک کنارے بیٹھ گیا تھا کہ جس گاڑی کی ہیڈ لائٹ نظر آئی تھی وہ قریب آگئی۔ تب میں نے دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ یہ وہی ہائی روف تھی جو مجھے ہوٹل پر نظر آئی تھی۔ وہ ہائی روف برابر سے گزرتی ہوئی کچھ آگے گئی اور پھر رک گئی۔

اسے رکتے دیکھ میں کھڑا ہو گیا۔ یوں بھی کھڑا ہونا ہی تھا کہ واپس بائیک تک بھی آتا تھا۔ تبھی ہائی روف کا دروازہ کھلا اور ایک بندہ باہر آیا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میں نے توجہ نہیں دی کیونکہ ایسی شارع پر اگر گاڑی خراب ہو جائے تو لوگ رک کر پوچھ لیتے ہیں کہ مدد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ایسا ہی کوئی سوال کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوا بائیک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اسی وقت گاڑی سے ایک اور بندہ اتر اور تیز قدموں سے میری طرف بڑھنے لگا۔ اتنی دیر میں دوسرا بندہ میرے بالکل قریب آ گیا

تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا بایک خراب ہو گئی ہے؟“

”نہیں..... وہ میں ضرورت کے تحت اتر تھا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ کہتے ہوئے وہ بندہ جو بعد میں ہائی روف سے اتر تھا میرے بالکل قریب آ گیا۔

”آپ اتنا لمبا سفر بایک پر کریں گے۔ یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔“ اس نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے الجھے انداز میں کہا۔

”باؤ، پنڈی کوئی یہاں تو ہے نہیں۔ اتنی دور کا سفر اور معمولی سی کھٹارا بایک۔ مر جاؤ گے صاحب۔ اتنا لمبا

سفر بایک پر آسان نہیں۔“

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں پنڈی جا رہا ہوں۔“ میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا لیکن ذہن پوری

طرح بیدار ہو چکا تھا۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

”یہ جیدا تو ایسے ہی بکواس کرتا ہے۔ لیکن میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ میری گاڑی میں آجائیں۔

جہاں کہیں گے اتار دوں گا۔ بایک یہ جیدا لے آئے گا۔“ نئے آنے والے نے کہا۔

”شکر یہ میں بایک پر ہی ٹھیک ہوں۔“ کہتے ہوئے میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس نے یہ جملہ کیوں کہا کہ

آپ اتنا لمبا سفر بایک پر کریں گے۔ اسے کیا پتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

”آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ آپ لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ بات صاف ہے،

آگے ناران ہے۔ راستے میں کوئی گاؤں بھی نہیں ہے۔ یعنی کہ آپ ناران یا اس سے آگے جائیں گے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے۔“

”تو پھر دیر کس بات کی۔ چلیں ہائی روف میں اتنی جگہ ضرور ہے کہ ایک آدمی اور بیٹھ جائے۔“

”جی ہاں مجھے اندازہ ہے کہ تین آدمیوں کے بیٹھنے کے بعد بھی اتنی جگہ ہوتی ہے کہ چوتھا آدمی بیٹھ سکے

لیکن میں اپنی بایک کو ہی پسند کروں گا۔“ میں نے دونوں آدمیوں کے بیٹھنے کے بعد بھی اتنی جگہ ہوتی ہے کہ چوتھا آدمی بیٹھ سکے

پچھلے حصے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آخری الفاظ جو میں نے سنے تھے وہ یہ تھے۔ ”ہمارے رہتے آپ اسکوٹر پر کیوں

جائیں گے۔ ابھی تو آپ کی خاطر داری بھی کرنی ہے۔“ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں اس لیے کہ ذہن پر اندھیرا

سا جھاتا چلا گیا تھا۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک بیڈ پر لیٹے ہوئے پایا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا صرف میں تھا۔

لیکن میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنے پیروں کو دیکھا۔ وہ آزاد تھے۔ اب میں

نے سر گھما کر دیکھا تو کمر کسی عاشق کے دل کی طرح خالی تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ہاتھوں کو ہلایا تا کہ رسی

کی مضبوطی کا اندازہ کر سکوں۔ جس نے بھی گانٹھ لگائی تھی مضبوطی کا خاص خیال رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ کو آگے

پچھے کرنا شروع کر دیا تا کہ رسی کچھ تو ڈھیلی پڑے۔

ابھی میں ہاتھوں کو ہلایا رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور مجھے لانے والے وہ تینوں بندے اندر آئے۔ اندر آتے

ہیں ان میں سے ایک نے کہا۔ ”کیوں شہزادے کیسا لگ رہا ہے..... ویسے فکر نہ کرو ہم بہت اچھے میزبان ہیں۔

اپنے مہمانوں کی خاطر داری خوب کرتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں..... مجھے کیوں لائے ہو۔“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔

”کیوں لایا گیا ہے یہ تو مجھے بھی پتا نہیں بس ہمیں حکم دیا گیا اور ہم بھاگتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا جیسے وہ میرا جگری دوست ہو۔ ”ویسے میں تعارف کرا دوں..... یہ جیدا ہے۔“ اس نے مونچھ والے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ ”یہ ہاتھ پیروں کے جوڑ کھولنے کا ماہر مانا جاتا ہے۔ اور یہ چاقو سے چرکا لگا کر گونگے سے بھی پیٹ کی بات اگلا لیتا ہے۔“ پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا۔ ”مجھے لوگ آصف کہتے ہیں اور میں دانت اکھاڑنے کا کام کرتا ہوں۔“

”لیکن یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو۔ میں تو تم لوگوں کو پہچانتا بھی نہیں ہوں۔“ میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ میرے بہت قریب آ گیا اور پھر میرے بال کو مٹھی میں پکڑ کر بولا:

”ابھی پہچان جاؤ گے۔ بس مجھے فون کا انتظار ہے کہ تمہیں سزا دینے کے لیے کون سی جگہ مقرر کی گئی ہے۔

یہاں تمہاری خاطر داری ہوگی یا پنڈی میں۔“

”مجھے اس طرح بے ہوش کر کے لانے کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ میں وہ وجہ سننا چاہتا ہوں۔“ بال کھینچنے سے جو تکلیف ہو رہی تھی اس تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا۔

”فکر کیوں کرتے ہو کچھ ہی دیر میں علم ہو جائے گا کہ تمہیں کیوں سزا دی جائے گی۔ بس فون آنے کی دیر ہے۔“ وہ ایسے بول رہا تھا جیسے ہم کسی ہوٹل یا اپنے ڈرائیونگ روم میں بیٹھے فرینڈلی ٹاک میں مصروف ہیں۔

”دیکھو بھائی..... پتا نہیں تم کس کے دھوکے میں مجھے اٹھا لائے ہو۔ بس اتنا کرم کر دو، میرے ہاتھ میں خون کی روانی رک رہی ہے۔ پلیز ہاتھ ہی کھول دو تب تک فون بھی آ جائے گا اور وہ خود کہیں گے کہ میں بے قصور آدمی ہوں۔“ میں نے اپنے لہجے کو التجائیہ بنا لیا تھا۔

”بات تو صحیح ہے کہ ہم سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہم جانتے ہیں کہ تم کون ہو۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم تیزی سے نارائن سے نکلیں اور قراقرم روڈ پر جو بندہ ادھر بائیک سے آرہا ہے اسے اغوا کر کے کسی محفوظ جگہ رکھ دیا جائے۔ فیصلہ پنڈی والے کریں گے۔“ اس نے میرے بالوں کو چھوڑ کر کہا۔ ”فی الحال ایسا کرتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ کو کھول دیتے ہیں۔ اس طرح تمہاری شکایت کا ازالہ ہو جائے گا۔“ پھر اس نے میرے ہاتھوں کو بندھن سے آزاد کر دیا۔

ناکیلون کی رسی کو اتنی سختی سے باندھا گیا تھا کہ واقعی میرے ہاتھوں میں خون کی گردش رکنے لگی تھی۔ ایک تو پہلے ہی وہ ہاتھ کمزور تھا۔ حکیم قابوس کے علاج سے کچھ صحیح تو ہوا تھا لیکن خون کا دوران رکتا تو پریشانی پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے ہاتھوں کی دونوں کلائیوں کو گول گول گردش دینا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ خون کی روانی بحال ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ میری نظریں ان تینوں کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لوگ غلط کام میں مشغول ضرور ہیں لیکن فطرتاً غلط نہیں ہیں۔ شاید پڑھے لکھے ہیں یعنی جو بات کر رہا تھا وہ تعلیم یافتہ لگ رہا تھا اسی وجہ سے اتنی شائستگی سے پیش آرہا ہے۔ ان میں سے ایک جس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں اس کی کمر میں اڑسا ہوا پستول مجھے نظر آ گیا تھا۔ اب وہ پستول میرے قبضہ میں کیسے آئے میں اسی بابت سوچ رہا تھا۔ ابھی میں پستول حاصل کرنے کا طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بج اٹھی اور وہ فون سننے

لگا۔ دوسری طرف کی بات سن کر بولا۔ ”یس سر میں اسے اپنے ساتھ لے کر آ رہا ہوں۔“
فون بند کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ ”واہ بھائی تم تو بڑی چیز ہو۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں باندھ کر لایا جائے۔“

”بھائی ایسا ظلم تو نہ کرو۔ باندھ کر لے جانا کیا ضروری ہے؟“
”ہمیں کہا گیا ہے کہ آپ بڑی اونچی چیز ہیں۔ کسی وقت بھی پینتر ابدل کر بازی الٹ سکتے ہیں۔“
”بھائی کون ایسی بات کہہ رہا ہے، کون حکم دے رہا ہے اور مجھے کہاں لے جانا ہے، کچھ تو بتاؤ۔“ میں معصوم بنا سوالات پر سوالات کیے جا رہا تھا۔

”تم سائیں بادشاہ کے مہمان ہو۔ صبح کی چائے تم مرشد سائیں کے ساتھ پیو گے۔“ اس نے سانس لے کر کہا۔ ”وقت کم ہے اس لیے ہم ابھی نکل پڑیں گے۔“

”اسی ہائی روف پر چلنا ہے؟“ میں نے ایسے کہا جیسے میں راضی ہو گیا ہوں۔
”نہیں ٹرک پر۔ لیکن تم ٹرک پر نہیں ٹب میں جاؤ گے تاکہ اگر کہیں چیکنگ ہو تو گزرنے نہ کر دو۔“
”ٹب میں..... میں سمجھا نہیں؟“ کہتے ہوئے میں نے غیر محسوس انداز میں اپنے پیر کو بھی کھول لیا۔
باتوں کے درمیان میں ایسے بندھن کھول رہا تھا جیسے غیر ارادی طور پر ایسا کر رہا ہوں۔

”ہم جسے یہاں سے لے جاتے ہیں اس کے لیے ایک بڑا سائب استعمال کرتے ہیں۔ اس ٹب میں بندے کو بے ہوش کر کے لٹا دیتے ہیں اور ٹب کو ٹرک کے نیچے باندھ دیتے ہیں۔ جھولتے ہوئے، دنیا دما فیہا سے بے خبر وہ پہنچ جاتا ہے۔ راستے میں چیکنگ ہوتی بھی ہے تو کوئی ٹرک کے نیچے جھانکتا نہیں ہے۔ اگر جھانک بھی لے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ ٹب ٹرک کا حصہ ہے یا الگ سے لگایا گیا ہے اس لیے تمام کام خوش اصولوں سے طے پا جاتا ہے۔“

”تو پھر میں ایسا کرتا ہوں۔“ کہتے ہوئے میں نے ایک ایسی حرکت کی کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ بیٹھے بیٹھے، پنی جگہ سے اچھلا تھا اور تقریباً اڑتا ہوا مونچھ والے پر جا پڑا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی مگر میرے ہاتھ نے کمال دکھا دیا تھا۔ اس کی کمر میں اڑسا ہوا پستول میرے ہاتھ میں آتے ہی میں نے دوبارہ سے اچھال بھری تھی اور دروازے کے نزدیک جا کھڑا ہوا تھا۔

میری اس حرکت نے ان تینوں کو بوکھلا دیا تھا۔ وہ ایک ساتھ میری طرف دوڑے تھے۔ ان کی اس اضطراری حرکت نے بتا دیا تھا کہ وہ ٹرینڈ نہیں ہیں۔ لڑائی بھڑائی کے جواہم نکات ہوتے ہیں وہ بھی انہیں معلوم نہیں اسی لیے وہ سب ایک ساتھ میری طرف دوڑے تھے۔ اور یہی ان کی غلطی تھی۔ میں نے دوبارہ سے اچھال بھری اور ان پر جا پڑا۔ وہ تینوں اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک ساتھ زمیں بوس ہوئے اور ان پر میں سوار تھا۔ لیکن میں نے گرتے ہی دوبارہ اچھال بھری تھی اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا ساتھ ہی ساتھ اچھل کر دور چلا گیا تھا۔

جس کی گردن پر میرا ہاتھ لگا تھا وہ اپنی گردن تھامے ہوئے تھا اور جس کو لات لگی تھی وہ الگ پڑا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اتنی دیر سے وہ شریف بنے ہوئے تھے۔ زبان میں شائستگی کی مٹھاس

لیے ہوئے تھے لیکن ایک ہی وار نے ان کی شائستگی کو ہوا میں اڑا دیا تھا۔ وہ تینوں گالیاں بکتے ہوئے میری طرف دوڑے تھے۔ میں نے ان کو موقع دیا اور جیسے ہی وہ نزدیک پہنچے میں نے ہوا میں اچھال بھری اور ان کے پیچھے پہنچ گیا۔ شاید یہ سب ان کے لیے نیا تھا کیونکہ ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا تھا۔ ”ابے کیا پرندے کی اولاد ہے۔“

میں نے دوبارہ کھڑکی طرف اچھال بھرتے ہوئے کہا۔ ”باز ہوں میں..... شہباز ہے میرا نام، صرف میرے جسم میں ہاتھ لگا دو تو میں مان لوں گا۔“

ان سے کھیلتے ہوئے مجھے مزہ آرہا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود کو کوئی اونچی چیز سمجھ رہے تھے اسی لیے اتنی دیر تک بکواس کرتے رہے تھے۔ اب ان کو اپنے مقام کا تعین ہو گیا ہو گا۔ تبھی ان میں سے ایک نے کہا۔ ”یہ ہاتھوں سے پکڑائے گا نہیں۔ فار کر۔“

فار کا نام سنتے ہی میں نے دروازے کی جانب اچھال بھری اور ان کے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا عین دروازے کے پتوں بچ پہنچا۔ زمین پر قدم نکائے اور چیخ کر کہا۔ ”اچھا دوستو ورزش کرانے کا شکریہ۔ میں تو چلا۔“

اتنا کہہ کر میں نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی ساتھ ہی ساتھ ایک فار بھی کر دیا تھا تا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اندر رکے رہیں اور مجھے موقع مل جائے۔ باہر اندھیرا اترنے لگا تھا۔ میں نے باہر آ کر ادھر ادھر دیکھا۔ دور و نزدیک کوئی عمارت یا مکان نہیں تھا۔ ویرانے میں یہ اکلوتا مکان تھا۔ شاید یہ اوطاق کے قسم کی کوئی چیز تھی۔ رکنا خود کو پریشانی میں ڈالنا تھا۔ اس لیے میں ناک کی سیدھ میں دوڑتا چلا گیا تھا۔ یہ بھی نہیں دیکھ رہا تھا کہ میں جا کہاں رہا ہوں۔

ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ میری نظر ایک گاڑی پر پڑی۔ وہ کچھ دور تھی اور اس کا رخ اسی مکان کی طرف تھا۔ وہ تیزی سے آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر میری چھٹی حس نے خطرے کا سگنل دیا۔ یقیناً وہ گاڑی اسی مکان کی طرف جارہی ہے تو اس میں دشمن ہی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کسی نے کال کر کے مدد مانگی ہو۔ لیکن اتنی جلدی مدد کیسے آگئی، یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں دوڑتا ہی رہا۔ میرا رخ اس طرف تھا جہاں بہت سارے پیڑ نظر آرہے تھے۔ شاید وہاں سے جنگل شروع ہو رہا تھا یا پھر وہ کوئی گھاٹی تھی۔ وادی تھی۔ ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا اور دور کی چیزیں بھی آسانی سے نظر آ جا رہی تھیں۔

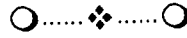
میں پاگلوں کی طرح ادھر بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ گاڑی اسی مکان کے سامنے رک گئی تھی۔ تبھی اندر سے دوڑ کر کوئی نکلا تھا اور گاڑی والے سے کچھ بولا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ گاڑی میں میرا پیچھا کریں گے۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔

کچھ اور آگے جانے کے بعد مڑ کر دیکھا۔ تو خطرے کو اپنی طرف بڑھتے پایا۔ وہ گاڑی اب تیر کی طرح میری طرف آرہی تھی۔ گویا اب زندگی اور موت کا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ آنے والے مسلح بھی ہوں گے اور کسی بھی وقت وہ مجھ پر فار کر سکتے تھے اس لیے میں نے اپنی پوری قوت لگا دی تھی۔ اب اندھیرا بھی بڑھ چکا تھا۔

اس وقت میں ایسے بھاگ رہا تھا جیسے میرے پیچھے جہنم کی بلائیں لگ گئی ہوں۔ اس لیے کے عقب سے

فار ہوا تھا اور گولی میرے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اب جھاڑیاں بھی قریب آگئی تھیں، گو کہ یہ جھاڑیاں کھیل تھیں۔ جسم پر خراشیں ڈال سکتی تھیں مگر موت سے خراش بہتر ہے۔ یہ سوچ کر میں ان جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا تھا۔

جسم پر جا بجا سونیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں لیکن میں رکنا نہیں تھا۔ اندر کی طرف دوڑتا چلا گیا تھا۔ اسے دوڑنا بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ میں اچھلتا کودتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ جا بجا چھوٹے چھوٹے پتھر بھی تھے جن سے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ اندھیرا مزید گہرا ہو گیا تھا۔ اندھیرا بڑھانے میں ان اونچے اونچے پیڑوں کا کردار زیادہ تھا جو ہر دو تین قدم کے بعد سراٹھائے کھڑے تھے۔ اور یہی پیڑ مجھے بچائے ہوئے تھے اس لیے کہ اب عقب سے فار بھی ہو رہا تھا۔ یہ فار کسی نشانے پر نہیں تھا۔ وہ لوگ اندھا فار کر رہے تھے۔ کوئی گولی بھی میرے نزدیک سے نہیں گزر رہی تھی۔ شاید وہ لوگ مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش میں تھے۔ ان کی کوشش کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئی تھی۔ میں اب بھی اسی تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ بار بار ٹھوکر لگ رہی تھی۔ لڑکھڑاہتا تھا مگر میں رک نہیں رہا تھا۔ سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ پیپڑے جواب دیتے جا رہے تھے۔ الجھ الجھ کر جتنی بار گرا تھا اتنی ہی بار چہرے پر خراشیں آئی تھیں۔ جلن بھی بے چین کیے ہوئے تھی مگر رکنے کا سوال نہیں تھا اس لیے کہ رکتا تو گولیاں مقدر ٹھہرتیں۔



میرے دائیں بائیں ویرانہ تھا اور عقب میں موت کے فرشتے۔ اگر ایک لمحے کو بھی میں رک جاتا تو لاچارگی کی موت ملتی۔ اس لیے ہی دوڑے جا رہا تھا۔ اب تاریکی بھی بڑھ گئی تھی۔ اور راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تبھی مجھے دور بہت دور روشنی سی نظر آئی۔ گو کہ وہ روشنی ایک ڈیڑھ کلومیٹر سے کم دور نہیں تھی پھر بھی مجھے ایسا لگا کہ ایک نئی زندگی کی نوید مل گئی ہے۔ میں نے اب اپنا رخ اسی طرف کر لیا تھا لیکن مجھے حد سے زیادہ کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ جسم میں قوت بالکل نہیں رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آج کئی دن سے مسلسل ایک نہ ایک ہنگامہ منتظر رہ رہا تھا۔ وادی سے نکلنے کے بعد سے کوئی نہ کوئی مسئلہ الجھائے ہوئے تھا۔ پھر اتنی دیر تک بانیک کے جھکے بھی یہ جسم سہہ چکا تھا۔ پیروں میں اب قوت ختم ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ پیر لڑکھڑانے لگے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب میں گر جاؤں گا۔ ایسی کمزوری اس سے قبل میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ یوں لگا جیسے میں اب گرا کہ اب گرا اور پھر واقعی گر گیا۔ پیر ایک جھاڑی سے الجھا تھا کہ میں خود کو سنبھال نہ سکا اور منہ کے بل گرا اور ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ چھوٹے چھوٹے نوکیلے پتھر جسم میں چبھتے رہے اور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ڈھلان ایسی تھی کہ میں رک ہی نہیں سکا۔ نیچے کی جانب لڑھکتا ہی رہا۔ پھر ایک جھاڑی درمیان میں آئی اور اضطراری طور پر میں نے اسے پکڑ لیا۔ ایک ساتھ کئی جھاڑیاں پکڑ میں آئی تھیں اس لیے سنبھل گیا۔ رک گیا۔

جھاڑیوں نے روک تو لیا تھا لیکن پتھروں پہ لڑھکنے سے جسم میں جا بجا چوٹیں آئی تھیں لیکن یہ چوٹیں گولیاں کھانے سے بہتر تھیں۔ میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس وقت میں ایک گڑھے میں پڑا تھا جس میں جھاڑیاں کسرت سے اُگی ہوئی تھیں۔ انہی جھاڑیوں نے مجھے چھپا لیا تھا۔ میں جھاڑیوں کو ہٹاتا کہ اوپر

دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دی پھر پہاڑی کے سرے پر مجھے دوسائے سے نظر آئے اور میں دبک گیا۔ آسمان صاف تھا اور ستارے جھلملا رہے تھے۔ ایسی خاموش فضا میں ستاروں کے نظارے کا لطف لینا ایک اپنا مزہ ہے مگر میں ستاروں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا میری نظریں ان دونوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

وہ دونوں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے اور مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھے۔ تھوڑا سا نیچے اترتے تو مجھے دیکھ لیتے۔ اس خوف نے مجھے لرزادیا اور میں بالکل ساکت ہو گیا تھا کہ کہیں جھاڑیاں ہلیں تو ان کی نظریں اس پر مرکوز ہو جائیں گی اور وہ نیچے اتر آئیں گے۔ وہ دونوں سرگوشی میں مشورہ کر رہے تھے اس لیے کہ ان کی آواز مجھ تک پہنچ نہیں پارہی تھی۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشکوف تھی جب کے دوسرے کے ہاتھ میں پستول تھا۔

ابھی میں ان کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک نئی فناد آ پڑی۔ کلاشکوف والے نے نال کا رخ نیچے کی طرف کر کے برسٹ چلایا۔ بارش کی بوندوں کی طرح برستی ہوئی گولیاں میرے قریب سے گزر گئیں۔ صرف بالشت بھر کا فاصلہ رہ گیا تھا ورنہ ایک نہ ایک گولی میرے جسم میں چھید کر دیتی۔

”لگتا ہے وہ اس نالے سے ہوتا ہوا بھاگا ہے۔“ ان میں سے ایک کی آواز سنائی دی۔

”اگر ادھر سے بھاگا ہے تو وہ اس فیکٹری کی طرف گیا ہوگا۔ اس لیے کہ ادھر ہی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کوئی فیکٹری ہے۔

”چلو ہم ادھر ہی چلتے ہیں۔ خالی ہاتھ جانے کا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا۔“ اس آواز کے ساتھ وہ دونوں اس فیکٹری کی سیدھ میں چلنے لگے۔ اب میرا ادھر جانا بے کار تھا۔ کدھر جاؤں۔ کس طرف بڑھوں میں یہی سوچ رہا تھا لیکن میری نظریں ان دونوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں اب نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید اسی فیکٹری کی طرف چلے گئے تھے۔ تقریباً میں پندرہ منٹ تک وہیں دبکا رہا پھر آہستہ سے جھاڑیوں کو ہٹا کر باہر آیا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ کہیں کوئی آہٹ نہیں تھی۔ البتہ جسم میں سونیاں سے چبھ رہی تھیں۔ جگہ جگہ خراشیں آگئی تھیں اور خون رس رہا تھا۔ میں نے دوبارہ سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ دور روشنی جھلملا رہی تھی جس کے بارے میں ان لوگوں نے کہا تھا کہ وہ کسی فیکٹری کی روشنی ہے۔ کیا واقعی ادھر کوئی فیکٹری ہے، مجھے خود پتا نہیں تھا لیکن اب میں ادھر نہیں جاسکتا تھا اس لیے کہ وہ لوگ ادھر ہی گئے تھے۔ مجھے اب کسی اور طرف جانا تھا۔ کہاں، اس کا خود مجھے پتا نہیں تھا۔ کیونکہ یہ پورا علاقہ میرے لیے نیا تھا۔ میرے پاس اب بائیک بھی نہیں رہی تھی کہ اس پر سوار ہو کر باقی کا راستہ طے کرتا۔ پھر ان نامعلوم دشمنوں کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ وہ پھر سے گھیرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اتنا تو احساس ہو ہی چکا تھا کہ ان کا تعلق مرشد سے ہے اور مرشد پہلے سے زیادہ قوی ہو چکا ہے۔ اس سانپ کا سر کچلنے کے ہی ارادہ سے میں جا رہا تھا کہ اس نے گھیر لیا۔ اور میں ایسی جگہ پہنچ گیا کہ جہاں سے سڑک کدھر ہے اس کا بھی پتا نہیں تھا۔ خدا کا نام لے کر میں نے قدم بڑھا دیے۔ تکلیف کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی پھر بھی ایک بے چینی سی بے چینی تھی۔ کپڑے دھول میں اٹ گئے تھے اور جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا لیکن ستاروں کی مٹیلی روشنی میں دھبے صاف نظر آگئے تھے۔ اس حالت میں اگر میں کسی سے لفٹ مانگتا تو دیکھنے والا خوفزدہ ہو جاتا۔ پھر بھی میں بڑھتا رہا۔ کچھ آگے گیا تھا کہ ایک حویلی نما مکان کا ہیولہ سا نظر آنے لگا۔ رات گزارنے کے لیے وہ ایک معقول سہارا بن سکتا تھا

اس لیے میں اسی طرف بڑھنے لگا۔ پہاڑی راستوں پر زخمی بدن کے ساتھ آگے بڑھنا آسان نہیں لیکن جب موت اور زندگی کا کھیل شروع ہو جائے تو پھر زندگی بچانے کی جدوجہد تیز ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی کوشش جاری رکھی تھی۔ لنگڑاتا ہوا اس عمارت کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

کافی دیر چلنے کے بعد میں نے جیب سے موبائل نکالا اور اپنی پوزیشن سے سفیر کو آگاہ کرنا چاہا لیکن اسکرین پر نظر پڑتے ہی جوش ٹھنڈا پڑ گیا اس لیے کہ سگنل اب تک غائب تھا۔ اتنی دیر میں، میں نے ٹائم دیکھ لیا تھا۔ گھڑی آٹھ بج رہی تھی۔ دوستوں سے الگ ہوئے مجھے چھ گھنٹے ہو چکے تھے اور جان بچانے کی کوشش میں ایک گھنٹا غارت ہو گیا تھا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں کسی طرح رات گزاروں اور صبح کا اجالا پھیلے تو سڑک کدھر ہے اس کا اندازہ لگاؤں۔ رات گزارنے کے لیے کسی محفوظ جگہ کا انتخاب ضروری تھا۔ اگر وہ ہیولہ کسی عمارت کا ہے تو یہ متروکہ ہے تو بہت بہتر تھا اسی خیال کے تحت میں آہستہ آہستہ اسی ہولے کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ متروکہ عمارت ہے کیونکہ اگر آباد مکان ہوتا تو اس میں روشنی ضرور نظر آتی۔

ایک قدم کے بعد دوسرا اٹھے تو منزل قریب آ ہی جاتی ہے۔ بالآخر میں اس حویلی تک پہنچ ہی گیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ ایک متروک حویلی تھی۔ جسے برسوں پہلے ترک کیا گیا ہوگا۔ اس لیے کہ اس کی اینٹیں جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھیں۔ دیواریں گری ہوئیں تھیں لیکن اسٹرکچر اب بھی مضبوط تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ یہ جگہ مناسب بھی تھی اور محفوظ بھی۔ لیکن اندر اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے موبائل آن کر کے جائزہ لیا پھر ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ کئی جگہ ٹھوکر بھی لگی۔ مگر میں رکا نہیں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ بار بار موبائل آن نہیں کر رہا تھا کہ روشنی دور سے نظر آ جاتی۔ پھر ایک جگہ سیڑھیاں سی محسوس ہوئیں تو میں نے پیروں سے ٹٹولا۔ پھر قدم اوپر اٹھایا۔ ابھی ہاتھوں سے ریٹنگ ٹکرائی اور میں اس کا سہارا لے کر اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچتے ہی اندھیرا کچھ ہلکا ہو گیا کیونکہ ایک جانب کی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور اس دیوار سے تاروں کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے اس ہلکی روشنی میں فرش کا جائزہ لیا۔ فرش پر دھول اور گرد کے علاوہ دیوار کا ملبہ بھی پڑا ہوا تھا۔ بلے پر ایک تار پڑا نظر آ گیا۔ مونا الیکٹرک وائر تھا جو کوئی اٹھالایا ہوگا اور بعد میں بیکار سمجھ کر پھینک گیا۔ میں نے اسے اٹھالیا اور بے خیالی میں اسے موڑتا ہوا میں کچھ اور آگے بڑھا۔ اس ٹوٹی ہوئی دیوار تک پہنچا جس کے گرنے سے کمرے میں روشنی آ گئی تھی۔

ابھی دیوار تک پہنچا ہی تھا کہ نیچے نظر پڑی اور میں تھم کر رہ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اندر عمارت میں داخل ہوا ہے۔ میں زیادہ آگے بڑھ نہیں سکتا تھا اس لیے کہ وہ حصہ زیادہ مخدوش تھا۔ ایک قدم بھی آگے بڑھتا تو شاید دیوار کے ساتھ میں بھی نیچے چلا جاتا۔ میں نے پوری قوت سماعت ادھر لگا دی۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں ہوشیار ہو گیا۔

یہ آواز نیچے سے آرہی تھی۔ ایک سے زائد آدمیوں کے چلنے کی آواز تھی۔ میں پوری توجہ سے آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا، تبھی کسی کی آواز آئی کہ وہ اسی عمارت میں چھپا ہوگا۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ اسی کھنڈر میں آیا ہے؟“ اس آواز نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ میں نے آواز پہچان

لیا کہ یہ وہی دونوں ہیں جو میرے تعاقب میں ڈھلان تک آئے تھے۔
 ”میں نے اس کھنڈر میں ہلکی نیلی روشنی دیکھی تھی۔ ایسی روشنی جو موبائل کے آن ہونے پر نظر آتی ہے۔“
 اس بات نے مجھے سرپیٹ لینے پر مجبور کر دیا کہ میں نے ایسی غلطی کیوں کی تھی۔

”تب پھر اوپر چلو۔ اگر وہ اس طرف آیا ہے تو اندر ہی کہیں دبکا بیٹھا ہوگا۔“
 پھر وہ دونوں شاید سیڑھیوں سے مزید اوپر آ گئے تھے۔ تبھی ایک آواز صاف سنائی دی۔ ”وہ دیکھو۔ دھول
 پر بنے پیروں کے نشان یہ بالکل تازہ ہیں۔ اگر دیر کے ہوتے تو ہوا اڑا دیتی۔“
 ”ہو سکتا ہے کہ کوئی گذریا صبح آیا ہو اور دیواروں کی وجہ سے یوں بھی اندر دھول مٹی کم آتی ہے اس لیے یہ
 نشان تازہ لگ رہا ہے۔“

”کچھ بھی ہوا اب آگے بڑھنا ضروری ہے۔ شاید قسمت یاوری کر جائے اور وہ ہمیں مل جائے ورنہ ہماری
 خیر نہیں۔“

پھر وہ دونوں اوپر آ گئے تھے کیونکہ اب ان کے قدموں کی دھک سیڑھیوں سے اوپر سنائی دے رہی تھی۔
 تبھی ایک نے دوسرے کو ڈانٹا۔ ”مارچ بجا دو۔ روشنی دور سے نظر آ جاتی ہے۔“
 میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بالکل سامنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کبھی وہ کمرہ ہا ہوگا لیکن اب
 اس میں دروازہ بھی نہیں تھا۔ شاید کسی کے گھر کا ایندھن بن چکا ہوگا، جلانے کے کام آ گیا ہوگا۔ میں نے کمرے
 میں داخل ہو کر جائزہ لیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی مجھے اس کمرے میں پہنچنے زیادہ دیر
 نہیں ہوئی تھی کہ دھک گلیارے سے آئی۔ گویا وہ دونوں گلیارے میں پہنچ گئے تھے۔ اب کچھ ہی دیر میں وہ اس
 کمرے میں آ جائیں گے اور یہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جس کی آڑ میں خود کو چھپا سکتا اس لیے میں اس دیوار
 کے قریب ہو گیا جس سے نزدیک دروازہ تھا۔ میں نے کمر کو ٹولا اور دل دھک سے رہ گیا۔ اس بھاگ دوڑ میں نہ
 جانے کب پستول کہیں گر چکا تھا۔ اسی وقت باہر سے سرگوشی سنائی دی۔ کوئی بہت نیچی آواز میں بولا تھا۔ ”اسی
 کمرے کی طرف پیروں کے نشان جا رہے ہیں۔ ضرور وہ اسی کمرے میں چھپا بیٹھا ہے۔“

میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ میں نے الیکٹرک دائر کو جو بے خیالی میں اٹھالایا تھا اسے آزمانے کی
 سوچ لی۔ اس کے دونوں سرے کو میں نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا اور اندر آنے والے کا انتظار کر
 نے لگا۔ باہر کھڑا شخص بھی کم چالاک نہیں تھا۔ اس نے کلاشن کی نال اندر کی۔ گو کہ نال صحیح سے نظر نہیں آ رہی تھی
 پھر بھی میں تیار ہو گیا۔ اندر آنے والے نے پہلا قدم اندر رکھا تھا کہ میں نے اچھل کر تار کا حلقہ اس کی گردن میں
 ڈال دیا اور پوری قوت سے کھینچنے لگا۔ عام طور سے میں کسی کی جان لینے کے حق میں نہیں ہوں۔ میری کوشش ہوتی
 ہے کہ میں سامنے والے کو صرف بے ہوش کروں لیکن یہاں معاملہ بہت زیادہ بگڑا ہوا تھا، وہ دو تھے اور مسلح تھے۔
 اگر میں ذرا سی بھی کمزوری دکھاتا تو وہ مجھے بھون کر رکھ دیتے۔ اس لیے میں پوری قوت سے تار کو دو طرف سے
 کھینچ رہا تھا۔ اس وقت تک کھینچتا رہا جب تک کہ وہ گر نہ گیا۔ باہر والے کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیوں رکا ہے مگر
 جب وہ گرنے لگا تو اس نے زور سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

جواب کون دیتا اس لیے کہ وہ تو کب کا مردے میں بدل چکا تھا۔ اس کے گرتے ہی میں نے اس کی

کلاشکوف اٹھالی تھی۔ تبھی باہر والے نے نارچ جلا کر اندر قدم رکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نارچ تھی اور دوسرے میں پستول۔ موقع گنونا اچھا نہیں تھا۔ میں نے کلاشن کی نال اس کے سینے سے لگا دی۔ ”پستول نیچے پھینک کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔“ کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ سے نارچ لے لی اور اسے اس رخ پر زمین پر رکھا کہ اس کی روشنی نیچے گرے ہوئے شخص کے چہرے پر پڑے۔ نئے آنے والے کی نظر زمین پر پڑے ہوئے شخص پر پڑی تو اس کا رہا سہا حوصلہ بھی ٹوٹ گیا اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ مجھے اس سے کوئی ذاتی دشمنی تو تھی نہیں اس لیے میں نے اس سے پستول لینے کے بعد کہا۔ ”تم سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اس لیے اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو میں تمہارے لیے محفوظ پناہ گاہ بن جاؤں گا اور اگر اڑنے کی کوشش کرو گے تو بے موت مارے جاؤ گے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”میں..... میں آپ کا ساتھ دوں گا۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لے کر پستول کو کمر میں اڑسا اور کہا:

”دیکھ رہے ہو، میں نے بغیر کسی ہتھیار کے تمہارے ساتھی کی حالت کیا کر دی ہے اس لیے اڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ جو پوچھوں اس کا صحیح جواب دو۔“

”جی جی پوچھیں۔“ اس کی آواز میں اب بھی لرز تھا۔ اگر روشنی ہوتی تو شاید میں اسے بہتر طریقہ پر دیکھ بھی لیتا کہ وہ واقعی لرز رہا ہے یا ڈراما کر رہا ہے۔

”فی الحال مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں سے سڑک کس طرف ہے؟“

”کون سی سڑک؟“

”نار ان جانے والی۔“

”نار ان یہاں سے بالکل قریب ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ہم نار ان میں کھڑے ہیں۔ مرکزی سڑک بتاؤں یا ذیلی؟“

”جہاں سے مجھے کوئی لفٹ مل جائے۔“

”مغرب کی طرف جو سڑک ہے وہی مرکزی ہے جو گلگت سے آرہی ہے۔“

”چلو مجھے وہاں تک لے چلو۔“

”اور یہ..... اس کا کیا ہوگا؟“

”اس کا کیا ہے؟ یہ ابھی بے ہوش ہے۔ اسے کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔“

”چلیں۔“ وہ بادل ناخواستہ تیار ہو گیا۔ ”لیکن آپ کو پہنچا کر میں واپس آ جاؤں گا۔“

”آ جانا..... مجھے کون سا تمہیں گاؤں بنا کر لے جانا ہے۔“ کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیے۔

وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے پتھر یلے راستے پر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے تقریباً بیس منٹ چلے ہوں گے کہ سڑک نظر آنے لگی۔ وہ بھی اس طرح کہ سڑک پر جو گاڑیاں چل رہی تھیں ان کی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ چلتے ہوئے ہی اس نے کہا۔ ”در اصل اس عمارت تک جو سڑک آتی تھی وہ کافی گھوم کر آتی تھی پھر وہ بھی ختم ہو گئی۔“

اسے بولتے دیکھ میں نے پوچھا۔ ”تم تو فائرنگ کرنے کے بعد فیکٹری کی طرف گئے تھے پھر ادھر کیسے آ گئے۔ یعنی اس کھنڈر میں؟“

”موتی جو میرے ساتھ تھا۔ چلتے چلتے وہ رکا تھا اور ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھنے کی اسے ضرورت پیش آ گئی تھی۔“ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”وہ تو جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھ گیا اور میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ تبھی اس کھنڈر میں موبائل کی روشنی چمکی۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ جگنو ہے لیکن دوسری بار وہی روشنی دیکھی تو سمجھ گیا کہ کھنڈر میں کوئی ہے اور میں موتی کو زبردستی وہاں لے آیا۔“

”تم لوگ کب سے یہ کام کر رہے ہو۔“

”پہلے میں قلات خان کے ساتھ تھا۔ اس کا ساتھ چھوٹا تو ڈاکر کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اسی دوران موتی سے ملاقات ہو گئی۔ وہی جسے آپ بے ہوش کر آئے ہیں۔ اس نے زیادہ پیسے دینے کا آفر کیا اور کہا کہ اس کام میں تھانہ پولیس کا بھی خطرہ نہیں ہے۔ ہمیں صرف جسے کہا جائے گا اسے اٹھا کر لانا ہے۔ میرے لیے یہ کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اس لیے میں فوراً راضی ہو گیا۔ دو مہینے سے اس کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔“

”میں بھی تمہیں ایک پتادوں گا۔ تم کراچی آ کر مجھ سے ملو تمہاری زندگی بن جائے گی۔“

”آپ کراچی میں رہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے ایک اور جھوٹ گھڑا۔ ”میں وہاں شرف بھائی کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ ہم لوگ سونا لاتے لے جاتے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ مل گئے تو تمہاری زندگی بن جائے گی۔“

”آپ دہی سے کام کرتے ہیں۔ میں کب سے سوچ رہا ہوں کہ کسی ایسے بندے کے ساتھ کام کروں جو دوسرے ملکوں کی سیر کرائے۔ مجھے بہت شوق ہے کہ میں دہی جاؤں۔ آپ مجھے ضرور اپنے ساتھ لے لیں۔ اگر کہیں تو میں ابھی آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ موتی خود ہی اٹھ کر گاڑی تک چلا جائے گا۔“

اس نے گاڑی کا نام لیا تو مجھے یاد آیا کہ میرا تعاقب کرنے والے تو جیپ میں سوار تھے۔ میں نے پوچھا۔

”جیپ کہاں روکی؟“

”شمال کی جانب سڑک کنارے۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک سمت دکھائی۔

باتیں کرتے ہوئے ہم سڑک تک آ گئے تھے۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر پوچھا۔ ”یہ بتاؤ کہ گلگت کس طرف ہے اور ناران کس طرف۔“

اس نے اشارے سے بتایا اور اب میری نظر گلگت سے آنے والی سڑک کی طرف تھی۔ میں اسے باتوں میں پھنسائے رکھنا چاہتا تھا تا کہ وہ واپس جانے کی ضد نہ شروع کر دے۔ اسے تو میں نے باتوں میں پھنسا رکھا تھا۔ اگر یہ واپس چلا جاتا اور موتی کو مردہ دیکھتا تو پھر سے کوئی دوسری پریشانی کھڑی ہو جاتی اسی لیے اسے اپنا دم چھلا بنائے ہوئے تھا۔ اور ہم سڑک پر کھڑے کسی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے جس سے لفٹ لی جاسکے۔

کچھ ہی دیر بعد دوسری جانب سے آتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ آنے والی گاڑی یا تو گلگت سے آرہی تھی یا پھر چلاس سے۔ اگر یہ گاڑی والا لفٹ دے دیتا ہے تو میں بڑی آسانی سے اس علاقے سے نکل جاؤں گا۔ پھر بڑی آسانی سے سفیر وغیرہ سے رابطہ بھی ہو جائے گا اس لیے کہ آگے کہیں نہ کہیں سگنل ضرور آتے ہوں گے۔ یہی

سوچتے ہوئے میں نے ہاتھ کھڑا کر کے گاڑی روکنے کا اشارہ دینے لگا۔

وہ ایک ٹرک تھا۔ اشارہ دینے پر اس نے روک لیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولا۔ ”کہاں جانا ہے؟“

”ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے جہاں تک پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر سے آ جاؤ۔“ کہہ کر اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔

میں نے ساتھ آنے والے کو خدا حافظ کہا اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے اور ڈرائیور کو سنانے کے لیے

اس سے بولا۔ ”جیسے ہی گاڑی صحیح ہو جائے نار ان چلے آنا وہاں محمود ہوگا اسے گاڑی دے کر پنڈی آ جانا۔“

میرے بیٹھتے ہی اس نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔ ٹرک والا کوئی باتونی لگتا تھا۔ بیٹھتے ہی بولا۔ ”باؤ جی کہاں

سے آرہے ہو اور کہاں تک جانا ہے؟“

”کراچی سے آیا ہوں۔ ٹریکنگ کے لیے شمال گیا تھا واپس آ رہا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی۔“

”تو پھر اب رکنا کہاں ہے؟“ اس نے عام سے انداز میں پوچھا تھا۔

”تم کہاں تک جاؤ گے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”باؤ جی، ہمارا کیا ہے ہم تو رہتا جوگی ہیں۔ جہاں کا راستہ ملے ادھر چل دیتے ہیں۔“ وہ وینڈ اسکرین کے

پارہ دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ ”ہم تو دنیا کے آخری کونے تک جاتے ہیں۔ ویسے لگتا ہے آپ پنڈی تک ہی

جائیں گے۔“

”نہیں بھائی ہمیں تو کراچی جانا ہے۔ پنڈی پہنچ کر ہم بائی ایر جائیں گے۔“ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا

تھا جیسے اس کا لہجہ بناوٹی ہے۔

”باؤ جی پنڈی سے آپ کو آگے جانے کون دے گا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ میرا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

”صاف بات ہے آپ جس کام کے لیے نکلے ہو اسے تو پورا کرو گے نا؟“ اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا

کہ میں اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ ”پھر آپ کو ایک کام اور بھی کرنا ہے۔“

”کون سا کام؟“

”باؤ جی میرا گھر بھی پنڈی میں ہے اگر آپ چاہیں تو میرے گھر میں ایک دو دن ٹھہر سکتے ہیں۔ ہم غریب

ضرور ہیں لیکن مہمان کا آنا بہت پسند کرتے ہیں۔ میں تو آپ کو ایسے جانے نہیں دوں گا۔“ اس نے قہقہہ لگا کر

کہا۔

دل میں اگر شک کا سانپ پھن پھلانے لگے تو رسی بھی سانپ لگتی ہے۔ وہ مجھے مہمان ٹھہرانے کی بات کر

رہا تھا اور میں اس پر شک کر رہا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اس کا جائزہ لیا۔ سر پر ملگجی سی پگڑی تھی لیکن جسم بھرا بھرا

اور اس نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پینڈ و ابھی اٹھ کر آیا ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ ”فکر نہ کریں۔ کراچی سے لوٹ کر آپ سے رابطہ ضرور کروں گا۔“ کہتے ہوئے میں نے جیب سے موبائل

نکالا۔ اسکرین پر نظر پڑتے ہی دل خوش ہو گیا۔ سگنل نظر آرہے تھے میں نے سفیر کا نمبر ملایا۔ کان سے لگاتے ہی

دوسری جانب سے رنگ ٹون آتی ہوئی سنائی دی۔ میں نے جیسے ہی ہیلو کہا ادھر سے سفیر کی دہاڑ سنائی دی۔ ”کہاں

ہیں آپ۔ کوئی رابطہ نہیں۔“

”بتاؤں گا۔ فی الحال یہ بتاؤ تم سب کہاں ہو؟“

”ہم پنڈی پہنچ گئے۔ راستے میں ہی وسیم نے کمال دکھا دیا۔ اس نے ایک بندے سے بات کر لی اور اب

ہم ایک ویل اسٹیلشڈ مکان میں بیٹھے ہیں۔ بس آپ کا انتظار ہے۔“

”حدود اربعہ بتاؤ۔“

”زیر و میل پر پہنچ کر کال کر لیں۔“

”اوکے میں کچھ دیر میں کال کرتا ہوں۔“ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

”یہ آپ کس زبان میں بات کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آرہی تھی۔“

”جسے میں نے فون کیا تھا وہ غیر ملکی ہے اس لیے اسی کی زبان میں بات کر رہا تھا۔“ کہہ کر میں نے کھڑکی

سے باہر دیکھا۔ اندھیرا اب چھٹنے لگا تھا اور مشرقی سمت میں اجالا پھیلنے لگا تھا۔ صبح کے آثار ہو رہے تھے۔ میں نے

ڈرائیور سے پوچھا۔ ”بھائی ہم کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟“

”بس تھوڑی دیر اور۔ اذان کے ساتھ ہم شہر کے قریب ہوں گے۔“

اس کے جواب نے مجھے مطمئن کر دیا۔ میں نے سیٹ سے سر نکا دیا۔ پتا نہیں ذہنی تھکن تھی یا کوئی اور بات

بلکی سی جھپکی آگئی اور میں غنودگی میں چلا گیا۔

ٹرک کی آواز لوری دے رہی تھی۔ میں نیم غنودگی میں تھا۔ عام حالات میں مجھ پر ایسی کیفیت طاری نہیں

ہوتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس وقت مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا، شاید یہ تھکن تھی یا

پھر ذہنی کشمکش یا بعد کی صورت حال کہ میں نیند پر قابو نہ رکھ سکا۔

نہا ہی اعصاب قوی کیوں نہ ہو ایک نہ ایک وقت کچھ دیر کے لیے ہی صحیح وہ کمزور ضرور ہو جاتا ہے۔

وادی سے نکلنے کے بعد سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میں کچھ کمزور ہو چلا ہوں۔ یہ غنودگی بھی شاید اسی کی طرف

اشارہ تھا۔

ابھی ٹرک نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے کان میں کچھ کہا ہو۔ آواز تیز

نہیں تھی پھر بھی مجھے چونکا گئی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ شاید اسی کو چھٹی حس کہتے ہیں۔

کیونکہ اگر اس وقت میں نیند سے بیدار نہ ہوتا تو شاید آج میں اپنی کہانی سنانہ رہا ہوتا۔ کیونکہ اگلے ہی پل میری نظر

بیک ویو مرر پر پڑی تھی اور میں نے اس میں پیچھے سے آتی شیراؤ کو دیکھ لیا تھا۔

یہ عام شارع تھی۔ ہر قسم کی گاڑیوں کو آنے جانے کی آزادی تھی۔ بہت سی گاڑیاں آتی جاتی نظر آتی تھیں

اور میں نے ان پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اس شیراؤ پر توجہ اس لیے دے دی تھی کہ وہ تیزی سے نزدیک آتی جا رہی

تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ٹرک کو کراس کرنا چاہتی ہے۔ یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ شیراؤ

سے ایک ہاتھ باہر کی طرف نکلا ہوا تھا اور اس ہاتھ میں پستول تھا۔ منج کا ذب کا وقت تھا اس لیے ہلکی روشنی تھی پھر

بھی میں نے پستول دیکھ لیا۔ ڈرائیور کو ہوشیار کرنا کہ پہلے پستول کا دھماکا ہوا اور پھر ٹارگا۔ اس نے گولی ٹار

پر ماری تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹرک روکنا چاہتے تھے۔

ٹائر کے بلاسٹ ہوتے ہی۔ ٹرک لہرایا تھا لیکن ڈرائیور مشاق تھا۔ اس نے سنبھال لیا تھا۔ پچھلے دو ٹائیروں میں سے ایک پھٹ چکا تھا اب وہ دوسرا بھی پھاڑنے کے فکر میں ہوگا۔ اس خیال کے تحت میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”لگتا ہے شیراڈ میں ڈاکو ہیں۔ وہ سامنے جو در تک پھیلی جھاڑیاں ہیں اس میں ٹرک کو گھسا کر روک لو۔ تاکہ ہم اتر کر فرار ہو سکیں۔ بعد میں آکر ٹرک لے جائیں گے۔ ابھی تو محفوظ رہنے کی سوچو۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ اس نے میرے مشورے کو مان لیا اور اسی طرف ٹرک کو دوڑا دیا جدھر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ قد آدم جھاڑیاں۔ عین اسی وقت میرے موبائل کا ویبرٹر آن ہوا۔ کس کی کال ہے یہ دیکھنے کے لیے میں نے موبائل نکالا مگر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے کان میں فوراً ہی لگا لیا اور بولا۔ ”ہیلو۔“

دوسری جانب سے مرشد کی مکروہ آواز آئی۔ ”کیسے ہو شہباز..... میں نے کہا تھا نا کہ تم میری نظروں سے دور نہیں ہو۔ تم نے دوستوں سے الگ ہو کر سمجھا تھا کہ مجھے درغلا دو گے۔ اور میں تمہاری فکر چھوڑ کر ان کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ اسی لیے میں نے اس بار اپنے اصل بندوں کو بھیجا ہے جو تمہیں باندھ کر لائیں گے۔“

جواب دے کر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بغیر کوئی جواب دیے میں نے موبائل آف کر دیا۔ اتنی دیر میں ڈرائیور نے ٹرک کو ان اونچی اونچی جھاڑیوں میں پہنچا دیا تھا۔ جھاڑیاں قد آدم تھیں مگر ٹرک کو تو چھپا نہیں سکتی تھیں۔ شیراڈ شاید ابھی سڑک پر تھی۔ وہ لوگ اسے جھاڑیوں میں لانے کا رسک نہیں لینا چاہتے ہوں گے مگر اس سے اتر ضرور گئے ہوں گے اور ہمیں پکڑنے کے لیے ہمارے پیچھے آرہے ہوں گے۔ اس سوچ نے مجھے پھرتی دکھانے پر زور دیا اور میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے ڈرائیور سے کہا کہ وہ بھی اتر کر سیدھ میں دوڑنا شروع کر دے۔

ہم لوگ ایک ساتھ نیچے کودے اور پھر دوڑے تھے اس لیے تقریباً آگے پیچھے تھے۔ دوڑتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ جھاڑیاں تھی ہی اتنی گھنی اور اونچی کے اس میں کسی کا نظر آنا ناممکن تھا۔ میں مسلسل دوڑ رہا تھا کہ آواز آئی۔ ”شہباز تم بھاگ نہیں سکتے۔ اگر رکے نہیں تو میں گولی چلا دوں گا۔“

میں نے مڑ کر دیکھا۔ بولنے والا ٹرک کی چھت پر چڑھا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے بھی ہم اسے نظر نہیں آرہے ہوں گے لیکن ہمارے دوڑنے سے جھاڑیاں ہل رہی ہوں گی اس لیے وہ اندازہ لگا چکا ہوگا کہ ہم کس طرف ہیں اور ہمارا رخ کدھر ہے۔ میں نے رکنا اپنی موت سمجھا اور دوڑنا رہا۔ تبھی ایک زوردار دھماکا گونجا۔ گردن موڑتے وقت میں نے اسے ترچھا ہو کر نشانہ لیتے دیکھ لیا تھا اس لیے ایک لمحے میں فیصلہ کیا تھا اور جھاڑیوں میں خود کو گرا لیا تھا اور یہی بچت ہوئی تھی۔ لیکن ڈرائیور نے توجہ نہیں دی تھی۔ دھماکے کے ساتھ وہ لڑکھڑایا تھا اور زمین پر گر گیا تھا مگر فوراً ہی اٹھ کر رکوع کے انداز میں بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اسے گولی لگی ہے۔ فوراً ہی اس کے پاس پہنچا تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا دوڑ رہا تھا لیکن اس کے قدم قابو میں نہیں تھے۔ اسے گولی کہاں لگی ہے یہ نہ پوچھنے کا وقت تھا اور نہ دیکھنے کا اس لیے میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی اسے سہارا دیا تھا۔ اور ہم پھر سے دوڑنے لگے تھے۔ گولیاں اب بھی چلائی جا رہی تھیں لیکن ہم اس پستول کی رینج سے باہر آگئے تھے مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ ان کے پاس وائیڈ رینج کا بھی کوئی ہتھیار ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ کلاشن اور رائفل کی رینج میں ہم اب بھی تھے۔

ہم مسلسل دوڑ رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے میرے ہونٹوں پر ہنسی آگئی اس لیے کہ نہ تو وہ بول رہا تھا اور نہ مجھے اندازہ تھا کہ ہم کسی گاؤں کے نزدیک ہیں۔ مجھے لگے ہاتھ پر روشنیاں نظر آگئی تھیں۔ خاصی بڑی ہستی یا کوئی قصبہ تھا۔ اس لیے کہ لائٹ پوسٹ بھی نظر آرہے تھے، اس لیے میں نے اپنا رخ ادھر موڑ دیا تھا۔ اور اب ہم اسی طرف دوڑ رہے تھے۔ ڈرائیور بالکل خاموش تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ رو بوٹ ہے جو صرف دوڑنا جانتا ہے اسے اور کسی چیز سے مطلب نہیں تھا۔ بس میرے ساتھ کھینچا چلا جا رہا تھا۔

جھاڑیوں نے کپڑے تار تار کر دیئے تھے۔ جسم پر بھی جا بجا خراشیں آگئی تھیں۔ پھر بھی میری رفتار سُست نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ اگر رفتار سُست پڑی تو سانس کی رفتار ختم ہو جائے گی۔ یہ درندوں کی فطرت ہے کہ جب وہ خطرہ محسوس کرتے ہیں تو ان کی حسیں پوری طرح بیدار ہو جاتی ہیں۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ اس کے اندر بھی درندوں کی حس ہے اور اس وقت میرے اندر بھی ایک درندہ بیدار ہو چکا تھا۔ اس وقت میرے سامنے جو بھی آتا میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔ اپنی جان بچانا ہر ایک پر فرض ہے اور جان بچانے کے لیے کسی کا بھی خون کیا جاسکتا ہے۔

جھاڑیوں سے باہر آتے ہی میری نظر ایک ایسے مکان پر پڑی جو دوسرے گھروں سے زیادہ فاصلے پر تھا اور اس وقت وہی مجھے جائے پناہ نظر آیا۔ میں ڈرائیور کو کھینچتا ہوا ادھر بڑھا تھا کہ اس نے کہا۔ ”اس گھر میں پناہ ملنی مشکل ہے اس لیے کہ یہ حکمت خان کا بنگلا ہے اور اس وقت بھی اس بنگلے میں آٹھ دس لوگ ہوں گے۔ اس کے عقب میں کئی اور گھر ہیں۔ انہی میں سے کسی کا انتخاب کرو۔“

اس نے اس دوران پہلی بار زبان کھولی تھی، کچھ کہا تھا۔ لیکن جو کہا تھا اس میں وزن تھا اس لیے میں نے ادھر جانے کا خیال موقوف کر دیا۔ اور اس گھر کے عقب کی طرف بڑھنے لگا۔ سامنے ایک گلی سی نظر آئی اس لیے کہ اس میں بہت سارے مکان قطار سے نظر آرہے تھے۔ میں اس گلی میں داخل ہو گیا۔ ابھی ہم ایک گھر میں داخل ہونے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اس گلی میں یکا یک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ چمکی۔ گاڑی دوسری طرف سے داخل ہوئی تھی۔ اب سوچنا، غور کرنا عبت تھا۔ میں نے سامنے والے گھر میں قدم رکھ دیا۔ احاطہ کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے پہلے ڈرائیور کو سہارا دے کر چڑھایا اور پھر خود بھی چڑھ گیا اور پہلے اسے سہارے سے نیچے اتارا پھر خود بھی اتر گیا۔ یہ کام اتنی پھرتی سے کیا تھا کہ اب سوچتا ہوں تو ناقابل یقین لگتا ہے۔ جب زندگی داؤ پر لگی ہو تو پھرتی ٹوٹ کر برستی ہے۔ نیچے اترنے کے بعد بھی میں کسی چیتے کی طرح ہوشیار تھا اور ہر طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ احاطے میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اگر یہ احاطہ کسی بڑے شہر میں ہوتا تو مالک اسے گارڈن بنانے کی پوری کوشش کرتا لیکن یہاں سوائے گھاس کے کچھ بھی نہیں تھا۔ خالی قطعہ زمین کو پار کر کے میں آگے بڑھا۔ میں نے ڈرائیور کا پورا وزن اپنے کندھے پر اٹھالیا تھا۔ پھر بھی وہ خود کو گھیننے کے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔

خالی زمین کو پار کرنے کے بعد ہم برآمدے میں پہنچے۔ برآمدے کے بعد ایک دروازہ تھا جو بند نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ پورے احاطے کا جائزہ لیا لیکن ہر طرف خاموشی تھی۔ جو لوگ گلی میں داخل ہوئے تھے وہ بھی نظر نہیں آئے یعنی ان کی گاڑی کی ہیڈ لائٹ نہیں چمکی۔ میں نے ادھر سے توجہ ہٹا کر دروازے پر ہتھیلی سے دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ میں نے اندر قدم رکھ دیا۔ وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جسے

میں دوبارہ سے کھڑکی کے پردے کی آڑ سے جھانکنے چلا گیا۔ نیچے نظر ڈالی تو ایک اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ گلی خالی پڑی تھی۔ شاید وہ لوگ مایوس ہو کر جا چکے تھے۔ میں نے واپس آکر لڑکے سے پوچھا۔ ”کام کیا کرتے ہو؟“

”جی میں اسپتال کا ڈرائیور ہوں۔ اکلوتی ہائی روف جس پر ایمبولنس لکھا ہے اسے چلاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو گھر سے لانا لے جانا اور ان کی ضرورت کی چیزیں بازار سے لانا میرے ذمے ہے۔“

اس جواب نے مجھے خوش کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”ایمبولنس باہر تو نظر نہیں آئی۔ ہے کہاں؟“

”وہ گھر کے پیچھے کھڑی کرتا ہوں۔ وہیں کھڑی ہے۔“

”اسے میں لے جا رہا ہوں۔ کل صبح پنڈی کے راجا بازار کی جامع مسجد کے سامنے کھڑی ملے گی۔ وہاں سے لے لینا۔“

”نہیں..... یہ ناممکن ہے۔ میری نوکری کا سوال ہے۔“

”دیکھو بھائی۔ میں زور زبستی بھی کر سکتا ہوں لیکن تمہاری بیوی نے جس طرح ہمارے ساتھ تعاون کیا اس کی وجہ سے میں کہہ رہا ہوں کہ صبح جا کر لے لینا۔ یوں سمجھ لو کہ میں اسے کرایہ پر لے جا رہا ہوں۔ یہ لو پانچ ہزار۔ رات بھر کی بات ہے۔“

لڑکی نے دخل دیا۔ ”یہ جو کہہ رہے ہیں سن لو۔ اس میں ہمارا نقصان کیا ہے۔ تم پہلی بس سے نکل جانا۔ اگر یہ اجازت دیں تو انہی کے ساتھ چلے جاؤ۔ ان کو مطلوبہ جگہ اتار کر واپس آ جانا۔“

”ہاں ایسا بھی کر سکتے ہو۔“ میں نے اجازت دے دی۔

لڑکا ابھی بھی تردد میں تھا کہ لڑکی بولی۔ ”اب سوچ کیا رہے ہو۔ ہمارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔ اگر یہ چاہیں تو ہسپتال دکھا کر بھی ایمبولنس لے جاسکتے ہیں۔ اس لیے پانچ ہزار مل رہے ہیں تو برا کیا ہے۔“

”چلیے!“ لڑکا تیار ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”بھائی میاں، اب طبیعت کیسی ہے؟ سفر کر سکو گے نا؟“

”جی ہاں بہتر ہے۔ مجھے اپنے ٹرک کی فکر کھائے جا رہی ہے۔“

”ٹرک انشورڈ ہے نا؟“

”جی ہاں۔“

”تو فکر کیسی..... ایک دو دن بعد آکر لے جانا۔ انہیں تم سے کوئی دشمنی ہے نہیں۔ وہ میرا شکار کرنا چاہتے تھے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ مجھے اس بندے نے ہسپتال دکھا کر مجبور کر دیا تھا۔“

”وہ مان لیں گے؟“ اس نے معصوم لہجے میں پوچھا۔

”بھائی، وہ لوگ میری تلاش میں آئے تھے، میں ان کے ہاتھ نہیں آیا مجبوراً وہ لوٹ گئے۔ اب تک تو پنڈی پہنچ چکے ہوں گے۔ کوئی مقامی تو تھے نہیں جو تمہارے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔“

”بات تو آپ کی دل کو لگتی ہے۔ میں نے اب تک کسی سے دشمنی مول نہیں لی ہے اس لیے کوئی میرا دشمن کیوں بنے گا۔“

”بالکل..... تم ایک معصوم سے آدمی ہو۔ وہ پاگل تو ہیں نہیں کہ خواہ مخواہ تمہارے دشمن بن جائیں۔ اس لیے تم بے فکر رہو۔ وہ لوگ تمہیں دیکھ کر بھی اُن دیکھا کر دیں گے۔“

”تو کیا میں گاڑی دیکھنے ابھی نکل جاؤں۔“

”نہیں ابھی نہیں۔“ پھر میں نے لڑکی کی طرف دیکھ کر اس سے پوچھا۔ ”اگر یہ یہاں، باہر والے کمرے میں صبح تک کے لیے ٹھہر جائے تو کیسا رہے گا۔ تم اپنا کمر اندر سے لاک کر لینا؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر اس بات کے لیے بھی آپ ہماری کوئی مدد کر دیں تو زندگی بھر دعائیں دیں گے۔“ اس نے نہایت خوبصورت انداز میں رشوت مانگ لی اور میں نے مسکراتے ہوئے مزید پانچ ہزار اسے دے دیا۔ کچھ ہی دیر میں اندازہ ہو چکا تھا کہ لڑکی بہت چالاک ہے اور لالچی بھی۔ ایسے لوگوں سے من پسند کام نکلوانا بہت آسان ہوتا ہے، اسی لیے میں نے بغیر حیل و حجت کے روپیہ دے دیا تھا۔ رقم دیکھ کر لڑکا اور لڑکی دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ ایک ساتھ دس ہزار کی آمدنی ہو گئی تھی۔

میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”تم باہر والے کمرے میں آرام کرو۔ صبح اٹھ کر ٹرک تلاش کر لینا۔ ان شاء اللہ وہ محفوظ ملے گا۔ اگر کوئی نقصان ہوا بھی تو انشورنس والے پورا کر دیں گے۔“

”ان لوگوں نے نقصان نہ پہنچایا ہو تو یقیناً محفوظ ہوگا۔ ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ٹرک کو چھیڑے۔ آپ کہتے ہیں تو میں رک جاتا ہوں۔ باجی اندر سے اپنا کمر ابند کر لیں۔ یوں بھی میں تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ بستر پر گرتے ہی نیند آ جائے گی۔“

”میں آپ کو بستر دے رہی ہوں۔ آپ اس کمرے میں بچھا کر آرام سے سو جائیں۔ تب تک شہزاد بھی واپس آ جائیں گے، میں ناشتہ کرا کر آپ کو رخصت کر دوں گی۔“

جو کام مشکل لگ رہا تھا وہ بڑی آسانی سے ہو گیا تھا۔ شہزاد ایسبونس لانے کے لیے باہر جا چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور پر نظر ڈالی اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے سائے تھے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ لفافہ نکالا جس میں رقم تھی۔ اس کے اندر دیکھتے ہی مایوسی چھا گئی۔ شاہ خرچی نے۔ دریا دلی نے سارے پیسے ختم کر دیے تھے۔ بمشکل دس ہزار بچے ہوں گے۔ میں نے اس میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکالے اور ڈرائیور کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”یہ رکھ لو اگر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہوگی تو کام آ جائیں گے۔“

اس نے ہاتھ بڑھا تو دیا تھا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ لینا نہیں چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔ ”سر آپ اپنا موبائل نمبر دے دیں۔ میں شام تک پنڈی پہنچ جاؤں گا۔ آپ کی دعوت مجھ پر قرض ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کاغذ پر اپنا نمبر لکھ کر دے دیا۔ اتنے میں باہر سے گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور میں باہر کی جانب چل پڑا۔ باہر آیا تو ایسبونس کھڑی تھی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ شہزاد نے ایسبونس چلا دی۔ اب میں ایک بار پھر پنڈی کی جانب عاز سفر تھا۔ میں نے راستے میں شہزاد کی خاموشی توڑنے کے لیے پوچھا۔

”بھئی شہزاد، تمہاری شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں؟“

”جی، سات مہینے ہوئے ہیں۔“ اس نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے جواب دیا۔

”والدین کہاں ہیں؟“

”میرا گھر چترال میں ہے۔ یہاں نوکری کے لیے آیا تھا کہ نسیم سے محبت ہوگئی اور پھر ہم نے شادی کر

لی۔“

”کیا وہ بھی چترال کی ہے؟“

”جی نہیں، وہ پنجاب کی ہے۔ اس کی یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔“

باتوں کے درمیان راستہ طے ہوتا جا رہا تھا۔ جس اسپید سے ہم آگے بڑھ رہے تھے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم پچھنے تک پہنچ جائیں گے۔ آگے کوئی چھوٹی سی بستی تھی اس لیے کہ وہاں روشنی نظر آرہی تھی۔ تبھی شہزاد بولا۔ ”سرا اگر آپ کہیں تو میں سامنے والے ہوٹل پہ رک جاؤں۔ چائے پی کر آگے بڑھتے ہیں۔، دراصل مجھے نیند ستا رہی ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے تائید کر دی۔

سوچا اس بہانے میں علاقے کا جائزہ بھی لے لوں گا۔ اگر کوئی پیچھا کر رہا ہوگا تو پتا چل جائے گا۔ کیونکہ اس پہر خال خال ہی گاڑیاں آکر رکتی ہوں گی۔

اس نے کچھ آگے جانے کے بعد ایک ڈھابے پر گاڑی روک دی۔ اس ہوٹل پر ایک دو گاڑیاں کھڑی تو تھیں لیکن جاگتا ہوا کوئی نہ تھا۔ اس نے گاڑی روکتے ہی ہارن بجایا تھا۔ شاید یہ ہارن کی آواز کا اثر تھا کہ ایک بندہ جن کی طرح نمودار ہو گیا۔ اس نے آتے ہی کچھ پوچھا۔ سوال چترالی زبان میں کیا گیا تھا اس لیے میں سمجھ نہیں پایا۔ لیکن شہزاد نے فوراً ہی جواب دیا۔ وہ آرڈر سنتے ہی واپس چلا گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن اطراف کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ اسی لیے وہ شخص میری نظروں میں آ گیا تھا۔ وہاں بہت سی چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کچھ خالی تھیں اور کچھ پر لوگ لیٹے ہوئے تھے لیکن وہ شخص خالی چار پائیوں کو نظر انداز کر کے ایک پیڑ کے نیچے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چائے بنتی پھر آتی اس لیے میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اٹھتے دیکھ شہزاد نے پوچھا۔ ”واش روم جائیں گے؟“

”نہیں۔“ کہہ کر پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں اٹھ کر اس پیڑ کے نیچے بیٹھے شخص کے پاس چلا گیا۔ اس لیے کہ وہ مجھے بہت پریشان سا نظر آ رہا تھا شاید کسی بڑی مصیبت میں گرفتار تھا۔

میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ ”کیوں بھائی کیا بات ہے۔ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہو؟“ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے سر اٹھایا تھا اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ شاید وہ رو رہا تھا۔ میں نے دوبارہ اس سے پوچھا۔ ”بھائی کوئی حادثہ ہوا ہے کیا؟ مجھے بتاؤ شاید میں کوئی صحیح مشورہ دے سکوں؟“

اس نے دوبارہ سر اٹھایا اور کہا۔ ”بھائی جس کام سے آئے ہو وہ کرو میرے زخم کو نہ چھیڑو۔“ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اردو صحیح طور پر بول نہیں سکتا پھر بھی اپنی بات کہہ رہا تھا۔ اور ہم سمجھ بھی رہے تھے۔ اس کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ غمگین ہے۔ اب مجھے اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے کہا۔ ”بھائی مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ دکھ

بتانے سے بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔“

شاید یہ میرے لہجے کا اثر تھا کہ وہ دوبارہ سے سسک پڑا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”بھائی جب تک کسی کو بتاؤ گے نہیں اس وقت تک اس مسئلہ کا کوئی حل کیسے بتا سکتا ہے۔ اپنا دکھ بتاؤ شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”بھائی میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ ہم جس گاؤں میں رہتے ہیں وہیں ایک فیض خان بھی رہتا ہے۔ اس کے پاس بہت پیسا ہے اور اسی وجہ سے وہ ہم جیسے غریبوں کا خون چوستا ہے۔ لوگوں کو ادھار رقم دیتا ہے اور پھر اس کے سود سے قرض لینے والے کی مٹی خراب کر دیتا ہے۔ میری بیٹی کی شادی جس لڑکے کے ساتھ ہونا تھی وہ برات لے کر آ گیا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر تارخ دی تھی کہ فیض خان سے رقم ادھار لے کر باراتیوں کا کھانا وغیرہ کر دوں گا۔ ہمارے علاقے میں جہیز دینا لینا ہوتا نہیں ہے لیکن.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”لیکن کیا؟ اس لڑکے نے جہیز مانگ لیا ہے؟“

اس نے دوبارہ سے آنکھوں پر ہتھیلی پھیر کر بہہ آئے آنسوؤں کو پونچھا پھر بولا۔ ”ہوایہ کہ فیض خان نے قرض دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن عین وقت پر اس نے کچھ نہیں دیا۔ پھر بھی میں نے براتیوں کی دعوت کا انتظام کر لیا تھا۔ لیکن جب نکاح ہو گیا تو لڑکے نے ایک عجیب بات کر دی۔ اس نے جھوٹ کہہ دیا کہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے موٹر سائیکل دوں گا۔ اگر میں نہیں دیتا تو جھوٹا ثابت ہو جاؤں گا اور وہ بھی چاہتا ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اسے ایسا کرنے کے لیے فیض خان نے ورغلا یا یہ ہے۔ کیونکہ وہ خود میری بیٹی پر نظر رکھتا ہے۔ اس نے اشارے اشارے میں ایک بار یہ بات مجھ سے کہی تھی لیکن اب خیال آرہا ہے کہ یہ پوری سازش اسی کی ہے کہ میری بیٹی کی برات لوٹ جائے۔ اب میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں کہ بیٹی کو رخصت کر سکوں۔“ وہ پھر سے رونے لگا تھا۔

میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر کہا۔ ”رونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کتنی دور ہے تمہارا

گاؤ؟“

”جی۔ وہ جو روشنی دکھائی دے رہی ہے وہ میرے گاؤں کی ہے۔“

”ایسا کرو تم مجھے اپنے گاؤں لے چلو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس

سے کہا اور واپس شہزاد کے پاس آ گیا۔

شہزاد چائے کا سپ لے رہا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”کوئی شناسا مل گیا ہے کیا۔ بڑی دیر تک باتیں

کرتے رہے ہیں۔“

”شناسا تو نہیں لیکن ایک مصیبت کا مارا ہے۔ ہم لوگ زندگی بھر گناہ پر گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن جب

بھی موقع ملتا ہے ایک دوا چھ کام بھی کر لیتے ہیں تاکہ گناہوں کی طویل فہرست کے ساتھ اچھے کام کی بھی فہرست

بن جائے۔ شاید کچھ تلافی ہو جائے۔“

”میں سمجھا نہیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیسا گناہ؟“

وہ شخص واپس چلا گیا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ بڑبڑاتا ہوا گیا تھا۔ میں نے منیر سے کہا۔ ”میں رقم دے رہا ہوں۔ جس نے کھانا پکایا تھا اسے بلو لیجئے۔“

”اس کا تو انتظام ہے لیکن اصل مسئلہ جو ہے وہ کیسے حل ہوگا؟“

”برات آئی کہاں سے ہے؟“

”جی پنڈی سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ان صاحب کے علاوہ بزرگ میں کوئی اور بھی ہے؟“

”جی نہیں..... وہی بڑا ہے۔ اسی کے کہنے پر لڑکے نے بایک کی ڈیما نڈ کی ہے۔“

”ان کو بلالائیں۔“ میں نے کہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

اشارہ پاتے ہی وہ تیر کی طرح آیا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”میں ان کا رشتہ میں بھائی ہوں۔

اچھا یہ بتائیں کہ اس وقت تو نئی بایک مل نہیں رہی۔“

”بھائی صاحب نکاح تو تبھی ہوگا جب وعدہ پورا ہوگا۔ یہ کام ان کو پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔ وعدہ وعدہ

ہوتا ہے۔ میرے بھائی کو زیرو میٹر چاہیے۔“

”ایک منٹ..... آپ کی رہائش کہاں ہے؟“

”جی میں ڈھوک علامہ اقبال کالونی میں رہتا ہوں۔“

میں نے موبائل نکالا اور سفیر کا نمبر ملایا۔ کافی دیر تک رینگ جاتی رہی۔ شاید وہ پوری طرح نیند میں ڈوبا ہوا

تھا۔ میں مایوس ہو کر کال آف کرنے جا رہا تھا کہ ادھر سے سفیر کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ”آپ پہنچ گئے

کیا؟“

”نہیں ابھی میں کافی دور ہوں۔ ایک کام کرنا ہے۔ کل صبح دکائیں کھلتے ہی ایک زیرو میٹر بایک لے کر

اس ایڈریس پر پہنچا دینا ہے۔“ پھر میں نے موبائل ان صاحب کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”آپ اپنے گھر کا پتا اسے

سمجھا دیں۔ اس کے علاوہ میری طرف سے ایک فریج اور ایک ایل ای ڈی بھی پہنچ جائے گی۔“

ان صاحب کے چہرے پر ہزار پاور کی چمک آگئی۔ وہ خوشی خوشی سفیر کو اپنا پتا سمجھانے لگے۔ پھر میں نے

موبائل لے کر سفیر سے کہا۔ ”ایک ایل ای ڈی اور ایک بڑے سائز کا فریج بھی پہنچا دینا ہے۔“

”لیکن آپ پہنچ کب رہے ہیں؟ اور یہ سب کیا ہے؟“

”ایک لڑکی کو جہیز میں دینا ہے۔ برات لوٹ رہی تھی اسی لیے میں نے دخل دیا ہے۔“

”گویا اب یہ ایک نیا اکاؤنٹ کھل گیا۔“ سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور بھی کچھ دینا ہے تو بتادیں۔ میں

اپنی طرف سے بھی کچھ دے دوں گا۔“

”یار بیٹی کی شادی ہے، جو دے سکتا ہے دے دینا۔ اب آرام سے سو جا۔“ موبائل بند کر کے میں نے ان

صاحب سے کہا۔ ”اور ہاں آپ جس جس چیز کی فرمائش کریں گے میں پورا کرتا جاؤں گا لیکن یاد رکھیں اگر لڑکی کو

کوئی تکلیف ہوئی۔ اس نے کوئی شکایت کی تو میں سود سمیت واپس لوں گا۔ یہ لیجئے کچھ نقد رقم بھی رکھ لیں۔ اگر

اور چاہیے تو وہ بھی پنڈی میں مل جائے گا۔“

نوٹوں کی گڈی دیکھ کر اس کے چہرے پر لرزاسا طاری ہو گیا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا کہ اسے اتنا کچھ ملے گا اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، بیٹے مجھے پنڈی پہنچنے دو۔ ایسا سبق دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔

وہ نوٹ جیب میں رکھ رہا تھا کہ میں نے اس سے کہا کہ لڑکے کو تو بلائیں۔ لڑکا بھی مہمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ اندر بھی نہیں گیا تھا۔ بھائی کے بلاتے ہی وہ اٹھ کر آ گیا۔ اس کے چہرے سے شرارت نپک رہی تھی، میں نے دل میں کہا، بیٹے ساری اکڑفون نہ نکالی تو میرا نام نہیں لیکن اس وقت تو مجھے کام نکالنا تھا اس لیے میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”بیٹے یہ میرا نمبر ہے۔ پنڈی پہنچ کر مجھ سے رابطہ کرنا۔“

اس نے بھائی کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ”جی ضرور۔“
دراصل اس نے بھائی کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ بات بن گئی ہے۔ ایسے لالچی لوگوں کو سزا دینا ضروری ہے تاکہ یہ سلسلہ دراز نہ ہو۔ قانون نافذ کرنے والے اگر اپنی ڈیوٹی بہتر انداز میں کریں تو قانون شکنی کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ سزا نہ ہونے کی وجہ سے ہی برائی پھیلتی ہے۔
اس کام کو انجام دے کر میں بہت حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ اتنا اہم مسئلہ میں نے چٹکی بجاتے حل کر دیا تھا اس وجہ سے منیر کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ قدم بہ قدم بچھا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”بھائی میاں جس کام سے میں آیا تھا وہ کر دیا۔ اب مجھے اجازت دو تاکہ میں باقی کا سفر بھی پورا کر سکوں۔ مجھے ابھی آگے بھی جانا ہے۔“
”صاحب جی ایسے کیسے جانے دوں۔ کھانا گرم ہو رہا ہے۔ دو چار نوالہ ہی سہی کھالیں تو میری عزت افزائی ہوگی۔“ وہ اتنے معصوم انداز میں بولا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا اور وہیں مہمانوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے دیکھ لڑکے کا بھائی کبیر بھی وہیں آ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”بھائی صاحب آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ آپ بہت پیسے والے ہو۔ منیر سے کیا رشتے داری ہے؟“
”انسانیت کا رشتہ ہے۔ بیٹی سب کی ساجھی ہوتی ہے۔ اس کی بیٹی کی ڈولی اٹھ نہیں پارہی تھی اس لیے میں آیا۔“ میں نے پلاؤ کا لقمہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”سرجی اس کے مطلب ہے کہ آپ بڑے دل والے ہیں۔“
”اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کا حکم دیا ہے لیکن ہم سب حسد و نفاق کے بیج بوکر گناہ کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں اور پھر اللہ سے اچھائی کی امید بھی لگائے بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی نہیں چاہتا ہے انسانوں کا معاشرہ غلط رخ پر بڑھے۔ اگر کوئی غلطی کر رہا ہے تو اسے احساس دلائیں کہ وہ غلط کر رہا ہے۔ میری کوئی بیٹی نہیں ہے لیکن میں ایک باپ کا درد جانتا ہوں..... اسے جب یہ خبر ملی ہوگی کہ آپ لوگ برات واپس لے جا رہے ہیں تو سوچیں اس کے دل پر کیسی چوٹ لگی ہوگی۔ انسان کی خدمت بھی عبادت ہے اور میں نے وہی کیا۔“

میری تقریر پر اس نے سر جھکا لیا تھا۔ جو کام تیر و نشتر نہیں کر پاتے وہ بیٹھے بول کر جاتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ہند میں پھیلا اسلام ہے۔ یہاں نہ تو کسی بادشاہ نے بزور طاقت اسلام پھیلایا نہ سیاست کی بازی گری

دکھائی، اولیا کرام آئے۔ انہوں نے شفقت و محبت کا مظاہر کیا۔ لوگوں کے دلوں میں اپنا احترام پیدا کیا اور اسلام پھیلتا چلا گیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ زباں شیریں، ملک گیری۔ بیٹھے بول کا اپنا جادو ہے۔ میری اس چھوٹی سی تقریر نے اسے یاد دلایا ہوگا کہ اس کے سینے میں بھی دل ہے۔ اور شاید اسے بھی کسی نے کسی پریشانی سے کبھی نہ کبھی نجات دلائی ہوگی ورنہ اس کا سر اس طرح جھکتا نہیں۔

اسے فکر میں غلطاں دیکھ کر اس کے چہرے پر ابھرائی پشیمانی کے عکس کو محسوس کرتے ہوئے میں نے ایک اور چوٹ کی۔ ”ہر انسان کے شانوں کر انا پر کاتبین بھی ہیں اور وہ اس کے ہر عمل کا حساب لکھتے جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ اپنے حصے کی آگ خود بندہ لے کر جہنم جائے گا۔“

”اور جہنم میں جو آگ جل رہی ہے اس کا کیا ہوگا؟“ ایک شخص جو بڑے غور سے پاس کھڑا میری باتیں سن رہا تھا اس نے کہا۔

”جہنم میں شاید آگ نہ ہو۔ کیونکہ اعمال انسان کے ساتھ ہوگا اور برے اعمال کی آگ اس کی کوپورا کرے گی۔ اب یہی دیکھ لو۔ اگر یہ شادی نہ ہوتی تو کیا تم لوگ آتے؟ نہیں نا..... یہ شادی تمہارے آنے کی وجہ بنی۔ اسی طرح جلانے کی وجہ خود اس کا اعمال بنے گا۔“ کہہ کر میں نے کبیر پر نظر ڈالی پھر کہا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ شرمندہ ہے۔ میں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”اگر یہ شادی نہیں ہوتی اور برات واپس چلی جاتی تو کیا ہوتا؟ لڑکی کی شادی کرانا۔ شادی میں مدد دینا ثواب کا کام ہے۔ اور برات لوٹ جاتی تو ثواب خود بخود گناہ میں بدل جاتا۔ اس کی سزا بھی ملتی۔ مجھے تو حیرت ہے کہ ایسا کام کبیر صاحب نے کیسے کیا۔“

”یہ غلطی مجھ سے ہوئی ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔“ کبیر نے کہا۔ ”ایک شخص نے مجھے یہ ڈیوٹی دی تھی کہ میں کسی بھی حالت میں یہ شادی روک دوں۔ میں نے اس شخص سے کہا تھا کہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔ اگر شادی سے انکار ہوگا تو لوگ مجھے برا کہیں گے۔ تب اس نے مجھے پانچ ہزار روپے دیئے کہ یہ انعام ہے۔ اگر شادی رک گئی تو اور بھی دوں گا۔“

میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا کہ یہ کام کسی ایسے شخص کا ہے جو اس لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے پاس رقم بھی وافر ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کو خرید رہا ہے۔ یہ گاؤں ایسا نہیں تھا کہ یہاں کے لوگ معمولی باتوں پر دولت کی نمائش کریں۔ گاؤں کے حالات بتا رہے تھے کہ یہاں والے ترستی ہوئی زندگی گزار رہے ہیں جو ہمارے وطن کے نوے فیصد گاؤں کا مقدر ہے۔ اس گاؤں میں صرف ایک آدمی ایسا ہے جو ایسی حرکتیں کر سکتا ہے۔ اور اس کا نام منیر نے لیا بھی تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ چودھری اس کی بیٹی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ان حرکات کی وجہ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے یہ کھیل بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔

ایک باپ کے لیے بیٹی کی رخصتی حد سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر انتظامات کرے۔ ایسی رخصتی ہو کہ لوگ یاد رکھیں۔ منیر نے بھی کچھ ایسا ہی سوچا ہوگا۔ اس سلسلے میں اس نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے۔ ایسے وقت چودھری خود آگے آیا ہوگا۔

اس نے منیر کو ادھار دینے کے وعدے پر شادی کے انتظامات پر اکسایا ہوگا۔ جب اس بے چارے نے اپنی تمام جمع پونجی شادی کی تیاری پر لگا دی تو اس نے ادھار دینے سے منع کر دیا۔ یعنی بیچ منجھدار میں لا کر چھوڑ

دیا۔ ابھی منیر اس مسئلہ کا حل تلاش کر ہی رہا تھا کہ چودھری نے کبیر کو تلاش کیا اور اسے رقم دے کر پورا منظر نامہ تبدیل کر دینے پر اسے راضی کر لیا۔ عین وقت پر بے چارہ منیر بایک کہاں سے دلا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ برات واپس چلی جاتی پھر کچھ دن کے بعد لڑکی کو طلاق مل جاتی۔ غریب گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی ایسے ہی مشکل امر ہے۔ طلاق یافتہ کے لیے تو بہت ہی مشکل۔ تب وہ چودھری آگے آتا اور لڑکی کو اپنے نکاح میں لے لیتا۔ اب مجھے اس چودھری پر غصہ آنے لگا تھا۔ میری ذہنی رُو بہک اٹھی میں نے منیر سے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ کہ اس وقت چودھری کہاں ملے گا؟“

”صاحب جی، ابھی میری لڑکی گھر میں ہے۔ اگر اس نے کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا تو مشکل ہو جائے گی۔“ منیر نے التجائیہ انداز میں کہا۔

”جی ہاں جناب۔ گواہی کے لیے آپ مجھے بھی طلب کریں گے اور وہ میرا دشمن بن جائے گا۔ جو ہو گیا اسے بھلا دینا ہی مناسب ہے۔ اب فکر کی بات یہ ہے کہ میں اسے رقم کیسے واپس کروں؟“ کبیر افسردہ لہجے میں دلا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ اب چودھری سے نمٹنا میرا کام ہے۔ منیر صاحب کی وجہ سے اس وقت تو میں خاموش رہ جاتا ہوں۔“ میرے اس جملے نے کبیر پر جادو جیسا اثر دکھایا، وہ مطمئن ہو گیا۔

”آپ لوگ رخصتی کی تیاری کریں۔ مجھے بھی واپسی کی جلدی ہے۔“ میں نے کبیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ ڈرائیور کی جانب بھاگا۔ منیر گھر کے اندر چلا گیا۔ تاکہ جلدی جلدی رسم ادا کر سکے۔ شہزاد جواب تک خاموش تماشا ہی بنا ہوا تھا اس نے کہا۔ ”صاحب جی میں بھی گاڑی نکالوں؟“

”بالکل۔ اب یہاں رکنے کا فائدہ؟“

عین اسی وقت منیر پریشانی کی حالت میں دوڑتا ہوا گھر کے اندر سے نکلا۔ وہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ کوئی انہونی ہو گئی ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھتا کہ اسے لوگوں سے دور ہی روک لوں اور وجہ پوچھ لوں۔

ابھی شامیانے سے وہ دور ہی تھا کہ میں نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ ”کیا ہوا۔ اتنے پریشان کیوں ہو؟“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”غضب ہو گیا۔ میں نے اپنی بیٹی کو آٹھ جماعتیں پڑھوا کر بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔“

”ہوا کیا، کھل کر بتاؤ۔“

”صاحب جی وہ فلم والیوں کی طرح تن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ اسے طلاق دلائی جائے۔ وہ اس بندے کے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہے۔“

”کیوں کیوں؟“ میں بھی الجھ گیا تھا۔ کہانی نے ایک نیا رخ لے لیا تھا۔ گاؤں کی ایک معمولی پڑھی لکھی لڑکی نے یہ ہمت کیسے کر دی، میں بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کہیں اس کے پیچھے کوئی عشق عاشقی کا چکر تو نہیں ہے میں اس رخ پر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ فلم ڈرامے، فیس بک انٹرنیٹ نئی پود کو بہکانے میں بہت بڑا کردار ادا کر رہی

ہیں۔ جب سے موبائل میں نیٹ کا آپشن آیا ہے تو یہ رابطے کی سائٹس نے اور زیادہ مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ گاؤں گاؤں کے بچے استعمال کرنے لگے ہیں۔ شاید یہ اسی کا اثر ہے۔

”صاحب جی اب کیا ہوگا؟“ منیر نے رنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

”کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں کیوں نہیں۔ وہ آپ کی بھی بیٹی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”چلو!“ میں نے اشارہ کیا۔

وہ مجھے لے کر اندر کی جانب چلا۔ وہاں بیٹھے تمام لوگ منیر کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ عجوبہ ہو۔ صبح ہو چکی تھی اس لیے گاؤں میں چہل پہل نظر آنے لگی تھی کچھ ایسے لوگ بھی وہاں آکھڑے ہوئے تھے جو ابھی ابھی اپنے گھروں سے برآمد ہوئے تھے۔ میں ان لوگوں کا جائزہ لیتا ہوا منیر کے گھر میں داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ دوسرے کمرے میں بچی کو دلہن بنا کر بٹھایا گیا تھا۔ وہ مجھے اس کمرے تک لے گیا۔ لڑکی نے شادی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کے گرد کئی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ ”بیٹی میں تمہارے لیے اجنبی ہوں لیکن اگر تم چاہو تو مجھے چچا کہہ سکتی ہو، اسی رشتے سے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ وہی صاحب ہیں نا جنہوں نے بایک دینے کا کہا ہے؟“ لڑکی نے جھکے سر کے ساتھ سوال کیا۔

”ہاں بیٹی!“ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر چاہو تو میں اس کمرے کو خالی کر ادوں۔ تاکہ تم بلا جھجک اکیلے میں جواب دے سکو۔“

”جی نہیں۔ میں جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہوں سب کے سامنے کہوں گی۔ اگر ان میں ہمت ہے تو میری باتیں سن سکتی ہیں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر کہا۔ ”زمانہ بدل رہا ہے۔ اب وہ حالات نہیں رہے کہ لڑکیاں اللہ میاں کی گائے کہلائیں۔ ہم بھی انسان ہیں۔ ہمارے سینے میں بھی دل ہے۔ دل میں ارمان ہے۔ ہماری بھی پسند نا پسند ہے۔ میں اس لالچی لڑکے کے ساتھ کیسے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا خواب دیکھوں جس کے دل میں ایک اچھی بیوی کی نہیں زیر و میٹر بایک کی خواہش ہو۔ نہیں میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہ کل کو کسی اور بڑی چیز کے لیے مجھے بیچنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔“

”اے لڑکی تُو یہ کیا بول رہی ہے۔“ وہیں کھڑی ایک عورت نے اسے ڈنٹا۔

”خالہ مانے تُو بیچ میں مت بول میں جو کہہ رہی ہوں یہ ان صاحب کو سمجھنے دے۔“ لڑکی نے جھنجھلا کر

جواب دیا۔

میں خالہ مانے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ان کے پیچھے کھڑے کبیر پر نظر پڑی۔ اس کا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔ وہ بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ الٹی آنت گلے پڑ گئی ہے۔ لڑکی گاؤں کی ضرور ہے لیکن وہ دسویں صدی کی نہیں ہے۔ میں نے کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ سن رہے ہیں۔ یہ بہادر بچی کیا کہہ رہی ہے؟“

”جی جی اس کی زبان بہت تیز ہے۔ اس کا گزارہ شاید ہی ہمارے ہاں ہو۔“

”آپ جو کوئی بھی ہوں میں آپ کو نہیں جانتی لیکن اسلام کو جانتی ہوں۔ اگر آپ کو نہیں معلوم تو آپ کسی عالم دین سے معلوم کریں وہ آپ کو بتائے گا۔ اسلام کا پہلا حکم ہے کہ نکاح تجھی ہو سکتا ہے جب لڑکی راضی ہو۔“

تاریخ پڑھیں، صحابہ کرام کے دور میں کئی لڑکیوں کا ذکر مل جائے گا جنہوں نے اپنی رضادی تب گھر والوں نے پیغام بھیجا یا قبول کیا۔ اسلام نے عورتوں کو شادی کے سلسلہ میں زیادہ اختیار دیا ہے۔ اسی اختیار کے تحت میں نے فیصلہ کیا ہے کہ چند گھنٹے پہلے جو نکاح کے نام سے میرے ساتھ کھیل کھیلا گیا ہے۔ اسے ختم کیا جائے اور مجھے طلاق دی جائے۔ میں کسی بھی حالت میں ایسے لالچی شخص کا گھر بنا نہیں سکتی۔“

میں نے مڑ کر کبیر صاحب سے کہا۔ ”آپ نے سن لیا..... لڑکی آپ کے ہاں جانے پر تیار نہیں۔“

”جی جی۔“ کبیر نے انک انک کر جواب دیا۔

”اس لیے آپ لڑکے سے کہیں کہ وہ ابھی اور اسی وقت لڑکی کو طلاق دے اور آپ اپنے برائیوں کو لے کر جاسکتے ہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

”اور وہ بایک؟، وہ روپیہ۔“

”روپے آپ لے جاسکتے ہیں۔ میں دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔ میں سمجھوں گا کہ وہ رقم میری اس بیٹی کی جان کا صدقہ ہے۔ اب ایک منٹ کے اندر چل دیں۔“

”لیکن.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہاں کھڑے ہوئے ایک شخص نے جواب میں کہا:

”تم جاتے ہو یا اپنی خاطر داری کرا کر جاؤ گے۔ یہ ہمارے گاؤں کی عزت ہے۔ اس نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کو کوئی پسند کرے یا نہ کرے لیکن میں پسند کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہوں۔“

”بالکل یہ سچ کہہ رہی ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ لڑکی کی پہلے مرضی معلوم کرو پھر اس کی شادی کرو۔ اس کی مرضی نہیں ہے۔ اس لیے یہ شادی ہوئی ہی نہیں۔“ ایک باریش شخص نے کہا جواب تک خاموش تھا۔ ”اس لڑکے سے کہو کہ ابھی اور اسی وقت وہ اسے طلاق دے اور میں اپنے بیٹے کی اسے دلہن بناؤں گا۔ میرا اسد لاہور میں ہے۔ وہ وہاں دکان کرتا ہے۔ اپنی دکان ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تین کپڑوں میں بیٹی کو لے جاؤں گا۔“

”اگر یہ آپ کا فیصلہ ہے تو بھی میں اسے بھرپور جہیز دوں گا۔ آپ میرا نمبر رکھ لیں۔ جس دن نکاح ہوگا مجھے فون کر دیجئے گا۔ سب کچھ آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے پنڈی پہنچنا ہے۔“ میں نے کہا اور مڑ گیا۔

اسی وقت لڑکی نے کہا۔ ”انکل آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا۔ آپ ہی کی وجہ سے مجھے حوصلہ ملا اور نہ میں اس بے باکی سے کبھی اتنے بڑے مسئلہ میں بول نہیں سکتی تھی۔ اس لیے میری التجا ہے کہ نکاح کے وقت آپ ضرور آئیے گا۔“

”بالکل آؤں گا۔ نہ صرف میں بلکہ میرے ساتھ اور بھی بہت سارے لوگ ہوں گے۔ میرے تمام ساتھی۔“ کہہ کر میں نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور باہر نکل آیا۔

باہر آ کر دیکھا کہ ایک مولوی صاحب دری پر بیٹھے ہیں۔ تمام براتی جا چکے تھے۔ مولوی صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”یہ طلاق نامہ وہ لوگ دے گئے ہیں۔ اس پر گواہ میں آپ کے ڈرائیور کا نام بھی لکھ دیا ہے۔“

”تو جناب یہ کاغذ میر صاحب کو دے دیں۔ میں تو پنڈی جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور ایسولنس کی طرف

قدم بڑھا دیا۔

شہزاد اسٹیرنگ پر سر رکھے سو رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی اور چلنے کو کہا۔ وہ تو گویا منتظر تھا۔ فوراً چل پڑا۔ اب ہم دوبارہ سے پنڈی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہم انسان بھی کتنے مجبور ہیں۔ کبھی قسمت کو شکست دے ہی نہیں سکتے۔ بڑی بڑی پلاننگ کر لیتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہو۔ اب ہمیں کہاں پتا تھا کہ ہم پنڈی جاتے جاتے ایک اتنا ہم کام سرانجام دے دیں گے۔ ہم تو قتل و خوں ریزی کی نیت سے پنڈی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مرشد سے ٹکرانا، اسے خاک میں ملانے کا منصوبہ تھا ہمارا اور قسمت نے میرے ذریعہ ایک لڑکی کی زندگی سنوار دی۔

کچھ راستے پر اچھلتی، جھٹکے کھاتی ایسبولینس میں بیٹھا میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد جب ہم مین روڈ پر آئے تو سامنے وہی ہوٹل تھا جس پر ہم رات میں رکے تھے اور جہاں منیر کو افسردہ سا پایا تھا۔ میں نے ہوٹل دیکھ کر کہا۔ ”کیوں نا ایک ایک کپ چائے پی لی جائے۔“ دراصل مجھے یاد آ گیا تھا کہ شہزاد نے کہا تھا کہ وہ چائے کا دیوانہ ہے۔ اسے چائے نہ ملے تو وہ مردنی میں گرفتار رہتا ہے۔ شہزاد خوش ہو گیا۔ اس نے ہوٹل کے سامنے ایسبولنس روک کر آواز دی۔ اس کی آواز پر ایک چھوٹا سا بچہ بھاگتا ہوا آیا اور چائے کا آرڈر لے کر چلا گیا۔

چائے پی کر ہم دوبارہ سے سفر پر چل پڑے۔ اب سڑک پر کافی ٹریفک نظر آنے لگی تھی۔ وہ اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی گونجی۔ اتنی تیز گھنٹی تھی کہ میں بھی چونک گیا۔ شہزاد نے ڈیش بورڈ کے خانے سے موبائل نکالا اور کان سے لگا کر بولا۔ ”ہیلو۔“

دوسری جانب کی بات سن کر وہ بولا۔ ”ارے نہیں ابھی ہم پنڈی سے بہت پیچھے ہیں۔ ایک گھنٹے سے زیادہ لگے گا وہاں تک پہنچنے میں۔ راستے میں ایک مسئلہ ہو گیا تھا ہم لوگ حل کرنے رک گئے تھے۔ یہ صاحب جی تو بڑے رحم دل ہیں۔ انہوں نے ایک لڑکی کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ واپس آ کر پوری کہانی سناؤں گا۔ تم یقین نہیں کرو گی کہ صاحب جی کتنے بڑے دل والے ہیں۔“ دوسری جانب کی بات سن کر اس نے کہا۔ ”اچھا اچھا۔ تم سنبھال لینا۔ ان سے کوئی بہانہ کر دینا۔ میں دوپہر کے بعد ہی پہنچوں گا۔ تمہارے لیے کیا لیتا آؤں؟“

باتیں ختم کر کے اس نے موبائل کو دوبارہ سے ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھا پھر مجھ سے بولا۔ ”صاحب جی، آپ گریٹ ہو۔ میں بتا نہیں سکتا کہ آپ کی عزت میرے دل میں کتنی بڑھ گئی ہے۔“

”میں انسان ہوں اس لیے دوسرے انسان کا دکھ درد مجھے اپنا اپنا سا لگتا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”نہیں سر آپ انسان سے بڑھ کر ہیں۔ مثل فرشتہ ہیں فرشتہ۔“

اس کی بات پر میں مسکرا کر رہ گیا۔ مگر بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ”غالب کا ایک شعر ہے۔“ ”آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔“ بھائی میرے آدمی ہی بن جاؤں تو یہ بہت ہے۔“

”یہ آپ کا بڑا پین ہے۔ میں تو آپ کا معتقد بن گیا ہوں۔ میری کوشش رہے گی کہ آپ سے رابطے میں رہوں۔“ اس نے وینڈ اسکرین پر نظریں جما کر کہا۔

پنڈی قریب آتا جا رہا تھا۔ میرا ایک سفر ختم ہونے کے قریب تھا۔ اب ایک اور مرحلہ قریب تھا جس کی

کامیابی میری زندگی کی راہ کو بدلنے میں اہم کردار ادا کرتی۔ اب تک میں یہی سوچتا رہا تھا کہ کسی بھی طرح مرشد میرے راستے سے ہٹ جائے اور مجھے اپنی زندگی جینے دے لیکن وہ ایک ایسی کتے کی دم بن چکا تھا کہ جو ہزار سال نگی میں رکھنے کے بعد بھی سیدھی ہونے کا نام نہ لے، وہ مجھے ہر گام پر ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ اب میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اسے بھرپور سبق سکھاؤں گا۔ یہ جنگ آخری ثابت ہو یہی سوچ کر میں پنڈی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پنڈی جہاں سے میری زندگی نے کئی اہم موڑ لیے۔ جہاں کئی معرکے سر کیے۔ اب سب سے اہم معرکے کا گواہ بننے جا رہا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کامیابی کس کے مقدر میں ہے۔ اب یا تو وہ مکمل طور پر تباہ ہو گا یا میں اپنی جان دے دوں گا تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔

لیکن یہ معرکہ کیسے سر ہو۔ میں کیا کروں کس طرح مرشد کو اس کی اوقات دکھاؤں اسی پر غور کر رہا تھا کہ شہزاد نے کہا۔ ”زیر و مائیل قریب آرہا ہے۔ یہاں سے کس طرف مڑنا ہے۔“

”بس تم مجھے وہیں اتار دینا۔ میرے دوست وہاں موجود ہوں گے یا پھر آتے ہوں گے اس لیے کہ وہیں پران سے ملنے کی بات ہوئی ہے۔“

”جی اچھا۔ میں آپ کو اتار کر انتظار کروں گا یا چلا جاؤں۔“

”میرے خیال میں چلے جانا ہی بہتر ہے اس لیے کہ وہاں تمہاری بیگم منتظر ہوگی۔ وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کچھ بھی ہو سر..... میں آپ کو زندگی بھر نہیں بھول سکتا ہے اس لیے کہ جب آپ کو دیکھا تھا تو آپ کا ایک دوسرا روپ تھا لیکن جب آپ کا ساتھ ہوا تو پتا چلا کہ آپ کے سینے میں سونے کا دل ہے۔ کسی اجنبی کے لیے آپ کس طرح قربانی دیتے ہیں اس کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔“

”زندگی رہی تو ہم ملاقات کرتے رہیں گے۔ میرا نمبر تم محفوظ کر لو۔ جب موقع ملے مجھ سے رابطہ کر لینا۔ اگر نمبر بند ملے تو میسج کر دینا۔ جب بھی میں موبائل کھولوں گا۔ ٹیکسٹ میسج آجائے گا۔“ میں نے کہا۔

دن پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھا۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ٹریفک آہستہ آہستہ پہلے سے بہت زیادہ نظر آرہی تھی۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ اب ہم پنڈی کے بہت نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اور دن بھی نکل آیا تھا۔

”سرجی ایک بات بولو۔“ شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں بولو۔“ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”سر آپ کا اصل کام کیا ہے؟“

”لوگوں کی مدد کرنا۔ جو تم نے دیکھا۔“

”نہیں سر..... اصل پیشہ بتائیں نا۔“

”فی الحال تو میں بیکار ہوں۔ ویسے دہلی سے مال لا کر بیچتا ہوں، کبھی پارٹی بُری بھی مل جاتی ہے جیسی ایک پارٹی سے سودا ہو کر بھی نہیں ہوا۔ اٹے وہ میری جان کا دشمن بن گیا۔ جس سے بچنے کے لیے میں تمہارے ہاں چھپا تھا۔“

”اس کے معنی یہ ہے کہ آپ کا کام غیر قانونی ہے اسی لیے پارٹی بے ایمانی پر اتر آئی ہوگی۔ کیونکہ

ایمانداری پر پارٹی بھڑکتی نہیں ہے۔ کیا لاتے ہیں؟“
 میں سمجھ گیا کہ وہ اندازہ لگانا چاہتا ہے۔ جو خود مرغان بن رہا ہوا اسے کون روک سکتا ہے۔ اس نے جب مجھے
 اسمگلر سمجھ ہی لیا تو میں بھی اس کے خیال کو تقویت دینے کے لیے بولا۔ ”سونا لاتا ہوں۔“
 ”اوہ..... اس کے معنی ہیں کہ آپ نے خاصی رقم انوسٹ کر رکھی ہے اس لیے کہ سونے کی کھپ لانے
 کے لیے بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔“
 ”یہی کوئی ڈھائی کروڑ پھنسے ہوئے ہیں۔“
 ”اگر برانہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟“
 ”بولو۔“

”ایسے کام میں فائدہ تو بہت ہے۔ ایک پھیرے میں لوگ اپنی رقم کئی گنا زیادہ کر لیتے ہیں لیکن اس میں
 برکت بالکل نہیں ہوتی۔ اتنی ہی رقم اگر آپ کسی اچھے بزنس میں لگا دیں تو وہ آپ کا وقار بلند کر دے گی۔“
 ”وقت آئے گا تو اس پر بھی سوچوں گا۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے ایک اور جھوٹ بولا۔
 باتوں کا سلسلہ چل پڑے تو وقت کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم زیرو مائیل کے
 قریب پہنچ چکے تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ اب اس سے آگے جانا نہیں ہے۔ میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔ ”بس
 بھائی اس سامنے والی دکان کے سامنے مجھے اتار دو۔ یہیں پر میرا دوست آئے گا۔“
 ”جی اچھا۔“ کہہ کر اس نے میری بتائی ہوئی جگہ پر گاڑی روک دی۔
 میں نے نیچے اتر کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ”زندگی رہی تو ان شاء اللہ ہم ضرور ملیں گے۔“ کہہ کر میں
 سامنے نظر آنے والے چائے کے ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔
 شہزاد نے گاڑی موڑ لی اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر تک میں اس کی جاتی ہوئی ایسبونس کو
 دیکھتا رہا پھر میں نے جیب سے موبائل نکالا اور سفیر کا نمبر ملا یا۔ پہلی ہی گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا۔
 ”کہاں رک گئے۔ ہم سب انتظار میں بیٹھے ہیں۔“ اس نے چھوٹے ہی سوال کر دیا۔ میں نے جواب
 میں کہا:

”بھائی دم تو لینے دو۔ ابھی ابھی میں زیرو مائیل پر اتر اہوں۔“
 ”آپ جس جگہ اترے ہیں اس کی نشانی بتائیں۔ میں خود آ رہا ہوں۔“
 ”ایسا کرو کہ مرتجس کو بھیج دو۔ میں خود آ جاؤں گا۔“
 ”ہم سب آرہے ہیں۔ استقبال کرنا ہی ہے تو ذرا الگ انداز سے کریں۔“ سفیر کے عقب سے وسیم نے
 چیخ کر کہا۔ اس کے ساتھ عبداللہ کی بھی آواز سنائی دی کہ میں بھی ساتھ آ رہا ہوں۔
 گویا سب کے سب آرہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دوست ہی ایسے دیئے ہیں کہ میں جتنا شکر ادا کروں
 کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے پھانس بھی چبھے تو یہ سب بے چین ہو جانے والوں میں سے ہیں۔ میں ابھی ان
 لوگوں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی پھر سے بج اٹھی۔ نمبر نیا تھا۔ ریسیو کر کے کان سے لگایا ہی
 تھا کہ ایک بندہ چائے کے ہوٹل میں داخل ہوا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ پورے

ہال پر نظر دوڑانے کے بعد وہ سیدھا میری ٹیبل پر آیا اور بولا۔ ”صاحب جی۔ میڈم آپ کو بلا رہی ہیں۔“
”مجھے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”میڈم نے کہا ہے کہ اندر شہباز صاحب ہیں انہیں باہر بلا لاؤ۔“
میں نے کال ریسیو نہیں کئی اور کال کاٹ دی اس لیے کہ ادھر سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں اس کے ساتھ باہر کی جانب بڑھا۔ ابھی میں نے ہوٹل سے نکل کر سڑک پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ساتھ کئی لوگ مجھ سے چمٹ گئے۔ ان کا انداز اناڑیوں جیسا تھا۔ وہ صرف چمٹے تھے کہ میری ناک پر آ کر ایک رومال جم گیا۔ میں نے دھیمی دھیمی میٹھی خوشبو محسوس کرتے ہی سانس روک لی تھی کہ مجھ سے چمٹنے والوں میں سے کسی نے کہا۔ ”اس کے ساتھی آتے ہوں گے۔ جلدی کرو۔“

اس کا کہنا ہی تھا کہ کسی نے ایک عجیب حرکت کی۔ میری بغل میں انگلی ڈال کر گدگدانا شروع کر دیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے جو سانس روک لی تھی وہ ممکن نہ رہی اور ایک بڑی سانس اندر چلی گئی۔ سانس کے اندر جاتے ہی وہی ہوا جس کا اندازہ تھا۔ میرا سر چکرایا اور ہاتھ پیروں کی قوت ختم ہو گئی۔ پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔



نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں ایک ایسے کمرے میں تھا جس کی چھت سلیب سے بنی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر سے نظر ہٹا کر داہنی جانب دیکھا۔ ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ معمولی انداز کی کرسی۔ میں نے اٹھنا چاہا تھا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ پیر ناکوں کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ جس کسی نے بھی باندھا تھا۔ بڑی استادی سے باندھا تھا۔ چار پائی کے ساتھ اس طرح باندھا گیا تھا کہ میں نہ ہاتھ ہلا سکتا تھا اور نہ پیر۔ چار پائی بھی جہازی ساز کی تھی۔ خوب بڑی سی۔ چار پائی پر بستر بھی نہیں تھا۔ اس کھر در کی چار پائی پر میں بے یار و مددگار پیٹھ کے بل لیٹا سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں کتنا وقت گزرا اور اس وقت کیا بج رہا ہے۔ کمرے میں ادھر ادھر نظر ڈالی۔ بہت معمولی انداز کا سامان نظر آیا۔ دیوار پر نظریں دوڑائیں لیکن کوئی گھڑی نظر نہ آئی کہ میں ٹائم دیکھ سکتا۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ میں نے سفیر کو کال کی تھی اور وہ سب لوگ وہاں آ گئے ہوں گے۔ مجھے نہ پا کر وہ سب پریشان ہوں گے۔ میرا ہاتھ جیب تک پہنچ نہیں سکتا تھا کہ ٹول کر میں دیکھ سکتا کہ جیب میں موبائل ہے یا نہیں۔

ان لوگوں نے مجھے جس طرح باندھا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے میری مکمل تلاشی لی ہے اور جو کچھ بھی جیب سے نکلا ہوگا اسے مال غنیمت سمجھ کر رکھ لیا ہوگا۔ یعنی کہ انہوں نے موبائل بھی نہیں چھوڑا ہوگا۔ اب میں اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ کوئی آ کر کھولتا نہیں لیکن میں نے اپنی کوشش بھی ترک نہیں کی۔ اسی طرح سے پیروں کو آگے پیچھے کرنے لگا۔ کہ شاید رسی کچھ ڈھیلی ہو جائے۔ رسی ڈھیلی کیا ہوتی پیروں کی جلد پر جلن ہونے لگی۔ شاید جلد چھل رہی تھی۔ میں نے پیروں کو کچھ دیر کے لیے آرام دیا اور کلائی کو موڑنے لگا۔ کبھی کلائی سیدھی کرتا اور کبھی کلائی کو ہلکا سا گھماتا۔ اس کام میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تب میں نے سر ڈال دیا اور کسی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ کچھ پل بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ آنے والوں کے پلان کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

وہ تعداد میں دو تھے۔ انہوں نے اندر آتے ہی کہا۔ ”میں نے منع کیا تھا اسے اسپیشل ڈوز نہ دو پھر بھی انہوں نے اسے کلوفارم کے بعد بھی انجکشن لگا دیا۔ اب یہ کم سے کم دو گھنٹے کیا پانچ گھنٹے تک زندہ لاش بنا رہے گا۔ اسے اٹھا اٹھا کر ڈھوتے رہنا ہمارا سر درد بن گیا ہے۔“

”اوے تُو ایسے بول رہا ہے جیسے یہ کام ٹو مفت میں کرتا ہے۔ تجھے پیسے ملتے ہیں پیسے۔ ایسے ہی تو یہاں نہیں آگیا۔“ بولنے والا میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میں کچھ حد تک مطمئن ہو گیا کہ وہ مغالطہ میں ہیں۔ ان کے خیال سے مجھ پر ان کی دوا اثر کر گئی ہے۔ شاید ایسا ہی ہوتا۔ اس لیے کہ میں بھی انسان ہوں لیکن بھلا ہو حکیم قابوس کا کہ اس نے ایسی دوا استعمال کرائی کہ میرے اندر مدافعت کی لامحدود قوت پیدا ہو گئی۔ زخم جلدی بھرنے لگے۔ چوٹ اثر کھونے لگی۔ نشہ آور یا ضرر رساں ادویہ کا اثر جلد ختم ہونے لگا۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا کہ جو دوا دی گئی تھی اس کا اثر وقت سے پہلے ختم ہو گیا، لیکن میں نے انہیں احساس نہ ہونے دیا کہ میں ہوش میں آچکا ہوں۔ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ وہ شخص آہستہ آہستہ میرے قریب آگیا۔ میں نے احساسات کی نگاہوں سے اسے دیکھنا چاہا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ میری پوری قوت سماعت اس کے پیروں کی چاپ پر مرکوز تھی۔ وہ میری چار پائی کے بالکل قریب آچکا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے پیروں کی جگہ کھل گئی ہے۔ میں نے پوئے اٹھا کر پلوں کی جھری سے دیکھا۔ اس خفیف سے روزن میں اس کا پورا قد آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور وہ میرے پیروں میں بندھی رسی کو کاٹ رہا تھا۔ تبھی اس کے ساتھی نے کہا۔ ”دیکھ کہیں یہ ہوش میں نہ آجائے۔“

”اتنا آسان نہیں ہے۔ تم لوگوں نے ایکسٹرا ڈوز اسے دے دیا ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے سے پہلے کہاں ہوش میں آنے والا ہے۔ ابھی تو صرف گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا ہو گا۔“ اس نے پیروں کی رسی کاٹ کر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

”یار کاشف، باس کا کہنا ہے کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہے لیکن دیکھنے میں تو کیچوا لگ رہا ہے۔ کتنی آسانی سے ہم نے اس پر قابو پالیا تھا۔ پھر اتنی دور کا سفر بھی کر لیا اور وہ چوں بھی نہ کر سکا۔“

”اکبر بھائی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماہر تیراک اٹھلے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس وقت اس کا ستارہ گردش میں ہو۔ وہ سمجھ نہ پایا اور ہمارا شکار بن گیا۔“ کاشف نامی شخص نے جواب میں کہا۔

اکبر اب میرے سر ہانے کھڑا تھا اور وہ میرے ہاتھوں کی رسی پر چاقو چلا رہا تھا۔ میرے ہاتھ آزاد ہو گئے لیکن میں نے کسی قسم کا کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا کہ وہ سمجھتا کہ ہوش میں آچکا ہوں۔ نہ تو میں نے ہاتھ میں جنبش آنے دی اور نہ کوئی گہری سانس لی۔ وہ پوری طرح اطمینان سے میرے سر ہانے کھڑا تھا کہ اس کے ساتھی نے پوچھا۔ ”اب اس بیگار کو کیسے اٹھایا جائے۔“ گاڑی تک پہنچانا ہے۔ پھر ڈرائیو بھی کرنا اگر اسے راستے میں ہوش آگیا تو اسے دوبارہ سے سلانا بھی ہے۔“

”نہیں بھائی۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ اسے ہوش آجائے۔ اگر ہوش آگیا تو میں اس کے سر پر موجود رہوں گا۔ دوبارہ سے رومال نکال کر ناک پر رکھ دوں گا۔“

”تو پھر چلو اس کے جنازہ کو اٹھاؤ۔“ کہہ کر شاید وہ میری طرف بڑھا تھا۔

”نہیں میرے یار۔ تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے آنکھیں کھول کر کہا تھا۔

وہ دونوں ایسے چونکے تھے کہ جیسے مُردے کو اٹھتے دیکھ لیا ہو۔ ان کی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں چار پائی سے نیچے اتر گیا تھا۔ سامنے اکبر تھا۔ میں اس پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ اور کاشف کو بھول گیا تھا۔ میری اس غلطی کا اس نے بھرپور فائدہ اٹھا لیا۔ وہ اچانک ہی مجھ پر جھپٹا تھا۔ میں اس افتاد کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ بے خبری میں مارا گیا۔ کسی کئے ہوئے شہتیر کی طرح گرتا چلا گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ڈھیر ہوا تھا۔ نیچے میں تھا اور وہ تھا اور وہ کسی گینڈے کی طرح طاقتور تھا۔ اس نے مضبوطی سے میری دونوں کلاسیاں تھام لیں اور کھٹی آواز میں اپنے ساتھی سے بولا۔ ”اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے رسی لاؤ۔“

یہ کہہ کر وہ میرے سینے پر کچھ اس انداز سے سوار ہوا کہ اس کا ایک مگدر نما گھٹنا میرے گلے پر آ نکا تھا۔ میں ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کرتا تو خود ہی نقصان اٹھاتا۔

”جلدی کر بے وقوف۔“ کاشف نے اکبر کو ڈانٹا۔ ”ہمارے پاس وقت کم ہے۔“

”ابھی سے مایوس ہو گئے مائی ڈیر۔“ میں نے اس کے وزنی جسم کے نیچے دبا ہونے کے باوجود چپکنے کی کوشش کی۔ ”ابھی تو موت کا فرشتہ بھی آنے والا ہے۔ اس کا انتظار نہیں کرو گے۔“

”فکر نہ کرو۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ”سب سے پہلے تہی کو فرشتہ اجل کے حوالے کیا جائے گا۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی جکڑ ڈھیلی ہو رہی ہے۔ اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اچانک اپنی دونوں کلاسیوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے نہ صرف میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے بلکہ میں نے اس کی گردن بھی پکڑ لی۔ اسے شاید اندازہ نہ تھا کہ میرا ردِ عمل اتنا شدید ہو گا ورنہ وہ پہلی فرست میں مجھے بے ہوش کرنے کے لیے کلوروفارم کی پکار کرتا۔ پھر ہاتھ پاؤں باندھتا۔

میں نے اس کی گردن پکڑ کر خاصی قوت سے جھٹکا دیا تھا۔ وہ بائیں طرف لڑھک گیا تھا۔ پھر میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر گلا دبنے کی وجہ سے اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ میرے ہاتھ ہی پکڑ سکتا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ اس کا ساتھی اتنا احمق تھا کہ مجھے جس رسی سے باندھا گیا تھا اسے کٹا دیکھ کر نئی رسی لانے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ یا پھر اسے اپنے ساتھی کی قوت پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے ساتھی کی مدد کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

بہر حال جو کچھ بھی تھا مگر اس وقت پانسا میرے حق میں تھا۔ اگر اس کا ساتھی واپس آ جاتا تو میرے لیے مشکل کھڑی ہو جاتی۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے شکار کی گردن چھوڑ دی اور اس کی کینٹی پر اچانک ہی پوری قوت سے گھونسا مارا۔ بس ایک ہی گھونسا کافی ثابت ہوا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

میں نے یہ دیکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ یا صرف بے ہوش ہوا ہے۔ تبھی عقب میں آہٹ ہوئی تو میں چیتے کی سی پھرتی سے مڑا تھا اور دروازے کے بیچ میں کھڑے اکبر کو دیکھا۔

وہ حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے مزید حیران ہونے کا موقع نہیں دیا اور اچھل کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسے اس طرح دبوچ لیا جیسے باز کو تر کو دبوچ لیتا ہے۔ اس اچانک افتاد پر وہ ایسے گھبرا گیا جیسے وہ کوئی ننھا سا بچہ ہو۔ اس کے منہ سے لایعنی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ مگر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی

تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کے سر پر اپنے سر سے وار کیا پھر غراتے ہوئے کہا۔ ”میں جکڑ ڈھیلی کر رہا ہوں۔ خبردار اگر چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو انجام بہت برا ہوگا۔ سیدھے جا کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“

شاید وہ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جو شخص ایسے تن و توش کے آدمی کو پچھاڑ سکتا ہے وہ تو اس جیسے منحنی بندے کو پس کر رکھ دے گا اسی لیے وہ بلاچوں چراکیے دیوار کی طرف مڑ گیا اور ایک شریف بچے کی طرح دیوار سے ناک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے جسم سے اس کے دہشت زدہ ہونے کا اندازہ ہو رہا تھا کیونکہ وہ کانپ رہا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ ایسے بندے کو مجھے پھانسنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے مجھے پہچانا کیسے تھا؟“

”ہمیں بتایا گیا تھا کہ شہباز نامی شخص کو اغوا کرنا ہے۔ پہچان کے لیے آپ کا نمبر دیا گیا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے مس کال دی۔ آپ کے فون اٹھاتے ہی پہچان لیا۔ مزید تحقیق کی ضرورت نہیں تھی اسی لیے باہر بلا لیا۔“

اس کا جملہ ختم ہوا تھا کہ میں نے پہلے اس کی تلاشی لی پھر اسی کی لائی ہوئی رسی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اسے فرش پر گرا دیا۔ اس سے منٹ کر میں نے کاشف کی تلاشی لی اور اس کے ہاتھ پیر بھی باندھ دیئے۔ ابھی اس کام سے فرصت پا کر میں اٹھ ہی رہا تھا کہ چانک کسی نے عقب سے مجھ پر چھلانگ لگائی اور میری گردن کو دبوچ لیا۔ اس کی جکڑ ایسی تھی کہ میں چاہ کر بھی اپنی گردن موڑ نہیں پا رہا تھا۔ گردن پکڑنے والا نہ صرف بہت طاقتور تھا بلکہ اس کے ہاتھ بھی بہت مضبوط تھے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی گرفت بڑھا رہا تھا، میں سمجھ گیا تھا کہ اگر میں نے گردن چھڑانے کے لیے جھٹکا دیا تو گردن کا منکا ٹوٹ جائے گا۔ میں نے کہنی سے اس کے پیٹ پر وار کرنے کے لیے کہنی موڑنی چاہی لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ملی۔ وہ اس انداز سے کھڑا تھا کہ اس کا جسم میری کہنی سے دوڑتا تھا۔

میری سانس اب گھٹنے لگی تھی۔ کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح میری گردن دبا تا رہا تو میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گا۔ تبھی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور لہرا کر گرنے کی اداکاری کی۔ اس میں رسک تھا۔ اگر وہ اداکاری کے باوجود میری گردن نہ چھوڑتا تو میں حقیقتاً بے ہوش ہو جاتا۔

مجھے گرتا دیکھ اس نے میری گردن چھوڑ دی مگر مجھے سنبھالا نہیں۔ میں پہلو کے بل گرا تھا۔ اس کے باوجود میری کمر میں خاصی چوٹ آئی تھی۔ گردن آزاد ہوتے ہی میری توانائی تیزی سے بحال ہونے لگی۔ حملہ آور بھی گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اوائے کاشف تُو زندہ ہے یا مر گیا۔“

میں اب پھر سے فارم میں آ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ ساتھ ہی ساتھ آواز لگائی۔ ”کاشف ابھی مرا نہیں ہے۔ پہلے تم مرو گے۔“

مجھے اٹھتا دیکھ اس نے پھر سے میری گردن پکڑنا چاہی۔ میں نے پھرتی سے قلابازی کھائی اور دور چلا گیا پھر اسپرنگ کی طرح اچھال بھری اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم بار بار میری گردن نہیں پکڑ سکتے۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
 ”تیری تو ایسی گردن مردوں کا کہ تو دوسری سانس نہیں لے سکے گا۔“ اس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے
 چھلانگ لگائی تھی۔

میں نے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی اور آگے بڑھ کر اس کی کلائی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ پہلی ہی کوشش
 کامیاب ٹھہری اور اس کی دونوں کلائیاں میری گرفت میں آ گئی۔ میں نے جکڑ مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ”خود کو
 سورا سمجھنا آسان ہے لیکن ثابت کرنا مشکل ہے۔“

”تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا اور نہ یہاں سے نکل سکتا ہے۔“

اس نے کرب کو چھپاتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے جھٹکے سے اسے گرا دیا پھر اس کے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھ
 کر کہا۔ ”تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ یعنی کس کے کہنے سے تم نے مجھے اغوا کیا تھا۔“ میں نے یہ سوال اس کی
 آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔

”کسی نے بھی ہمیں نہیں کہا..... میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے۔ یہ میرا شوق ہے یہی دھندا
 ہے۔ لوگوں کو اغوا کرتا ہوں پھر تاوان طلب کرتا ہوں۔“

میں نے اس کی دیدہ دلیری دیکھ کر کہا۔ ”گلتا ہے ابھی تک تم میں دم خم باقی ہے۔“ میرا انداز طنزیہ تھا۔
 میں نے پیروں پر زور ڈال کر کہا۔ ”میں ابھی ساری اکڑفون نکال دوں گا۔ جلدی حقیقت بک دو کس کے کہنے پر تم
 نے مجھے اغوا کیا تھا۔“

اس میں کمال کی استقامت تھی۔ چہرے پر تکلیف کے آثار صاف ظاہر تھے لیکن وہ زبان کھولنے پر آمادہ
 دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں آپ کی بات
 کا جواب دے چکا ہوں۔“

”دیکھو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہیں
 مار کر یہیں دفن کر دوں۔ تم نے شاید میرے بارے میں سنا نہیں ہے کہ میں کس قماش کا بندہ ہوں۔ جو پوچھ رہا
 ہوں سچ بتا دو ورنہ میرے پاس بس یہی ایک آپشن رہ جائے گا۔“

”جو سچ ہے وہ میں نے بتا دیا آگے آپ کی جو مرضی۔ خواہ مار دیں یا زندہ رکھیں۔“

میں نے اس کی کلائی سے اپنا پیر ہٹا لیا اور پھر جھک کر اس کے بالوں کو پکڑا پھر کھینچتے ہوئے اس کے سر کو
 بلند کیا اور اسے دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ وہ بھی کمال کا بندہ تھا۔ اتنے مضبوط اعصاب کا تھا کہ اس پر مجھے ترس
 آنے لگا تھا۔ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”مجھے مارنے سے پہلے ایک سگریٹ ضرور پلا دینا۔“

میں نے نظر اٹھا کر نیل کی طرف دیکھا جہاں مجھے سگریٹ کی ڈبی دکھائی دی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر
 سگریٹ کی ڈبی اٹھائی اور ایک سگریٹ نکال کر اسے سلگالی۔ پھر اسے اس کے ہونٹوں میں دے دیا۔ اس نے دو
 تین گہرے کش لیے تو میں نے سگریٹ چھین لی پھر پوچھا۔ ”ہاں اب بتاؤ۔ کس کے کہنے پر تم نے مجھے اغوا کیا
 تھا۔“

”کہہ تو دیا کہ یہ میرا پیشہ ہے۔ میں یہی کام کر کے اپنا گھر چلاتا ہوں۔“

میں نے اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ سچ بول رہا ہے؟“
 اکبر نے سر ہلا کر ہاں کہا تو میں اس کی طرف بڑھتا چلا گیا اور اس کی جیب کی تلاشی لی۔ ایک بار پہلے
 تلاشی لے چکا تھا دوبارہ لی تو بھی موبائل نہیں ملا تب میں نے اس سے پوچھا۔ ”موبائل کہاں ہے؟“
 اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میری بنیان میں پھنسی ہوئی ہے۔“

میں نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ موبائل اس کے پیٹ پر تھا۔ اسے باہر نکال کر دیکھا۔ یہ
 ورک بھی تھا اور چار جنگ بھی فل تھی۔ میں نے سفیر کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ لگا
 رہا تھا کہ موبائل ایسی جگہ ہے جس سے دور وہ بیٹھا ہے۔ وقت برباد کرنے سے الجھن اور بڑھتی اس لیے میں۔
 شاکر کی سمدی پر نپا تلا دار کیا اور وہ تورا کر ز مین پر ڈھے گیا۔ میں نے بنا کچھ سوچے سمجھے باہر کی جانب قدم بڑ
 دیئے اس لیے کہ اب رکنا بیکار تھا۔

باہر آنے کے بعد میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور دور تک ویرانہ تھا۔ ایک سڑک نظر تو آرہی تھی لیکن
 سڑک کافی فاصلے پر تھی۔ اس سڑک پر کم سہی لیکن ٹریفک چل رہی تھی۔ میں نے اسی جانب قدم بڑھا دیئے
 مجھے اس بات کی بھی فکر نہیں تھی کہ جن بندوں کو باندھ کر آیا ہوں ان کا حشر کیا ہوگا۔ اگر کہیں میرا ہاتھ زیادہ تورا
 سے پڑ گیا ہوگا تو وہ شخص جسے بے ہوش چھوڑ آیا ہوں وہ راہی ملک عدم ہو چکا ہوگا اور اگر ایسا ہو گیا تو ان دونوں
 کھولے گا کون، وہ تو اسی حالت میں بھوک پیاس سے مرجائیں گے۔

اس خیال نے میرے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی کہ میں نے خود پر قابو پایا اور خود سے کہا۔ ”جو ہوگا دیکھ
 جائے گا۔ میرے خیال میں بے ہوش شخص کو ہوش آ جائے گا اور وہ اٹھ کر ان کو کھول دے گا۔ مجھے اپنی سوچ
 چاہیے۔ اگر ان کو موقع مل جاتا تو وہ مجھے ماردیتے پھر میں ان سے ہمدردی کیوں کروں اس لیے کہ دشمن پھر دشمن
 ہے۔ وہ بھی کمین فطرت کے دشمن ہیں۔“

اس نئے خیال نے مجھے نئی سوچ دی اور میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے سامنے والی سڑک کی طرف دیکھ
 ایک دوڑک گزرے تھے کہ دور سے آتی ہوئی بس نظر آئی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مجھے ہر حال میں وقت
 سے پہلے سڑک تک پہنچنا تھا۔ تاکہ میں بس کو پکڑ سکوں۔ مجھے کوئی ڈر تو تھا نہیں کہ ان میں سے کوئی پیچھا کرے گا
 اس لیے کہ جو ہوش میں تھے وہ بندھے ہوئے تھے اور جو کھلے ہوئے تھے وہ بے ہوش تھے۔ انہیں ہوش میں آ
 کے لیے گھنٹا بھر چاہیے ہوگا۔ اس لیے میں آرام سے سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ دور سے آتی ہوئی بس نظر آ
 اور میں گویا ہوا میں اڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اتنی تیز چل رہا تھا کہ بتا نہیں سکتا۔ یہ میری تیز رفتاری تھی کہ سڑک
 تک پہنچے تک بس کھڑی ہوئی تھی۔ ایک دو مسافر اترے تھے شاید اسی لیے بس رک گئی تھی۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا بس میں سوار ہوا تھا۔ سوار ہونے کے بعد میں نے بس کا جائزہ لیا۔ تقریباً تمام سیٹ
 بھری ہوئی تھیں۔ صرد سیٹ خالی تھی۔ میں اس سیٹ کی طرف بڑھا۔ کنڈیکٹر نے سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے ہی کرا
 مانگ لیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو ان لوگوں نے رقم نامی کوئی چیز چھوڑی نہیں ہوگی۔ پھر بھی جیب
 ہاتھ ڈال دیا جیسے کرایہ نکال رہا ہوں۔ میں اس وقت کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا جس سے میں کنڈیکٹر کو مطمئن
 کر سکوں۔ کنڈیکٹر سر پر سوار تھا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے جیب کو ٹٹولا تو دل خوش ہو گیا اس لیے کہ جیب میں

کاغذات انگلیوں سے مس ہوئے تھے۔ میں جیب میں کوئی کاغذ تو رکھتا نہیں تھا۔ ہوٹل سے نکلنے وقت میرے کوسو کانوٹ دیا تھا۔ اسی کا کھلا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے ہاتھ باہر نکالا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ ان لوگوں نے میرا پرس تو نکال لیا تھا لیکن ستر اسی روپے جو میرے نے واپس دیئے تھے چھوڑ دیا تھا۔ جب موٹی رقم ہاتھ آتی ہے تو چھوٹے نوٹ نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا جس نے مجھے کنڈیکٹر کی گالیاں سننے سے بچا لیا تھا۔ میں نے رقم باہر نکالی اور پوچھا۔ ”بس کہاں تک جائے گی۔“

اپنا سوال میں نے انگریزی میں کیا تھا اس لیے کہ بس میں ایک انگریز جوڑے کو بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ وہ جوڑا عین اس سیٹ کے پیچھے بیٹھا تھا جہاں میں بیٹھا تھا۔ کنڈیکٹر نے صرف اتنا کہا۔ ”پنڈی۔“

شاید اس نے مجھے بھی غیر ملکی سمجھا تھا۔ میں نے پچاس کانوٹ اس کی طرف بڑھا کر پوچھا۔ ”ہو جائے گا؟“

کنڈیکٹر نے کہا۔ ”ٹونٹی مور۔“

میں نے بس کا آخری نوٹ بھی نکال کر اسے دے دیا۔ وہ تو آگے بڑھ گیا لیکن انگریز جوڑا میری طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ مرد نے مجھ سے پوچھا۔ ”کہاں سے آرہے ہو۔“ میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا کہ وہ کہاں سے آرہا ہے۔ اس شخص نے جواب میں کہا۔ ”مری۔“

مجھے خوشی ہوئی کہ میں اسی راستے پر ہوں جس پر چلا تھا۔ اب میں کھڑکی سے باہر دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ اب ہم کہاں پر ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی سڑک ہے۔ اس لیے کہ جو چھوٹی چھوٹی آبادیاں آئیں اور وہ گزر گئیں ان سے پہچان ہونہیں پاتی تھی۔ تبھی میری نظر سڑک پر دور بہت دور آگے کی طرف گئی اور میں چونک گیا۔ اس لیے کہ سڑک پر پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سڑک کو بیر لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ جو اس بات کی نشانی تھی کہ چیکنگ ہو رہی ہے۔ دو تین گاڑیاں قطار میں کھڑی بھی تھیں۔

یہ اسپن چیکنگ نے زندگی عذاب کر دی ہے۔ جہاں دیکھو چیکنگ لیکن یہ ضروری بھی ہے۔ اس لیے کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ قانون شکنوں کو چیک کریں۔ ان کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلیں اور عوام کو راحت دیں۔ اسلام دشمن طاقتیں جن کی نظروں میں پاکستان آنکھ کا شہتیر بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے زر خرید لوگوں کے ذریعہ عوام کو پریشان کرنے، ملک میں انتشار پھیلانے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں اور نادانستگی میں کچھ کم عقل لوگ زبان، فرقہ یا کسی اور بنیاد پر ان کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں کھلی راہ داری دے دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے حکومت کو حرکت میں آنا پڑتا ہے۔ اور قانون نافذ کرنے والے ادارے مشتبہ افراد کی کھوج میں لگ جاتے ہیں۔ اگر اس وجہ سے عوام کو کچھ دشواری جھیلنی پڑتی ہے تو راحت بھی اسی میں مضمر ہے۔ میں اسی جانب نظریں جمائے ہوئے تھا کہ مجھے احساس ہوا جیسے میری سیٹ کی پچھلی طرف کوئی چیز نیچے کی طرف سرکی ہو۔ میں نے عادت کے مطابق فوراً احساس کی قوت سے پہلے اسے محسوس کرنے کی کوشش کی کہ کیا چیز ہے اور میں نے محسوس کر لیا کہ وہ کوئی پیکٹ ٹائپ کی چیز ہے۔ میں کچھ آگے کی جانب کھسک گیا کیونکہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ چیز میری سیٹ کے کور میں داخل ہوئی ہے۔ کچھ توقف کے بعد میں نے غیر محسوس انداز میں پیچھے کی طرف دیکھا۔ سیٹ کا کور کچھ اٹھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا

کہ کسی نے پیچھے سے کچھ داخل کیا ہے۔ میرے پیچھے وہ غیر ملکی جوڑا تھا۔ ایسا کیا اندر رکھا گیا ہے یہ دیکھنا ضروری تھا لیکن میں کسی کو محسوس کرنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ بس آگے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ میں اپنے داہنے ہاتھ کو نیچے سے پیچھے کی جانب لے گیا اور اس پیکٹ کو ٹٹولا۔ وہ اب بالکل نیچے آچکا تھا۔

ابھی میں اس پیکٹ کو ٹٹول ہی رہا تھا کہ بس رک گئی اور دونوں دروازے سے ایک ایک پولیس والے اوپر آگئے۔ انہوں نے بس کے اندر آتے ہی مسافروں کا جائزہ لینا شروع کیا پھر وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھے۔ میں حیرت میں آ گیا کہ وہ میری طرف کیوں آرہے ہیں۔ سامنے والے دروازے سے اندر آنے والا میرے پاس سے گزرتا ہوا۔ اس غیر ملکی جوڑے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے انہیں اپنے سامان کی تلاشی دینے کے لیے کہا۔ انہوں نے انگلش میں اسے ڈانٹا تو سپاہی نے بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور نیچے کی جانب کھینچنے لگا۔ مرد کو کھینچتے دیکھ عورت نے شور مچانا شروع کر دیا لیکن سپاہی پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اسی طرح کھینچتا ہوا اسے نیچے کی جانب لے چلا۔ بس کے تمام مسافران دونوں کو دیکھ کر آپس میں کانٹا پھوسی کر رہے تھے۔ میں کھڑکی سے باہر ان دونوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سپاہی اسے لے کر موبائل میں بیٹھے اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ اس نے انگلش میں سوال جواب کیا اور پھر اس کے سامان کی تلاشی لی۔ لیکن اس میں سے ایسا کچھ نہیں ملا تب اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لینے لگا۔ جامہ تلاشی کے بعد اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں سمجھ گیا کہ مخبر نے انہیں کوئی ایسی اطلاع دی ہوگی جس کی وجہ سے انہوں نے اس جوڑے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اگر وہ معمول کے مطابق تلاشی لیتے تو پھر پوری بس کی تلاشی لیتے صرف ان دونوں پر ہاتھ ڈالنا یہ بتا رہا تھا کہ میرا اندازہ درست ہے۔ مرد کے بعد ایک لیڈی کا نشیبل نے آڑ میں لے جا کر عورت کی تلاشی لی۔ لیڈی کا نشیبل کی موجودگی نے میرے اندازے پر مہر ثبت کر دیا۔ میں نے اپنی سیٹ چھوڑ دی اور دیگر کئی مسافروں کی طرح نیچے اتر گیا۔

میں پولیس موبائل کی طرف بڑھ رہا تھا کیونکہ مجھے اپنی سیٹ کا کور یاد آ گیا تھا۔ اس سیٹ کور میں کسی نے کچھ داخل کیا تھا اور میرے پیچھے یہی جوڑا تھا۔ مجھے آگے بڑھتے دیکھ ایک سپاہی نے روکا۔ مگر میں رکا نہیں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت تک افسر نے اس جوڑے کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ دونوں سر جھکائے ہوئے بس کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے نہیں لگ رہا تھا کہ انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ پولیس نے انہیں تنگ کیا ہے۔ میں نے انہیں بس میں سوار ہونے دیا پھر افسر کے پاس جا کر کہا۔ ”سر کیا بتا سکتے ہیں کہ آپ نے اس غیر ملکی جوڑے کو کس لیے ہراساں کیا؟“

”تم کیا ہمارے افسر ہو؟“ افسر تپا بیٹھا تھا۔ سوال کرتے ہی بھڑک اٹھا۔ میں نے اس کی حالت سے لطف لیتے ہوئے پوچھا:

”ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔“

”اُوے ٹو کیا خدائی فوجدار ہے۔ چل جا بس میں سوار ہوا یا نہ ہو کہ میرا متھا گھوم جائے۔“

پتا نہیں اس کی عقل کہاں گھاس چر رہی تھی۔ میرے کھلے انکشاف پر بھی وہ احمق بنا رہا تب میں نے اس سے کہا۔ ”ہاں میں خدائی فوجدار ہوں۔ ابھی ابھی اسلام آباد سے ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ ایک منٹ میں وردی اتر

جائے گی۔“

میرے لہجے پر وہ چونک گیا۔ اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہا۔ ”اوباؤ تو ہے کون۔“
”میں کون ہوں یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تو خود موہاں سے اتر اور جا کر بس کی تلاشی لے۔ سپاہیوں پر کام لا کر خود عیش کر رہا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”اوائے تو ہے کون؟“ وہ غصے میں بھرا موہاں سے کود کر نیچے اتر۔
”میں کون ہوں یہ تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تو اوپر جا کر ان دونوں کے آگے والی سیٹ کے کور میں ہاتھ ڈال کر دیکھ۔ پھر آ کر بات کرنا۔ جو پوچھے گا وہ میں بتاؤں گا۔“

اس نے ایک سپاہی سے کہا۔ ”اوائے میدے اس باؤ پر نظر رکھ میں ابھی آتا ہوں۔“
وہ تو بس کی طرف چلا گیا اور سپاہی مجھ پر اس طرح رائفل تان کر کھڑا ہو گیا جیسے میں خونی مجرم ہوں۔
ابھی ابھی کسی کو قتل کر کے آ رہا ہوں۔

میری نظریں افسر پر پڑ گئی تھیں۔ وہ بس پر سوار ہو گیا تھا اور اب اس جوڑے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ دیگر لوگوں کی طرح وہ اس افسر کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے۔ جب کہ افسران کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے شاید کوئی سوال کیا تھا پھر اس نے سامنے والی سیٹ کے کور میں ہاتھ ڈال دیا۔ ادھر ادھر ہاتھ مارنے کے بعد جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں پیکٹ تھا۔ اس نے پیکٹ کو وہیں کھڑے کھڑے کھولا اور پھر چونک کر اس نے غیر ملکی مرد پر ہاتھ ڈال دیا۔ مرد اور عورت دونوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔ لیکن اس نے کوئی پروا نہیں کی اور اسے کھینچتا ہوا نیچے لے آیا۔ اسی وقت وہ عورت بس سے اتری اور سڑک کر اس کر کے کھیتوں کی جانب دوڑ گئی۔ اسے بھاگتے دیکھ میں نے آواز دی۔ ”اوائے احمق اسے پکڑو۔“

میری آواز پر دو پولیس والے اس عورت کے پیچھے دوڑے اور کافی دور جا کر انہوں نے اسے بھی پکڑ لیا۔
میں اپنی جگہ کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ افسرانہیں ساتھ لے کر میری طرف آنے لگا۔ میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ مجھے اسی وقت شک ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ڈرگ اسمگلر ہیں اور کسی سے ڈرگ خرید کر آ رہے ہیں۔ ناکابندی دیکھ انہوں نے پیکٹ میری سیٹ کے کور میں ڈال دیا کہ اگر پکڑے گئے تو بھی الزام ان پر نہیں آئے گا۔ یہ تو ان کے ستارے کی خرابی تھی کہ وہ سیٹ میری تھی اور میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا مگر شور شرابہ کرنے کی بجائے خاموشی سے قانون کی مدد کر دی۔

افسران دونوں کے ساتھ میرے قریب پہنچ گیا پھر بولا۔ ”اوباؤ تیرا شکریہ کہ تو نے مدد کر دی لیکن تو ہے کون۔ اب اپنا تعارف بھی کرادے۔ ایسا کرتے ہیں کہ یہاں سے سیدھا تھانے چلتے ہیں۔ وہاں ایک ایک کپ جائے بھی پی لیں گے اور ایک دوسرے سے متعارف بھی ہو جائیں گے۔“

”میری ڈیوٹی کہیں اور ہے، میں واپس ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنے جا رہا ہوں۔“
میرا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ وہ مرعوب ہو گیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ میں محکمہ خفیہ کا کوئی اعلیٰ افسر ہوں۔ اس نے جھک کر پوچھا۔ ”کس محکمہ سے ہو؟“

”کچھ محکمے ایسے ہوتے ہیں جس کے بارے میں بتایا نہیں جاسکتا۔ ہمارا کام صرف مدد کرنا ہے۔ میں نے مدد کر دی۔ اب تم جانو اور تمہارا محکمہ جانے۔“

”باؤ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اس پارٹی کی مخالف پارٹی کے ہو جس سے اس نے مال خریدا اور تم نے اس کی سزا دینے کے لیے اسے پکڑوا دیا۔“ وہ خود کو جیمس بانڈ کا نانا ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ تھانے چلتا ہوں اور اپنا تعارف کرانے کے بعد تمہارے ایس پی کو رپورٹ کر دیتا ہوں کہ تم نے ان دونوں کو چھوڑ دیا تھا یہ میری ذات تھی کہ میں نے تمہیں زبردستی بھیجا کہ جا کر سیٹ کے کور سے پیکٹ نکال لاؤ۔“

میری بات نے اسے گھبرا دیا کہ جیتی ہوئی بازی پلٹ جائے گی۔ اس کا میا بی کا سہرا اس کے سر بندھنے کی بجائے میرے سر بند جائے گا اور اس سے جواب بھی طلب کیا جائے گا کہ اس نے تلاشی صحیح طور سے کیوں نہیں لی۔ اسی لیے وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”نہیں سر آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں تو چائے پلانے کے لیے بلارہا تھا۔“

”ایک کپ چائے مجھے دیر کرادے گی اور افسران مجھ پر چڑھ دوڑیں گے۔ جانتے ہی ہو کہ ہمارے ڈپارٹمنٹ میں وقت کو کس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔“

”ہاں سر یہ بات تو ہے۔ بس ایک ریکورڈ ہے۔ میری فائل اوپر بھنسی ہوئی ہے۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو میں زندگی بھر دعاؤں گا۔ میری ترقی ہو جائے گی سر۔ اوپر تک آپ لوگوں کی بات مانی جاتی ہے۔ بس ایک فون آپ کا، میری راہ کھول دے گا۔“

”اچھا اچھا اپنا نام اور فون نمبر بتاؤ میں آج ہی تمہارے افسران سے بات کر کے تمہیں فون کر دوں گا۔“

”یہ رہا میرا کارڈ سر۔ آپ اپنا نمبر دیں گے؟“

”ابھی نہیں میں شام تک خود فون کروں گا۔ وہ نمبر سیو کر لینا۔ ابھی جو نمبر استعمال میں ہے وہ عارضی ہے۔ رپورٹ کرتے ہی وہ سم جمع ہو جائے گی۔“ میں نے ٹالنے کے لیے ایک اور بہانہ کیا۔ پھر اس سے ہاتھ ملا کر واپس اپنی سیٹ پر آ گیا۔ بس چل پڑی۔

اب بس کا ہر مسافر مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ سب بھی مجھے کوئی اہم افسر سمجھ رہے تھے۔ میں کھڑکی سے ٹیک لگائے باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جیب سے موبائل نکالا اور نمبر پر نظر ڈالی۔ نمبر نیا تھا۔ میں نے کال ریسیو کیا اور کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ دوسری جانب سے آتی آواز کون کر میں چونک گیا۔ یہ مکروہ آواز میں لاکھوں آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ یہ آواز مرشد کی تھی۔ وہ دوسری جانب سے بول رہا تھا کہ بالآخر تم میرے آدمیوں کو دھوکا دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ کوئی بات نہیں میں اب منتظر ہوں کہ تم کب پنڈی پہنچتے ہو۔

میں حیران ہو گیا تھا کہ وہ کس طرح میرا تعاقب کر رہا ہے۔ لگتا ہے اس کے آدمی مسلسل میرے تعاقب میں ہیں جو مرشد کو پل پل کی خبر دے رہے ہیں۔ ”خاموش کیوں ہو گئے۔ کچھ تو بولو۔“

”فکر نہ کرو جلد میں تم سے حساب کرنے آ رہا ہوں۔“

”ہاں مجھے بھی بے چینی سے تمہارا انتظار ہے۔ اب میں بھی یہ قصہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم میری خانہ“

تباہ نہ کرتے تو میں تمہیں معاف کر کے اپنے کاموں کی طرف توجہ دیتا لیکن تم نے مجھے تباہ و برباد کر کے سمجھا تھا کہ میں تباہ ہو جاؤں گا لیکن اب میں پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو چکا ہوں۔ اور اس کی نمائش تمہارے سامنے کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ اسی لیے تمہیں اس شدت سے یاد کر رکھا ہے۔ اب کچھ ہی دیر ہے کہ تم میرے سامنے ہو گے۔“

اس کی یہ بات میرے لیے سوچ کے دروا کر گئی۔ میں فکر میں پڑ گیا۔ اس نے کال کاٹ دی تھی مگر میں سٹکی جسے کی طرح موبائل کو اسی طرح سامنے کیے بیٹھا تھا۔ تبھی بس کی رفتار کم ہونے لگی اور بس رکتی ہوئی محسوس ہوئی میں ہوشیار ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سے سفیر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد سفیر نے کال ریسو کر لی۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔ ”آپ کہاں رہ گئے ہیں۔ لگتا ہے ہم سب کو آپ ذہنی بیمار بنا کر چھوڑیں گے۔ ہم سب کتنا پریشان ہیں بتائیں سکتے۔“

”یہ باتیں بعد میں کر لینا۔ ایسا کرو کہ مری کے لیے جہاں سے بسیں چلتی ہیں وہاں پہنچو، میں اس وقت بس میں ہوں۔“

”اچھا اچھا آ رہا ہوں۔“ کہہ کر اس نے لائین کاٹ دی۔ اب میں ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ مرشد کو میری نقل و حرکت کا کیسے پتا چل رہا ہے، کیا اس نے کسی کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے جو صرف مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے آگے پیچھے ہر طرف دیکھ لیا لیکن پوری بس میں ایسا کوئی مشتبہ شخص نظر نہیں آیا پھر میں راستے سے بس میں سوار ہوا تھا اور یہ سب کے سب پہلے سے بس میں سوار تھے۔ کیا کوئی دور رہ کر تعاقب کر رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا لیکن باہر بھی ایسی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی جو پیچھے آرہی ہو۔ میں عجیب شش و پنج میں گھر گیا تھا کہ آخر وہ مجھے کس طرح بار بار ٹریس کر رہا ہے۔

اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور راستہ طے ہو رہا تھا مجھے ہوش تب آیا جب شہر بالکل نزدیک آ گیا۔ جانی پہچانی سڑکیں اور مقامات نظر آنے لگے تھے۔ میں نے ذہن کو جھٹکا کہ اب جو بھی ہو۔ مرشد سے تو ٹکرا نا ہی ہے تو پھر فکر کیسی۔ اسی خیال کے تحت میں نے ذہن کو موڑ لیا اور آتی جاتی سوار یوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے دوبارہ سے موبائل نکالا اور سفیر کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پر ہی اس نے کال ریسو کر لی۔ میں نے پوچھا کہ تم ہو کہاں تو اس نے کہا۔ ”بس ہم نکل رہے ہیں پانچ منٹ میں اسٹینڈ پر ہوں گے۔“

”ایسا کرو کہ رفع یونیورسٹی کیمپس والی روڈ پر آ جاؤ۔ وہیں جہاں سے کیمپس کے لیے مڑتے ہیں۔ میں وہیں کھڑا ہوں۔“

”او کے آپ وہیں انتظار کریں ہم بس اس کے قریب ہی ہیں۔ لیجئے پہنچ گئے۔“

اس نے جیسے ہی کہا بس اس مقام کے قریب سے گزر رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ڈرائیور سے کہا۔ ”بھائی یہیں روک دو میں اتر جاؤں۔“

ڈرائیور کوئی سخت جملہ کہتا کہ اس نے سر پر لگے آئینہ میں مجھے دیکھ لیا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”باؤ فکر ہی نہ کرو۔ لو یہ روک دیا۔“ اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

بس رکتے ہی میں نیچے اتر گیا۔ بس آگے بڑھ گئی۔ ابھی میں ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ دور سے آتی ہوئی وہی گاڑی نظر آئی جس کا حلیہ بدلا گیا تھا۔ اس کا اگلا حصہ ہی اتنے شوخ کلر کا تھا کہ دور سے بھی پہچان میں آرہی

تھی۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ دینا شروع کر دیا۔ گاڑی بالکل میرے نزدیک آ کر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مرتجس تھا۔ اس کے برابر میں سفیر اور پیچھے والی سیٹوں پر عبداللہ۔ وغیرہ تھے۔ سفیر نے اترنا چاہا تھا کہ میں نے منع کر دیا کہ نہیں میں تو پیچھے ہی بیٹھوں گا۔ اور اس طرف والا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ مرتجس نے گاڑی بڑھادی۔

”ہاں بھائی اب تو بتا سکتے ہیں کہ آپ جناب کہاں رک گئے تھے۔“ سفیر نے پوچھا۔
 ”یقین کرو گے ایک نہیں دو بار اغوا ہوا ہوں تب جا کر تم لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان اغوا کاروں سے نمٹنے میں کچھ دیر تو ہونا ہی تھی۔“

”ارے بھائی ایک کال تو کر سکتے۔“
 ”کال کرنے کی فرصت کسے تھی۔ اتنا الجھا ہوا تھا کہ چاہ کر بھی فون نہ کر سکا۔ پھر جب موقع ملا تو تم نے کال ریسیو نہیں کی۔“

”ہاں اس رات سو گیا تھا۔ صبح مس کال دیکھی لیکن جب ریٹرن کال کی تو آپ کا فون بند جا رہا تھا۔“
 ”ہاں یہ بات تو ہے۔ میں نے بھی جب موبائل آن کیا تو مس کال نظر آئی تھی۔“
 ”ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ وہ گھر ہے کیسا جہاں ہم جا رہے ہیں۔ محفوظ تو ہے نا؟“
 ”بہت عمدہ ایک ایسا گھر مل گیا ہے جس کی تعریف الفاظ میں نہیں کر سکتا آپ خود دیکھ کر یہی کہیں گے کہ یہ بھی دسیم کی مہربانی ہے کہ ایک منٹ میں اس نے گھر کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔“

میں نے دسیم کی طرف دیکھا جو مسکین صورت بنائے لاقطع بنا بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میرے شیر یہ تو بتاؤ کہ دیگر انتظامات کا حال کیا ہے؟ اس لیے کہ اس وقت مرشد جلع پاؤں کی بلی بنا ہوا ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے کیا تیاری کی ہے؟“

”ہم تو آپ کے اشارے پر چلنے والے ہیں۔ آپ بتائیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟“ دسیم نے کہا اور دوبارہ سے باہر دیکھنے لگا۔ عبداللہ اور مرتجس بالکل خاموش تھے۔ جیسے وہ گاڑی میں رہتے ہوئے بھی نہ ہوں۔ میں دسیم کے سوال کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ مرتجس نے ایک بنگلے کے گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن دیا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ سامنے ایک بڑی بڑی موٹھوں والا کھڑا تھا۔ دیکھنے سے ہی لگتا تھا کہ اس کا تعلق بلوچ قبائل سے ہے۔ میں نے ایک نظر میں اس کا جائزہ لے لیا تھا۔ مرتجس گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔ پھر پورچ میں کھڑی کر کے بولا۔ ”گاڑی کی سروس کرانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایک لمبے سفر پر چلی ہے لیکن آپ کی وجہ سے ہم سب پریشان تھے اس لیے میں بھی گاڑی کو سروس اسٹیشن نہیں لے گیا۔ اب اگر آپ کہیں تو میں اسے دے آؤں۔“
 ”یہ کام بھی ضروری تھا۔ اسے تو فوراً کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔

”اصل میں ہم سب اس لیے گاڑی کو کہیں لے کر نہیں جا رہے تھے کہ کب آپ کو ریسیو کرنے جانا پڑ جائے۔ اسی وجہ سے میں نے انتظار کرنا ضروری سمجھا۔“

”اب تم پہلا کام یہی کرو کیونکہ اسلحہ اور گاڑی ان دونوں کو میں ہمہ وقت کنٹرول میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“
 ”تو پھر آپ آرام کریں میں اسے سروس کے لیے دے کر آتا ہوں۔ یوں بھی آج کہیں نکلنے کا پروگرام تو ہے نہیں اس لیے میرے خیال میں یہی بہتر وقت ہے۔“

”ہاں ہاں ضرور جاؤ۔“ میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

میں نے گاڑی سے اتر کر اطراف کا جائزہ لیا۔ بنگلے کے چاروں طرف یارڈ تھا۔ سامنے لان بنا ہوا تھا۔ برآمدہ ایک فٹ اونچا تھا۔ میں نے برآمدے پر قدم رکھا تھا کہ میری نظر اس کتے پر پڑی جو ایک پیڑ سے بندھا ہوا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ابھی تک اس نے بھونکا بھی نہیں تھا۔ میں نے وہیں سے اس کتے کا جائزہ لیا۔ وہ اعلیٰ نسل کا لگ رہا تھا۔ بیٹھریے جیسا قد تھا۔ اگر اسے کسی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک منٹ میں تکہ بوٹی کر دے۔ اس کے انداز سے ہی خونخواری جھلک رہی تھی۔ وہ ایک نلک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سفیر سے پوچھا۔ ”یہ کتا تم نے لیا ہے؟“

”نہیں جناب یہ کتا بنگلے کے مالک کا ہے۔ وہ ان دنوں کینیڈا میں مقیم ہے۔ اس نے گھر کے ساتھ ایک کتا اور ایک چوکیدار بھی دیا ہے۔ چوکیدار کو دیکھ ہی چکے ہیں اور اب کتے کو بھی دیکھ لیا۔ ویسے یہ کتا ٹرینڈ ہے۔ حس بھی بہت تیز ہے۔ باتوں کو فوراً سمجھ لیتا ہے۔ اگر ہم سب ساتھ نہ ہوتے تو یہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔“ سفیر نے کتے کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

میں نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ دروازہ پار کرتے ہی اچھی قسم کے فرنیچر سے سجا ڈرائینگ روم تھا۔ اس روم کو پار کر کے ہم ایک دوسرے کمرے میں پہنچے۔

کمرے کا جائزہ لیا۔ آپ ٹو ڈیٹ بیڈ روم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جس نے بھی بیڈ روم سیٹ کیا ہے کافی شوقین مزاج ہے۔ اس لیے کہ بیڈ روم کا فرنیچر ہی نہیں بلکہ دیواروں کے رنگ و روغن بھی خواب ناک تھے۔ بڑا سا جہازی سائز بیڈ۔ ایک طرف قد آدم آئینہ جس میں بیڈ پر بیٹھے بیٹھے خود کو دیکھ کر سنوارا جاسکتا ہے۔ دیوار سے لگا صوفہ سیٹ۔ چھوٹے چھوٹے دو ٹی ٹیبل۔ دیواروں پر چار جانب رنگین لائٹ جو چند سکند میں رنگ بدل دیتی اور ہر کونے میں اوپر کی طرف رنگین زیر و پاؤر کے چار بلب۔ ایک طرف فولڈنگ آرائشی آڑ۔ میں نے خود کو بیڈ پر گراتے ہوئے کہا۔ ”بھائی دسیم تم نے گھر بھی خوب ڈھونڈا ہے۔ کس کا ہے؟“

”میرے ایک جاننے والے کے کزن کا گھر ہے۔ وہ اسٹیٹ ایجنسی کا کام کرتا ہے۔ جب میں نے اسے گھر کے لیے کہا تو اس نے پیش کش کی کہ اس گھر کو لے لیا جائے..... اور میں نے لے لیا۔“

”ہمارا کرا بھی تو دیکھیں۔ اس پر سفیر اور وسیم کا قبضہ ہے۔ برابر والا روم ہمیں دیا گیا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

چلو اس کا معائنہ بھی کر لیتے ہیں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

برابر والا کرا بھی کم نہیں تھا۔ اسے بھی بھر پور انداز میں سجایا گیا تھا۔ امارت کا بھر پور مظاہرہ تھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ اس کمرے میں وہ اور مرتجس سوئے تھے۔ اب یہی ان کے تصرف میں رہے گا اسی نے بتایا کہ اس کے برابر والا کرا میرے لیے مختص کیا گیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”لگے ہاتھوں اس کمرے کا درشن بھی کر لیتے ہیں۔“

برابر والے کمرے میں آیا تو آنکھیں پھٹی رہ گئیں اس لیے کہ وہ کرا کسی عشرت کدہ سے کم نہ تھا۔ دو طرف کی دیوار میں اس طرح آئینہ لگایا گیا تھا کہ پورا کرا اس میں نظر آ رہا تھا۔ درمیان میں بیڈ تھا اور دو طرف دو صوفہ سیٹ تھے۔ انتہائی قیمتی۔ کھڑکی کے نزدیک قد آدم انتہائی مہارت سے بنا وینس کا مجسمہ تھا۔ دیواریں ہلکی گلابی

رنگ کی تھیں۔ کمرے میں دو طرف دیوار میں عود دان فکس تھا جس میں یقیناً خوشبو رکھی جاتی ہوگی جس کی وجہ سے کمرہ معطر رہتا ہوگا۔ بیڈ کے پینٹانے کی طرف دیوار میں پچپن انچ کا ایل ای ڈی فکس تھا۔ ایک طرف پورٹبل فریج تھا تو اس کے برابر ایک رولنگ ریک جس میں کئی ڈیزائن کی خوبصورت بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ بھری ہیں یا خالی یہ دیکھنے کی میں نے کوشش نہیں کی۔ اسی ریک میں تمباکو نوشی کے لیے کئی چیزیں رکھی تھیں۔ جن میں سگریٹ اور سگار بھی تھا۔ برابر میں وارڈروب تھا جس میں کپڑے ہی ہوں گے۔ اس لیے اسے کھول کر دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ بستر پر بیٹھ کر میں نے کہا۔ ”واقعی جس کا بھی کمرہ ہے وہ شوقین آدمی لگتا ہے۔“

”اس میں شک نہیں ہے۔“ عبداللہ بولا۔ ”ایسے کمرے تو راجا صاحب کے بھی نہیں ہیں۔“

”میاں، وہ بوڑھے ہیں اور یہ کمرہ کسی جوان شخص کی امارت کا اظہار کر رہا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے

کہا۔

پھر باتوں کا رخ یکا یک مڑ گیا اور مرشد زیر بحث آ گیا۔

گفتگو جب کافی لمبی ہو گئی تو وسیم بولا۔ ”تو ایسا کریں کہ آپ یہاں لیٹ کر اپنی امارت کو یاد کریں۔ میں تو کمرہ سیدھی کرنے اپنے والے کمرے میں چلا۔“

”وسیم کبھی کبھی بات دماغ والوں کی کر جاتا ہے۔ آپ یقیناً تھکے ہوئے ہوں گے اس لیے آپ آرام کریں۔ میں بھی سونے کے لیے چلا۔ رات صبح سے نیند نہیں آئی تھی۔“ سفیر بولا۔

میں سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ صرف مجھے آرام دینے کے خیال سے کمرے کو خالی کر رہے ہیں تاکہ میں آرام کر لوں۔ کیونکہ میری آنکھوں میں انہوں نے آنسو دیکھ لیے تھے۔

اب خالی کمرے میں میں تھا اور میری سوچ تھی۔ میں گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

وقت کا کام ہے گزرنا، گزر جاتا ہے۔ زخم لگا کر، ٹیس دے کر بھی گزر جاتا ہے۔ اور ٹیس برسوں ستاتی ہے۔ مجھے بھی ستا رہی تھی۔ رُلا رہی تھی۔ میں اوپر سے ہنس بھی رہا تھا اور اندر سے رو بھی رہا تھا۔ اس کمال ضبط سے کہ پاسنگ بھی نہ آئے۔ ایسی حالت میں روتا تھا کہ سسکی بھی نہ ابھرے۔ آنکھیں نوچہ کنناں تھیں۔ مگر اظہار سے گریزاں تھیں۔ دوسرے کتنا بھی ذلیل کر لیں، سب سے بڑی ذلت تو آدمی کا اپنی نظروں میں گر جانا ہے۔ میں بھی اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔ بازو تھے، بازوؤں میں قوت بھی تھی مگر اسے کام میں نہیں لا پارہا تھا۔ ہر موئے تن پھنک رہا تھا۔ لپٹیں سی اٹھ رہی تھیں۔ روم روم سے پکارا اٹھ رہی تھی۔ ایک ہی پکار تھی۔ انتقام انتقام انتقام۔ مرشد سے انتقام۔

میری منٹھیاں بھنپنے لگی تھیں۔ رگوں میں لہو تیز ہو رہا تھا۔ گردش اتنی بڑھ گئی کہ دل بھی بے قابو ہونے لگا تھا اگر اس وقت مرشد سامنے ہوتا تو میں یقیناً اس کا گلا دبا چکا ہوتا۔ مگر وہ سامنے نہیں تھا۔ پتا نہیں کہاں ہوگا۔ مگر میں نے اسے سزا دینے کی ٹھان لی تھی۔ اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا تھا اگر وہ پاتال میں بھی ہوتا تو میں اسے نہ بخشا۔ کھینچ لاتا۔

مگر اسے ڈھنڈوں تو کیسے؟ تبھی دماغ نے کہا، بالکل ویسے جیسے پہلے ڈھونڈا تھا۔ ابھی میں سوچ و فکر کے

سمندر میں غلطاں تھا کہ ایک خیال نے سرابھار۔ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”سفیر کو بلاؤ۔“
کچھ میرا انداز، کچھ میری آواز کی تیزی۔ مرتجس جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ رک گیا پھر مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں پھر سے خیالات کے مدوجذر میں ڈوبنے ابھرنے لگا۔ رہ رہ کر میرے اندر طوفان سا اٹھنے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کچھ کر بیٹھوں۔ میں صرف ایک ہی نکتے پر سوچے جا رہا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ میری نظریں خود بخود ادھر اٹھ گئیں۔ دستک دوبارہ ہوئی۔

دستک ہاتھ اور پلڑے کے لمس سے پیدا ہوتی ہے۔ سماعت تک پہنچتی ہے۔ یاد دلاتی ہے، کوئی سائل ہے۔ اس وقت اس سماعت ایسا کون سا سائل ہے جو ملاقات کی بھیک مانگنے بے وقت آگیا۔

میں خاموش رہ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ خالی الذہنی میں یہ تک بھول گیا تھا کہ میں نے خود ہی کسی کو بلایا ہے۔ میں مکمل طور پر خالی الذہن تھا اور اس عالم میں بس ایک کام یہی تو ہو سکتا ہے۔ میں اسی عالم میں بت بنا بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ جب تیسری بار دستک کی صدا بلند ہوئی تو میں نے بہ جبر پوچھا۔ ”کون؟“ میرا لہجہ غماز تھا کہ میں نے اس کی آمد کو پسند نہیں کیا ہے۔

”میں ہوں۔“ باہر سے جانی پہچانی آواز آئی۔ میرے ہر دکھ میں دکھی ہو جانے والے سفیر کی آواز نے دلا سے کام کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری دلی کیفیت جان کر ہی آیا ہے۔ تپتے صحرا میں پانی کی بوند بن کر۔

”دروازہ کھلا ہے۔“ میں نے بلند آواز میں جواب دیا۔

سفیر اندر آیا۔ شفقت بھرے انداز میں مجھے دیکھا۔ اس کی نظریں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ گلے تھے شکوے تھے۔ حوصلے رکھنے کے دلا سے تھے۔ جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہو مگر کہنے سے گریزاں تھا۔ اس نے ایک بھر پور نظر مجھ پر ڈالی اور سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک سکوت کی چادر تنی رہی پھر اس خاموشی کو اسی نے چاک کیا۔

سفیر نے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہتھیلیوں کے کٹورے میں سنبھال کر کہا۔ ”تو مرشد کو تلاش کرنا چاہتا ہے نا۔“

میں نے نظریں اٹھا کر سفیر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس پتھر جیسے چہرے پر اس وقت شفقت کی چادر تنی ہوئی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اپنا چہرہ اٹھا کر کسی ننھے بچے کی طرح کہا۔ ”ہاں!“
”بس تو پھر تیاری کر لیں۔“ سفیر نے الگ ہو کر مجھ پر نظر ڈالی۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ”یہ کون سا مشکل کام ہے۔“

”ہاں، مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ دوڑے اور بلی پکڑ لی، وہ یہاں نہیں ہے۔“

”پاتال میں بھی ہو تو ہم اسے کھینچ لیں گے۔ وہ غچے پر غچے دے رہا ہے پھر بھی ہم نے اس کا پیچھا چھوڑا؟“

آخر دم تک اس کے پیچھے لگے رہیں گے، سمجھے۔“

”ہاں!“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہم نے اسے معاف کیا؟ ارے جب تک ہماری دلی آرزو پوری نہیں ہوتی ہم اس کا پیچھا کرتے رہیں

”کوئی عجیب بات نہیں۔ بعض دفع ایسا ہوتا ہے کہ سامنے کی بات سمجھ نہیں آتی اور ہم الجھے رہتے ہیں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ وہ کس طرح لوکیشن بتا دیا کرتا تھا۔“

”ہاں ہاں کہو گے کہ اس کے پاس جام جمشید تھا جس میں وہ بیٹھا ان کو دیکھ رہا ہوتا تھا۔“ وسیم نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

”بالکل اس کے سامنے جام جمشید تھا۔ آئینہ سکندری تھا..... ارے بے وقوف یہ انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ہر انسان نظروں کے سامنے رہتا ہے۔“ سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اس آئینہ سکندری کا نام گوگل ہے..... عقل استعمال کرو۔ وہ گوگل اتھ میں شہباز کے فون کا نمبر ڈالتا اور سرچ کرتا۔ گوگل لوکیشن بتا دیتا۔ یہ ایسی کون سی حیرت کی بات ہے۔ تم خود ابھی کسی کے فون کا نمبر انٹر کرو اس کا لوکیشن آجائے گا۔ اب تو ایسے ایسے سوفٹ وئر آچکے ہیں جو مقام کیا، بہت کچھ بتا دیتا ہے۔“

”ہاں..... یہ سامنے کی بات عقل میں نہیں آرہی تھی۔ یہی ہوا ہوگا۔ وہ تو ہمارے اس گھر کا لوکیشن بھی دیکھ چکا ہوگا۔“

”اپنا موبائل ادھر دیں۔ یہ قیمتی موبائل ہے اس لیے ایسا ہو جاتا ہے۔“ کہہ کر اس نے میرا موبائل لیا اور اس سے سم نکال لی پھر بولا۔ ”اب اس کا باپ بھی ڈھونڈ نہیں سکتا۔ اب تو آپ کی بھی سمجھ میں یہ بات آچکی ہو گی۔“ سفیر نے کہا۔

”ہاں بہت کچھ سمجھ میں آچکا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو اب اصل مدد کی طرف آتے ہیں۔ وہ یہ کہ اب کیا پروگرام ہے۔ مرشد کے ساتھ کیا، کب اور کیسا سلوک کیا جائے؟“ وسیم بولا۔

”ابھی تو میں تھکا ہوا ہوں۔ ایسا کرتا ہوں کہ ایک نیند لے لیتا ہوں تاکہ ذہن فریش ہو جائے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں آپ سولیں ہم انتظار کر لیتے ہیں۔“ کہتے ہوئے سفیر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب باہر نکل گئے تو میں لیٹ گیا۔

میں نے اس وقت تو سوچنے کے لیے مہلت مانگ لی لیکن میرا بھی ارادہ تھا کہ مرشد کو اس کے گھر میں گھس کر مارنا ہی بہادری ہے۔ ایک بار تو وہ بچ گیا لیکن اس بار اسے بچنے کا راستہ نہیں دوں گا تاکہ یہ روز روز کا قصہ ختم ہو جائے۔ لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا اس لیے میں نے بھرپور انداز میں پلاننگ پر غور کرنا ضروری سمجھا اور ان سب سے بہانہ کیا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔

ان سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ اب میں تھا اور میری تنہائی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تمام باتوں کو ایک سطر میں لا کر اس پر غور کرنا شروع کر دیا کہ حملہ کس طرح اور کس رخ سے کیا جائے۔ اندر جانے کے لیے کون سا طریقہ استعمال کیا جائے۔ انہی سب باتوں پر غور کر رہا تھا کہ دروازے کو کسی نے تھپتھپایا۔ میں نے پوچھا، کون؟

”میں ہوں۔ مرتجس۔“ باہر سے آواز آئی۔

”ارے..... تم کو بھی اجازت لینے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے وہ جیکٹ اتار دی تھی جو اس کی پہچان بن گئی تھی۔ جب سے وہ ہمارے ساتھ تھا اس کے جسم پر ایک ہی جیکٹ دیکھ رہا تھا۔ کئی بار میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ بھائی اسے اتار دو لیکن وہ بس مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس لڑکی نے اسے دیا تھا جسے وہ اپنے گھر کی ملکہ بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے دوبارہ ضد نہیں کی تھی لیکن آج اس کو بغیر جیکٹ کے دیکھ کر میں نے پوچھ لیا۔ ”تمہاری جیکٹ کہاں گئی؟“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ..... یہاں کچھ گرمی زیادہ ہے اسی لیے اتار دی۔“ پھر میرے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک دوست کے پاس سے آ رہا ہوں۔ آج مان لیا ہے کہ دنیا گول ہے۔“

”اچھا..... اس کی کوئی توجہ ہوگی۔ وہ وجہ کیا ہے جس نے تمہیں سمجھایا کہ دنیا گول ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں جس دوست کے پاس گیا تھا وہ بھی گلگت میں رہ چکا ہے۔ اس کا نام نادر شاہ ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ریاست خان کارشتے دار ہے۔ ریاست خان کو ہم اسپتال میں چھوڑ آئے ہیں لیکن وہ ہمارا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس نے فون پر نادر شاہ کو ہدایت دی ہے کہ ہم سے رابطہ کرے۔ ریاست خان بھی پنڈی آنے والا ہے۔“ مرتجس نے بتایا۔

”تمہیں یقین ہے کہ نادر شاہ مخلص ہے۔ کہیں وہ بھی مرشد کا بندہ نہ ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”اپنے تین سوالات کر کے میں تو مطمئن ہو گیا ہوں۔ پھر بھی آپ اسے کرید کر تشفی کر لیں۔ آپ تجربہ کار ہیں۔ زیادہ اچھی طرح سے حقیقت اگوا سکتے ہیں۔ ویسے تو وہ مرشد کا مرید ہے لیکن اب وہ بھی مرشد سے بغاوت کرنا چاہ رہا ہے۔“

”صحیح ہے۔ اسے بلا لو ہم آزما لیتے ہیں۔“ میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔

”بلا نا کیا ہے۔ ابھی کہیں ابھی بلا لوں، اس کا موبائل نمبر لے آیا ہوں۔ ساتھ اس لیے نہیں لایا کہ آپ سے اجازت نہیں لی تھی۔“

”بلا لو.....“

اجازت ملتے ہی اس نے فون نکالا اور کال کرنے لگا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی ہم کسی پر بھروسہ نہیں کرتے لیکن اس وقت میں نے یہ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ باتیں کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے کمرے سے باہر جاتے دیکھ میں نے سکھ کی سانس لی اور دوبارہ سے لیٹ گیا۔ مگر لگتا ہے آرام مجھے نوائٹری کا بورڈ دکھانے پر اتر آیا تھا۔ وہ باہر گیا تھا کہ وسیم آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”مبارک ہو جناب..... آپ اپنے پیچھے ایک بندے کو بھی لے آئے تھے۔ وہ سڑک کے اس پار کھڑا کسی کو خبر دے رہا تھا کہ ہمارے بندوں نے اسے چھاپ لیا۔ اس وقت وہ گیراج میں آرام کر رہا ہے۔ باہر کتے کے ساتھ آدمی کا بھی پہرا ہے۔ ان دونوں کو دھوکا دینا آسان نہیں۔ وہ کتنی ہی کوشش کر لے لیکن بھاگ نہیں سکے گا۔“

”یہ تمہارے آدمی کہاں سے آ گئے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”حضور، میں نے کل ہی پنڈ سے ہجرت کی ہے۔ اور میں اول عمر سے ہی پنڈ میں پودینہ کی کاشت کرتا

تھا۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”میں نے اپنے تمام کونٹیکٹ جمع کر لیے ہیں۔ صرف میں نے ہی نہیں۔ عبداللہ نے بھی اپنے آدمیوں کو بلا لیا ہے۔“ اسی وقت سفیر اندر داخل ہوا تھا کہ اسے چھیڑنے کے لیے وہ بولا۔ ”رہا سوال سفیر کا تو اس کی فوج ابھی ریزرو میں ہے۔ وہ آپ کے ہاں سب کو سمیٹ کر بیٹھی ہیں۔ جس دن آگئیں اس دن ان کی پھرتی دیکھئے گا۔“

سفیر نے سلسلہ کلام کا آخری حصہ سنا تھا اس لیے تلملا اٹھا۔ وسیم نے سیدھی چوٹ کی تھی کہ وہ مونا کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ اسی لیے خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”اور یہ جناب تو سادی کی ہر بات سے اختلاف کرتے ہیں۔ اگر وہ رات کو رات کہتی ہے تو یہ کہتے ہیں نہیں یہ دن ہے۔“

”میں تو جدی پشتی زن مرید ہوں آپ کو اعتراض ہے؟“ وسیم لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا۔

”جد کی تو خبر نہیں کیونکہ میں ابھی اتنا بڑا گستاخ بنا نہیں ہوں لیکن تمہاری حرکتیں دیکھ کر دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم زن مرید ہو۔“ سفیر نے جواب الٹ دیا۔

”ابھی میں فون کر کے مونا کو کہتا ہوں کہ یہ جناب فرما رہے ہیں کہ میں مونا کی سنتا نہیں ہوں اور نہ اس کی باتوں پر کان دھرتا ہوں۔“

”ضرور ضرور۔ فون حاضر ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنا موبائل بڑھا دیا۔

ان دونوں کی بے معنی بحث طویل ہوتی جائے گی اس ڈر سے میں نے جلدی سے کہا۔ ”ہم ایک اہم بات پر گفتگو کر رہے تھے کہ تم آگئے۔ اور اس نے تمہیں چھیڑنے کے لیے بات بدل دی۔“

”واہ یہ کیا بات ہوئی..... یہ کوئی صنف مخالف ہیں جو میں ان کو چھیڑوں گا۔“ وسیم پھر بول اٹھا۔

سفیر کچھ کہتا کہ میں نے دوبارہ دخل دیا۔ ”بات ہو رہی تھی مرشد کی کہ اس سے کس حکمت عملی کے تحت بچہ آزمائی کی جائے۔“

”آپ کہتے ہیں تو میں سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔“ وسیم نے کہا۔ ”میں یہ بتا رہا تھا کہ ایک بندہ ہمارے گھر کی ریکی کر رہا تھا کہ ہم نے اسے چھاپ لیا اور اسے گیراج میں لا کر بند کر دیا۔“

”کب؟“ سفیر نے پوچھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ کام ابھی اور اسی وقت ہوا ہے اسی لیے سفیر بھی لاعلم ہے۔ ورنہ یہ بات اس کے علم میں ضرور ہوتی۔

”ابھی پانچ منٹ پہلے اسے نصیر اور اشفاق نے پکڑا ہے۔ اس کی زبان کھلوانے میں کچھ دیر لگی۔ اس سے منٹ کر میں یہ خبر شہباز کو دینے آیا ہوں۔ تمہیں بتانے کا وقت ہی نہیں ملا۔“

”کیا اگلوایا؟“ سفیر نے پوچھا۔

”دو چار ٹھنڈے ہی کافی ثابت ہوئے۔ دس منٹ، میں ہی وہ ریڈیو کی طرح بجنے لگا۔ اس نے بتا دیا کہ اسے شہباز کی ریکی کا حکم ملا تھا اور وہ بس اسٹاپ پر پہلے سے موجود تھا مگر جب شہباز وہاں نہیں پہنچا تو اس نے موبائل پر اپنے ہاس سے بات کی تب اسے اس سڑک پر جانے کو کہا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہیں کسی عمارت میں شہباز ہے۔“

”یہ سب آئی فون کا کمال ہے کہ وہ تمہاری لوکیشن کو ٹریس کرتے رہے۔ جب سم بند ہوگئی تو اندھیرے

میں آگئے۔“ سفیر نے کہا تو مجھے اس نکتے پر غور نہ کرنے والی بات یاد آگئی اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔
 ”چلو چل کر اس سے دو تین سوالات میں بھی کر لوں۔“ سفیر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
 ”چلو میں بھی چلتا ہوں۔“ میں بھی بیڈ سے اتر گیا۔

کہہ کر میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ وسیم سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے میں تھا۔ ہم سب گیراج کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ کتے کے پاس چوکیدار کھڑا تھا۔ اس وجہ سے کتا خاموش تھا۔ ہم اس کے برابر سے گزر گئے لیکن اس نے کوئی آواز نہ نکالی۔

اندر پہنچ کر دیکھا کہ ایک بندہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ وہیں قریب دو کرسیوں پر دو بندے پستول بدست بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ میں اس بندے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا پھر وسیم سے کہا۔ ”کیوں نہ اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا جائے تاکہ سوالات کے جوابات دینے میں اسے آسانی ہو۔“

وسیم نے اشارہ دیا اور ان دونوں میں سے ایک نے اسے سیدھا کیا پھر اسے سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ میں اس کے مزید قریب ہو گیا اور پھر پوچھا۔ ”ہاں بھائی اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم کس کے کہنے پر میرا پیچھا کر رہے تھے۔“

وہ خاموش رہ کر میری طرف دیکھتا رہا تب میں نے سفیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ جو ہے نا، اپنے کام کا ماہر ہے۔ پورے پاکستان میں اس کے جوڑ کا بندہ نہیں ملے گا۔ یوں سمجھ لو کہ یہ اذیت دینے پر اتھارٹی رکھتا ہے۔ اس کے آگے گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔ اب تمہاری مرضی کہ تم بولو یا خاموش رہو۔“
 وہ ایسا کمزور بندہ تھا کہ دوسری دھمکی کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور وہ بول اٹھا۔ ”میں نے تو ان صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔“

”ایک بار پھر بتا دو گے تو گناہ نہیں ہو گا۔ شاباش شروع ہو جاؤ۔“ وسیم نے کہا۔
 ”مجھے فون پر کہا گیا کہ بس اسٹنڈ پہنچو۔ مری والی بس پر ایک آدمی ہو گا جس نے دھاری دار قمیص اور نیلے رنگ کی پینٹ پہن رکھی ہے۔ اسے گھیر کر ہمارے پاس لاؤ۔ لیکن وہ بس تو آگئی مگر اس میں ایسا کوئی بندہ نہیں تھا جس نے دھاری دار شرٹ اور نیلے رنگ کی پینٹ پہن رکھی ہو۔ میں نے فون پر بتایا تو ادھر سے کہا گیا کہ وہ راستے میں اتر گیا ہے۔ تم فوراً مرکزی سڑک پر پہنچو۔ وہاں داہنی جانب ایک پوش علاقہ ہے اس میں اسے تلاش کرو کہ وہ کس مکان میں ہے۔“
 ”تمہیں یہ حکم دینا کون ہے؟“

”احمد سعید۔“ اس نے کہا تو مجھے یاد آ گیا کہ یہ نام میں پہلے بھی سن چکا ہوں کہ وہ خانقاہ کو نئے سرے سے بنوا رہا ہے۔

”اچھا اب آرام کرو میں دیکھتا ہوں کہ احمد سعید ہے کیا چیز۔“ کہہ کر میں واپسی کے لیے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ رک گیا اور بغیر مڑے وسیم سے کہا۔ ”اس کے ہاتھ پیر کھول دو لیکن سمجھا دینا کہ باہر مسلح بندے بھی ہیں اور کتا بھی جو ایک منٹ میں چیر پھاڑ دے گا۔“

باہر نکلا ہی تھا کہ مرتجس مجھے ڈھونڈتا ہوا آگیا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی کہا۔ ”وہ بندہ آگیا ہے۔ آپ اس سے مل لیں۔“

میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ سامنے ہی ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ چہرے سے ہی ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مدرسہ سے اٹھ کر آیا ہو۔ بہت بھولا بھالا۔ عام سے لباس میں ملبوس۔ سر پر جالی والی ٹوپی اور کندھے پر چار خانوں والا رومال۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بلیغ انداز میں سلام کیا۔ وہ کھڑا ہو گیا تھا اس لیے مجھے اسے بیٹھنے کا کہنا پڑا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔ ”ہاں بھائی کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میرا نام نادر شاہ ہے اور مجھے ریاست خان نے فون پر کہا ہے کہ آپ کی مدد کروں۔ وہ بھی شام تک پہنچ جائیں گے۔ آپ کا ساتھ دینے کے لیے ریاست نے اس لیے مشورہ دیا ہے کہ وہ میرے حالات اور خیالات سے آگاہ ہے۔ دراصل میں سمجھ چکا ہوں کہ مرشد اور اس کے لوگ اللہ کا نام لے کر شیطان کا کام کر رہے ہیں۔ مجھے جہنم کی آگ میں جلنا نہیں ہے اس لیے میں چاہ رہا ہوں کہ مرشد کا یہ کاروبار بند ہو جائے۔“

”ہر بات کی ایک وجہ ہوتی ہے۔ اپنے پیر سے تم بغاوت کرنے کی سوچ رہے ہو تو اس کی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ ہوگی۔ کوئی بات ہے جس کی وجہ سے تم اس کے دشمن ہو گئے؟“ سفیر نے سوال کیا۔

”مجھے اس سے تو شکایت ہے ہی لیکن اصل شکایت یہ ہے کہ وہ دین کا نام لے کر لوگوں کو گناہ کے راستے پر چلا رہا ہے۔ اللہ کا عزم ہے کہ ایسے لوگوں کا ساتھ کبھی نہ دو۔“

”تو پھر تم خاموشی سے الگ ہو جاؤ۔“ وسیم بولا۔

”یہی کیا ہے لیکن وہ چین سے بیٹھے نہیں دے رہا ہے۔ میں سرگودھا چلا گیا تھا۔ اس کے کارندے وہاں بھی پہنچ گئے۔ جب تک اس کی کمر نہیں ٹوٹے گی وہ اسی طرح ستا رہے گا۔“

”وہ جہاں بیٹھا ہے سنا ہے وہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔“

”اس کو کمزور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ احمد سعید کو دبوچ لیں۔ اگر وہ مرشد سے الگ ہو گیا تو مرشد بالکل ٹوٹ جائے گا خانقاہ کو بھول بھلیاں میں تبدیل کرنے والا وہی شخص ہے۔“

”احمد سعید ملے گا کہاں۔“

”وہ ایک ہفتہ پہلے تک خانقاہ میں ہی رہ رہا تھا لیکن اب وہ ایک بنگلے میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس نے ایک سولہ سال کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر وہ اس لڑکی کے ساتھ رہ رہا ہے۔“

”تم ایسا کرو کہ اپنے ساتھ وسیم کو لے جاؤ۔ اسے بنگلا بھی دکھا دینا تا کہ وہ اس کو دبوچنے کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈ سکے۔“

”جی ضرور۔ میں ان کو ساتھ لے جا کر وہ بنگلا دکھا دیتا ہوں۔“ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”یاد رکھنا ہمیں مرشد کی سلطنت کا خاتمہ کرنا ہے۔ یہ سوچ کر لڑنا ہے کہ یہ ہماری آخری جنگ ہے۔ اس وقت وہ اپنے قلعہ نما مکان میں بیٹھا خود کو محفوظ سمجھ رہا ہے اور اسی کو ہمیں غلط ثابت کرنا ہے۔“ میں نے وسیم سے کہا اور پیٹھ پر تھکی دے کر بولا۔ ”اللہ تمہیں کامیابی عطا کرے۔“

وسیم کے جاتے ہی میں نے کہا۔ ”سفیر یہ ایک اہم بات ہے کہ مرشد نے ڈھیروں ڈھیروں لوگوں کو اکٹھا کر لیا

ہے لیکن ان پر قابو نہیں کر پا رہا۔ یعنی ان کو صحیح طور پر قابو میں رکھ نہیں سکا ہے۔ تبھی تو لوگ اس سے ٹوٹ رہے ہیں۔“

”مرشد کے لوگ دراصل اس کے مرید ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ان سے کوئی اہم کام نہیں لے رہا ہو گا۔ صرف افرادی قوت دکھانے کے لیے وہ ان کو ساتھ رکھے ہوئے ہے۔“

”تو پھر ایسے لوگوں کو ڈھونڈو۔ یہی لوگ ہمارے کام کے ہیں۔ اس لیے کہ وہ یہ سمجھ کر اس کا ساتھ دے رہے ہیں کہ بابا جی کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ مسلکی بنیاد پر اس کی خانقاہ کو برباد کیا گیا ہے۔ جب انہیں اس کی اصلیت کا پتا چلتا ہے تو وہ دور بھاگنے لگتے ہیں۔ ایسے باغیوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔“

”اتنے بڑے شہر میں اس کے مریدوں کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی کوشش کروں گا۔“

”شاباش، یہ ہوئی نابات۔ اب نکل پڑو تا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔“ میں نے کہا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سفیر ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں نے آنکھیں بند کی تھیں اور سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے عبد اللہ کھڑا ہنس رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اب تم بھی بتا دو کہ تمہیں کیا تکلیف ہے؟“

”سنا ہے آپ سورہے ہیں؟“ عبد اللہ نے گھبرا کر کہا۔

”پتا نہیں کس دشمن نے اڑادی ہے۔ میں تو بستر پر لیٹا نگلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ بچپن کو بلا رہا تھا۔“

”بس..... یوں ہی آگیا..... اچھا میں جا رہا ہوں۔ آپ سو جائیں۔“

”یار تم بھی نا..... لگتا ہے برا مان گئے..... میں تو مذاق کر رہا تھا..... بولو کیا بات ہے؟“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”کچھ کہنے ہی آئے ہو گے اور وہ بات یقیناً ضروری ہوگی اس لیے کہہ ہی دو۔“

”وہ بات یہ ہے کہ میرے ایک بندے نے ایک ایسے آدمی کو ڈھونڈا ہے جو خانقاہ کی تعمیر کے وقت مزدوری کر چکا ہے۔“

”کہاں ہے اسے بلاؤ۔“

”وہ باہر بیٹھا ہے۔“ وہ مڑ گیا اور باہر نکلنے سے پہلے بولا۔ ”ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔ وہ ڈرائیونگ روم میں بیٹھا ہوا ہے۔“

عبد اللہ کے جانے کے بعد میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”آج آرام کرنا کفر بن گیا ہے۔ عبد اللہ کے بندے سے سوال جواب کرنا ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔“

ابھی میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ عبد اللہ ایک بندے کے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ جواں سال تھا لیکن چہرے اور کپڑوں سے ہی مفلوک الحال نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے سامنے بچھے صوفے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ دیا۔

وہ جھپکتے ہوئے بیٹھ گیا۔ میں نے عبد اللہ سے کہا۔ ”ان کے لیے چائے کا کہہ دو۔“

عبد اللہ نے کمرے میں لگے انٹر کام پر کسی کو چائے لانے کا کہا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے اس

بندے کی طرف رخ کیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ شاید وہ امارت سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے اسے ریلیکس دینے کے لیے کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی میرا نام شیدے ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”بھائی شیدے آپ روز کتنا کما لیتے ہو۔“

”جی اگر دہاڑی لگ گئی تو ہر روز ایک ہزار روپیہ لیکن کام ہفتے میں دو تین دن ہی ملتا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ کیا تم چائے وغیرہ بنا لیتے ہو؟“

”بہت اچھی تو نہیں لیکن جیسی ہم لوگ پیتے ہیں۔ بنا لیتا ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ آتے وقت تم نے باہر لان دیکھا ہے نا..... کیاری میں طرح طرح کے پھول لگے ہیں۔

گھانٹے بڑے قرینے سے کٹی ہوئی ہے۔ اگر تمہیں مالی کے ساتھ کام کرنا پڑے تو کیا کر لو گے۔“

میری اس بات سے اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک آ گئی۔ جو میں چاہ رہا تھا وہ میں نے حاصل کر لیا۔

اس کے اندر جو ہچکچاہٹ تھی، جو مرعوبیت تھی وہ ختم ہو گئی اور اس کے اندر یہ لہر پیدا ہو گئی کہ اسے میں نوکری پر رکھ

لوں گا۔ وہ مطمئن دکھائی دینے لگا تھا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ اسے چائے پینے کا اشارہ کرتے ہوئے میں نے

کپ اٹھا لیا اور سپ لے کر کہا۔ ”تم کل سے کام پر آ سکتے ہو۔ تمہیں فی الحال دس ہزار دوں گا اور بعد میں اضافہ

کردوں گا۔“

عبداللہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ اس نے بندے کو کس مقصد سے بلایا تھا اور میں اسے کون سا کام

سونپ رہا ہوں۔

میں نے چائے کا کپ برابر میں رکھی تپائی پر رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی چائے ختم نہیں کر پایا تھا۔

میں نے عبداللہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”ان کو ایڈوائس میں آدھی تنخواہ دے دو۔“

عبداللہ نے بغیر کچھ پوچھے۔ جیب سے پانچ ہزار روپے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس وقت

اس کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ اس کے ہر انگ سے خوشی پھوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تب میں نے اس سے پوچھا۔

”شیدے بھائی آپ مرشد کے ہاں کب سے کام کر رہے تھے۔“

”جی میں نے ان کے ہاں تین مہینے تک کام کیا ہے لیکن دربار میں حاضری دس بارہ سال سے دیتا آ رہا

ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ ان کی خانقاہ جب تباہ ہو گئی تو بھی تم لوگ آتے رہے۔ ایسا کیوں؟“

”شاہ جی نے بتایا تھا کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو نہیں چاہتے کہ ہماری خانقاہ میں کوئی آئے۔ یہاں جو

درس دیا جاتا ہے ان لوگوں کی نظر میں یہ غلط ہے اسی لیے انہوں نے دہشت گردوں سے حملہ کر دیا۔“

شیدے کی بات سن کر میں نے قہقہہ لگایا تو وہ بولا۔ ”جی میں سمجھ گیا کہ آپ کیوں ہنسے ہیں۔ جب میں

خانقاہ کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے وہاں رہنے لگا۔ رہتا اس لیے تھا کہ یہاں میرے بیوی بچے تو ہیں نہیں، سب

گاؤں میں ہیں۔ اس لیے وہیں ایک شیڈ کے نیچے رات کو سو جاتا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے میں نے شاہ جی کا اصل

چہرہ دیکھا۔ وہی شخص جو دن میں نیکی کی ہدایت کرتا ہے، رات میں گناہ کا بازار سجالیتا ہے۔ یہ ڈانگو ایک فلم کا

ہے لیکن بات سچی ہے۔ یہی سب دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا لیکن روزی لگی ہوئی تھی اس لیے میں کچھ کہتا نہیں۔“

”کام کرنے کے درمیان بھی تم اس کی محفلوں میں جاتے تھے؟“

”دن والی محفل میں جاتا تھا۔ رات والی محفل میں صرف گئے چنے لوگ ہوتے تھے۔“

”اندر خانقاہ کیسی بنائی ہے؟“

”اتنی عمدہ ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ دن رات کام ہوتا تھا۔ سب کو ڈبل ڈبل دہاڑی دی جاتی تھی لیکن کام بھی گدھے جتنا کرنا پڑتا تھا۔ اندر ایک تین منزلہ عمارت ہے جو داعظ کے لیے مختص ہے، نیچے بڑی محفل ہوتی ہے اور اوپر پتا نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اوپر کی منزل پر صرف ایک چھوٹا ہال ہے باقی کمرے ہی کمرے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ دوسری اور تیسری منزل کو ملا کر گئیں تو کئی سو کمرے ہیں۔ وہ عمارت صرف دو مہینے میں تیار ہو گئی تھی۔ اس وقت میں نے کہا بھی تھا کہ ابھی پلاستر نہ کریں بنیاد بھی کچی ہے لیکن شاہ جی کا حکم تھا اس لیے ہمیں کچے وقت میں ہی پلاستر کرنا پڑ گیا تھا۔“

”اس عمارت میں پلاستر تم نے کیا تھا؟“

”نہیں جی..... اوپر کسی اور نے پلاستر کیا ہے۔“

”کل کتنے کمرے ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”الہی توبہ..... قطار در قطار اتنے کمرے ہیں کہ ان کو گناہی نہیں جاسا سکتا۔ تین منزلہ عمارت اور کمرے اتنے کہ یقین نہ آئے۔ آٹھ بائی آٹھ کے کمرے ہیں اور ہر منزل پر پچاس ساٹھ کمرے ہیں۔ جگہ بھی تو دیکھیں کتنی بڑی جگہ پر بلڈنگ کھڑی کی گئی ہے۔“

”تمہاری نوکری کچی اب تم جا کر اپنا سامان لے آؤ۔ تم اب ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔“ کہہ کر میں نے اسے جانے کا اشارہ دیا اور خود سونے کے لیے کروٹ بدل لی مگر آرام اپنی قسمت میں کہاں ہے۔ ابھی میں نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ نادر شاہ اور وسیم واپس آ گئے۔ وہ دونوں ہر جوش تھے۔ وسیم نے کہا۔ ”ہم نے آدھی جنگ جیت لی ہے۔“

”ایسا کیا کر دکھایا؟“

”اگر کہیں تو میں پورا واقعہ من و عن بیان کر دوں۔“ اس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔

وسیم کا جوش دیکھ کر میں نے اجازت دے دی۔ مجھے ہمہ تن گوش دیکھ کر اس نے بتانا شروع کیا۔ ”ہم لوگ یہاں سے نکلے اور مین روڈ پر پہنچے۔ مین روڈ پر معمول سے زیادہ رش ہونے کے سبب میں دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔“

”لگتا ہے آگے چیک پوائنٹ لگی ہوئی ہے۔“ نادر نے ریٹکتی ہوئی گاڑیوں کی قطاریں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں اس روڈ پر باقاعدہ کوئی چیک پوائنٹ نہیں ہے مگر آج.....“

”ہاں، شہر کے حالات بھی تو عجیب سے ہو گئے ہیں۔“ نادر نے ایک موٹر سائیکل سوار کو گھورتے ہوئے کہا

جو گاڑیوں کے پتھوں بیچ تیزی سے راستہ بناتا ہوا گزر رہا تھا۔ ”مگر کچھ نہیں سکتے۔“

”بیچارے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو نادر مسکرا دیا۔ گاڑی اب چیونٹی کی چال ریگ رہی تھی۔

دائیں بائیں گاڑیوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ رکشوں اور موٹر سائیکلوں کا شور اور سلنسر کے دھواں سے بچنے کے لیے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ سنٹر لائن میں سرکتے ہوئے ہم چیک پوائنٹ تک پہنچ گئے۔ تین پولیس مین گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔ دو تین روڈ کے بیچ لگائی گئی رکاوٹیوں کے پاس کھڑے تھے۔ ایک موٹی توند والا کانسٹیبل ہمارے پاس آیا۔ میں نے شیشہ نیچے کر دیا۔ اس نے جھک کر پہلے ہم دونوں کو دیکھا پھر گاڑی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں جی صاحب کہاں سے آرہے ہو اور کدھر کو جانا ہے؟“

”یونیورسٹی سے آرہے ہیں اور گھر جانا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ اس نے طویل ہنکارا بھرا۔ ”ذرا ڈیگی کھولنا۔“

میں نے بٹن دبا کر ڈیگی کھول دی۔

”اوائے اقبال ڈیگی چیک کر۔“ اس نے قریب کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا۔ وہ سر ہلاتا ہوا ڈیگی کی جانب چلا گیا۔

”آپ لوگ باہر آ جائیں۔ مجھے اندر سے گاڑی چیک کرنی ہے۔“

ہم دونوں نے حکم کی تعمیل کی۔ گاڑی اچھی طرح چیک ہو چکی تو ہمیں جانے کا گرین سگنل ملا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”اس روڈ پر تو کوئی چیک پوائنٹ نہیں تھا۔ آج یہ غیر معمولی چیکنگ، خیریت ہے نا؟“

بھاری توند والا کانسٹیبل دوسری گاڑی کی جانب بڑھنے کی بجائے رک کر مجھے گھورنے لگا۔

”نیوز نہیں دیکھتے ہو کیا؟“ اس نے نسبتاً غصے سے پوچھا۔

”پڑھائی دیگر سرگرمیوں کے لیے فرصت کہاں دیتی ہے؟“

کانسٹیبل نے چھتی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نیوز دیکھا کرو حالات حاضرہ کی جان کاری ہوتی ہے۔“

”جی بہتر۔“ میں اس کی بات سن کر بولا۔ پھر میں نے یوں سر ہلایا جیسے پوری بات سمجھ گیا ہوں اور گیر لگاتے ہوئے نادر سے بولا۔ ”حکومت کے ساتھ وفاداری بھارہا ہے۔“

پھر میں نے گاڑی کی اسپید بڑھادی۔

کچھ ہی دیر میں ہم احمد سعید کے بنگلے کے باہر موجود تھے۔ سفید رنگ کی کروڑا کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں تھا۔ ناصر میرے ساتھ براجمان تھا۔ شام ڈھلے کا وقت تھا۔ دو رافق پر سرمئی بادل زرد روشنی میں ڈھلنے لگے تھے۔ روڈ بالکل سنسان تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں کے مکان کینوں سے خالی ہیں۔ روڈ کے ایک طرف بڑے بڑے بنگلے اور خوبصورت کوٹھیاں تھیں، جبکہ اس طرف جہاں احمد سعید کا بنگلا تھا کافی پلاٹ خالی پڑے ہوئے تھے۔ پلاٹ پر مکینوں کی گاڑیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ میں نے بھی اپنی کروڑا اسی قطار میں کھڑی کر دی۔ اب احمد سعید کا بنگلا ہمارے سامنے تھا۔

”تو یہ ہے احمد سعید کا بنگلا؟“ میں نے پوچھا۔ میری نظریں بنگلے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ہاں یہی ہے، بنگلا نمبر اکیس۔“

”کافی بڑا بنگلا ہے۔“

”ہاں..... سنا ہے یہ پہلے اکانومی فلیٹوں کے ایک کمپلیکس میں رہتا تھا۔“ ناصر نے جواب دیا۔ ”اور فلیٹ بھی کمپلیکس کے دیگر فلیٹوں سے نچلے درجے کا تھا۔ مگر اب شہر کی کئی ہاؤسنگ سوسائٹیاں، بڑی بڑی کالونیاں، شاپنگ مال، کئی بڑے شہروں میں کٹھیاں اور بنگلے۔ ان سب کا مالک ہے احمد سعید۔“ اسے جو کچھ یاد تھا دہرا دیا۔ ”یہی نہیں سنا ہے موصوف نے اب ایک موبائل کمپنی میں شیر بھی خرید لیے ہیں۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے مراد علی پرلے درجے کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔“

”وہ بھی سچ ہے۔“

”گویا مرشد کے پاس آتے ہی اس کے ہاتھ الہ دین کا چراغ ہاتھ آگیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں، سنا گیا ہے کہ مرشد کے پاس آنے کے کچھ دن پہلے ہی وہ یکا یک امیر ہو گیا تھا۔“

”اس کے معنی ہیں کہ دولت کی دیوی کسی اور ذریعہ سے اس تک پہنچی۔“

”جی ہاں، وہ یکا یک ہی امیر بنا ہے۔ امیر بننے کے بعد اس نے مرشد سے دوستی کی۔ اس کی دوستی کے بعد مرشد جو بالکل ٹوٹ چکا تھا، پھر سے عملی میدان میں آگیا۔“

”گویا جو اسے امیر بنا رہا تھا اسی نے اسے مرشد سے راہ رسم بڑھانے پر اکسایا اور وہ مرشد کے قریب ہو گیا مگر اب بس چند دنوں کی بات ہے۔“ میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جلد، ہیں سے“ تھے“ ہو جائے گا۔“ میری نظریں متواتر بنگلے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اچانک اندر سے ایک ٹینس بال دیوار کے اوپر سے اچھلتی ہوئی ہمارے سامنے آگری۔ بال نے دو تین گدے کھائے اور گاڑی کے ساتھ ٹک گئی۔ میں نے گیند کو دیکھا، پھر مرکزی دروازے کو۔ اسی وقت ایک دس سالہ بچہ، ابھر نکلا، میں نے بھاگتے ہوئے بچے کا جائزہ لیا۔ بچے کے پیچھے دو سیورٹی گارڈز بھی لپکے تھے۔ بچہ بھاگتا ہوا ہمارے نزدیک آگیا تھا۔ اس نے ٹھٹک کر ایک نظر ہمیں دیکھا اور گیند اٹھا کر واپس گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔ اسے واپس آتا دیکھ سیورٹی گارڈز رک گئے۔ میں بغور سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

نادر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کس سوچ میں ہیں؟“

”یہ بچہ؟“

”احمد سعید کا نہیں ہے۔“

”پھر.....؟“

”اس بچے کا نام شادیز ہے احمد سعید نے جس لڑکی سے شادی کی ہے یہ اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ یہ بچہ احمد سعید کے پوتے سے بھی چھوٹا ہے۔ اس سے سمجھ لیں کہ اس کی نئی بیوی کی عمر کیا ہوگی جو اس لڑکے سے چند سال ہی بڑی ہوگی۔“

”ہوں..... میں نے طویل سانس بھری۔“ فطرت میں کتنی یکسانیت ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ نادر نے کہا۔

”تمام بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اب اسے ہی دیکھ لو۔ اس کے پاس گیندوں کی کمی ہے کیا؟ مگر پھر بھی بچہ وہ گیند جس کے ساتھ کھیل رہا تھا لینے کے لیے باہر بھاگ آیا؟“ میں نے دور خلاوں میں نظریں گاڑتے

ہوئے کہا جیسے اپنا ماضی دیکھ رہا ہوں۔

”ہاں بچپن واقعی بہت بھلا ہوتا ہے۔“ نادر نے کہا۔

ہم اس بنگلے کا جائزہ لے رہے تھے کہ ایک گارڈ آگیا۔ اس گارڈ نے بغیر کچھ پوچھے نادر کی گال پر تمانچہ جڑ دیا۔ وہ ہمیں دھمکا کر وہاں سے بھگانا چاہتا تھا جیسے وہ سڑک اس کو دراشت میں ملی ہے۔ میرا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا لیکن اس وقت میں کوئی ہنگامہ پیدا کرنا نہیں چاہتا اس لیے میں نے گنیر لگایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

”تم نے بچپن میں ماں یا دادی سے کوئی کہانی سنی ہے؟“ گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے نادر سے پوچھا۔

”ہاں کئی بار مگر یہاں اس سوال کا کیا مقصد؟“

”پہلے تم بتاؤ۔ تم نے کون سی کہانی سنی ہے؟“

”بہت ساری سنی ہیں یا راب کیا بتاؤں؟“

”اچھا تم نے جن اور طوطے والی کہانی سنی ہے؟“

”ہاں سنی ہے۔“ نادر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہانی میں جن کی جان طوطے میں قید ہوتی ہے۔“

”بالکل اور اس طوطے کی گردن توڑ کر دیو ہیکل جن کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جاتا ہے۔ مگر میں سمجھ نہیں پا

رہا آپ نے یہ بچپن کا قصہ کیوں چھیڑ دیا۔“

”احمد سعید بھی ایک دیو ہیکل جن ہے۔ اور اس جن کی جان اس طوطے میں ہے جسے ہم نے گیند کے پیچھے

بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ملی کو تھیلے سے باہر نکالنے کے لیے ہمیں اس بچے کا سہارا لینا پڑے گا۔“

”مطلب بچے کا اغوا..... اگر ایسا سوچ رہے ہیں تو شاید غلط ہو۔“

”اغوا نہیں..... کچھ اور.....“

”مگر اس سے کیا ہوگا؟“

”احمد سعید اس بچے سے کتنا پیار کرتا ہے۔“

”بچے کی بہن بچے سے پیار کرتی ہے اور یہ بیوی سے یعنی دنیا میں شاید واحد بچہ ہے جسے احمد سعید دل و

جان سے پیار کرتا ہے بھلے ہی دکھاوے کو پیار کرتا ہو۔“

”احمد سعید خانقاہ سے اسی وقت واپس آتا ہے نا۔“

”وقت لگ بھگ یہی ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے پُر سوچ ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ”تصور کرو احمد سعید کی گاڑی بنگلے میں داخل ہوتی

ہے، عین اسی وقت گیٹ کے سامنے اس کے پیارے سالے پر فائرنگ ہوئی تو وہ کیا کرے گا؟“ میں نے چند

ساعتیں رک کر سانس لیا پھر بولا۔ ”وہ تمام تر احتیاط بھول کر باہر لپکے گا۔ گارڈز فائرنگ کرنے والوں کا پیچھا

کریں گے۔“

”یہاں تک تو بات ٹھیک ہے مگر آپ نے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا ہے؟“
”مثلاً؟“

”مثلاً یہ کہ احمد سعید کی مودنگ کے وقت ساتھ میں خانقاہ کے مسلح گارڈ بھی ہوتے ہیں۔ ہم عین اس کے گھر کے سامنے پہنچیں گے کیسے؟ پھر بچے پر فائرنگ ہونے کے بعد اس کا ہدف۔ میں سمجھ نہیں پایا۔“ ناصر نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”پہلے مجھے چند سوالات کے جواب دو تم خود ہی سمجھ جاؤ گے۔“
”ہاں پوچھیں؟“

”احمد سعید کے بنگلے کے ارد گرد اور سامنے کن لوگوں کے مکان ہیں؟“
”اس گھر کے دائیں بائیں دونوں پلاٹ خالی ہیں۔ قیاس یہی کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں پلاٹ بھی اسی کی پر اپٹی ہے۔ ہاں البتہ سامنے کا ایک گھر ریٹائرڈ آئی جی کا ہے اور دوسرا ایک بڑے تاجر خان محمد کا۔“
”اچھا۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”آئی جی صاحب ملک میں نہیں ہیں۔ وہ پچھلے دنوں بیوی کی ہارٹ سرجری کروانے لندن گئے ہیں۔“
”ان کی کوٹھی میں مزید کتنے افراد ہیں؟“

”میرا خیال ہے گھر میں چند ملازموں اور گارڈ کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔“
”اب میرا پورا پلان سنو۔“ کہہ کر مختصر الفاظ میں اپنا پلان بتایا۔
”مجھے اس پلان پر کوئی اعتراض نہیں، ماسوائے ایک بات کے۔“
”کوئی بات؟“

”احمد سعید کو آپ تنہا نارگٹ کریں گے؟“

”ہاں اور میرے خیال میں یہ کوئی قابل اعتراض بات بھی نہیں۔“

”وہ.....“ ناصر کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر میں نے اس کی بات کانتے ہوئے کہا۔ ”یہ پہلی بار نہیں ہے۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”ایسے کام کرتا رہا ہوں۔ ابھی اسے چھیڑنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اس کے گارڈ نے تمہیں تھپڑ مار کر مجھے اکسا دیا ہے کہ میں کچھ کروں۔“
”مگر یہ مشن خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

”بھروسہ رکھو مجھ پر۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”جیسا تم مناسب سمجھو۔“

تبھی مرکزی سڑک سے احمد سعید کی گاڑی مڑی۔ اس کے آگے پیچھے کئی گاڑیاں تھیں۔ احمد سعید کی گاڑی بنگلے کے اندر داخل ہوئی تو اس کی پیروی میں دیگر گاڑیاں بھی اندر چلی گئیں اور میں کچھ کر نہ سکا۔ ایک گاڑی سے چار محافظ اتر کر مرکزی دروازے پر ہی جم گئے تھے۔ اب میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اسی لمحے شاہ ویز کی بال پھر باہر آگری اور اس کے پیچھے شاہ ویز نکلا۔

احمد سعید کی گاڑی پورچ میں رکی ہوئی تھی۔ گاڑی کے لیے گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ ادھر بچہ جیسے ہی گیٹ

کے پاس پہنچا میں نے اس کے پیروں کے پاس زمین پر فائرنگ کر دی۔ گیٹ کے محافظ بھی حرکت میں آ گئے انھوں نے بھی فائر کھول دیئے تھے۔ میرے اعصاب تن گئے۔

گیٹ کھلا ہونے کے سبب احمد سعید نے نہ صرف شاہ ویز کی چیخیں سنی بلکہ اسے زمین پر گرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ بدحواسی میں باہر بھاگا۔ جب تک اندر کے محافظ پتھویشن سمجھتے وہ باہر آچکا تھا۔ وہ میرے سامنے عین نشانے پر تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر فائر کر دیئے۔ احمد سعید جو اپنے عزیز از جان سبالے پر جھکنے ہی والا تھا سینے پر ہاتھ رکھ پیچھے کی جانب اچھل کر گر پڑا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔

”چلو جلدی کرو۔“ میں نے کہا۔ کار اسٹارٹ کر رکھی تھی۔ گیسر لگایا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

”خس کم جہاں پاک، جو ہم نے چاہا وہ پورا ہو گیا اب ہمیں سب سے اہم مسئلے کی طرف آ جانا چاہیے

آپ نے کیا سوچا ہے۔ اپنا منصوبہ بتائیں۔“ عبداللہ جو وسیم کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

کچھ دیر توقف کے بعد میں نے کہا۔ ”مجھے ایک دن کا وقت چاہیے اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے۔

مکمل تیاری کے بعد ہی میں کچھ بتاؤں گا۔ اس لیے کہ جلد بازی میں وسیم سے چوک ہو گئی۔ اب مرشد ہوشیار ہو

گیا ہوگا۔ اس لیے کہ احمد سعید اس کے لیے بہت اہم تھا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے کہ اسے پتا ہے کہ آپ آپکے ہیں۔ خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ جیسی آپ کی مرضی اب

آرام کریں۔“ کہہ کر وہ سب اٹھ گئے ان کے جانے کے بعد میں مرتجس کے ساتھ اس کمرے میں آ گیا جسے

ایک بار پہلے بھی استعمال کر چکا تھا۔



وہ دن ایسے گزر گیا جیسے تین گھنٹے۔ میرے ساتھ سفیر اور وسیم بھی مصروف رہے تھے۔ اگلے دن میں نے

سب کو بلالیا ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے میں نے اپنا منصوبہ بتانے سے پہلے وسیم اور سفیر پر نظر ڈالی پھر

ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”دوستو ہم بہت بڑا جوا کھیلیں گے یہ زندگی کا جوا ہوگا اسے کھیلنے کے بعد یا تو مرشد نہیں یا ہم نہیں۔“

”اس جوئے کی شروعات کہاں سے ہوگی؟“ وسیم نے ہنس کر کہا۔

”مرشد کی نئی خانقاہ سے۔ لیکن اس جوئے میں آپ سب شریک نہیں ہوں گے۔ صرف میں مرتجس اور

سفیر اندر جائیں گے باقی سب باہر رہیں گے۔ یہ موت کا کھیل ہے اس کھیل میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو بے

جگر ہو آپ کے ساتھیوں میں بھی ایسے بے شمار بندے ہوں گے جو موت کو کھیل سمجھتے ہوں گے لیکن یہ لڑائی کچھ

ایسی ہے جس میں سب کا شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ آپ نے کبھی شطرنج کھیلی ہے؟ بساط پر سپاہی، فیل،

اسپ، وزیر، بادشاہ وغیرہ سجایا جاتا ہے۔ سپاہی، سپاہی کو مارتا ہے وزیر وزیر کو، یہ کھیل بھی مہروں کا نہیں، وزیروں

کا ہے۔ مہروں کو تباہ لڑایا جاتا ہے جب کسی ملک کو فتح کرنا ہو اور وزیر تب میدان میں آتا ہے جب بادشاہ کا

تخت چھیننا ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہونا۔“

”میں میدان میں آنے کو تیار ہوں۔“ مرتجس نے جلدی سے کہا۔

میں نے نادر شاہ کے چہرے کا جائزہ لیا پھر کہا۔ ”آپ مرتجس کو مرشد کی خانقاہ کا حفاظتی نظام بتائیں

اسے بھی ایک اہم کام انجام دینا ہے یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہم تینوں ایک ساتھ اندر داخل ہوں گے۔“

”اور میں؟ مجھے کیوں بھول رہے ہو۔“ عبداللہ نے کہا۔

”جنگ لڑتے وقت فوج کا ایک حصہ ریز رو رکھا جاتا ہے۔ تمہارا کام بعد میں شروع ہوگا۔ پہلے پورا منصوبہ سنو ہاں محترم آپ اسے اندر کا حفاظتی انتظام سمجھائیں۔“ میں نے نادر شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نادر نے حفاظتی انتظامات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد وسیم نے کہا۔ ”یہ تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے۔ ہم اندر کیسے داخل ہوں گے؟“

”ہم داخل ہوں گے اور ضرور داخل ہوں گے۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اس وثوق سے اندر داخل ہونے کی بات کر رہے ہیں تو یقیناً اندر جانے کا کوئی خفیہ راستہ دریافت کر لیا ہوگا۔“ عبداللہ نے کہا۔

”ہم کسی بھی خفیہ راستے سے اندر داخل ہوں چھپ نہیں سکتے، سب کی نظریں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔ پہریدار بھی ہمیں دیکھیں گے اور کنٹرول روم کے اسکرین پر بھی ہمیں دیکھا جا رہا ہوگا۔ اس لیے کہ اس بار مرشد نے خانقاہ کو کیمروں سے بھر دیا ہے۔ قدم قدم پر کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ بھرپور حفاظت کا انتظام ہے۔“

”ایسا کیوں نہ کریں کہ مانی کو دعویٰ سے بلا لیں۔ وہ انٹرنیٹ کا چیتا ہے۔ ایک منٹ میں وہ اس کے نیٹ ورک کو فیل کر دے گا۔“ وسیم نے کہا۔

”وہاں صرف کیمرے ہی نہیں اور بھی انتظام ہے۔ کچھ باتیں نادر شاہ نے بتائی باقی میں نے اپنے سروس سے معلوم کی ہے۔ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔“

”ایسا کیا کر دیا ہے؟ اس نے روبوٹ کی فوج بٹھادی ہے کیا؟“ وسیم نے ہنس کر کہا۔

”گزشتہ شکست نے، خانقاہ کی تباہی نے، اسے بہت بڑا سبق دیا ہے۔ پھر اسے کوئی ایسا بندہ مل گیا ہے جو دماغ دار ہے۔ خانقاہ میں جو نئی عمارتیں بن رہی ہیں وہ ناقابلِ تسخیر سمجھ کر بنائی جا رہی ہیں۔ اس کا ہر کمرہ خود میں جیل ہے۔ ہر کمرے کی دیواروں اور فرش پر باریک تار بچھائے گئے ہیں جن میں کرنٹ دوڑتا ہے۔“

”پھر وہاں کے لوگ کیسے آنا جانا کرتے ہیں؟“

”جب دشمن کا خطرہ ہوتا ہے تبھی کرنٹ دوڑایا جاتا ہے ورنہ بجلی بند رہتی ہے۔“

”اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی ہم اندر داخل ہو جائیں گے؟“ سفیر نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بریف کیس کو اٹھایا۔ اس انٹیچی نما بریف کیس کو کھول کر میں نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر اس میں سے لباس کے پیکٹ کو نکالا۔ سرمئی رنگ کے اس لباس کو کھول کر ٹیبل پر پھیلا دیا۔ وہ چغہ نما لباس تھا۔ پھر میں نے تقریر کے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”آپ سب جانتے ہیں کہ گولیوں سے بچنے کے لیے بلٹ پروف جیکٹ پہنا جاتا۔ اس قسم کے جیکٹ کے سینے اور پیٹ پر اسٹیل کی پلیٹیں استعمال کی جاتی ہیں جو حرکت میں آڑے آتی ہیں۔ یہ بھی بلٹ پروف جیکٹ ہے مگر اسے آسانی سے پہنا جاسکتا ہے۔ اس کپڑے میں ایسے اسٹیل وائر اور کیمیکل استعمال کیے گئے ہیں کہ جو آگ اور بارود کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ چاقو بھی استعمال کیا جائے تو اس کپڑے کے پار نہیں ہو سکتا۔ اس میں چمک بھی ہے اور مضبوطی بھی۔ ہم مسلمان تعداد میں بہت بڑی طاقت ہیں مگر ہمیں مٹھی بھر پڑوس کے غیر مسلم اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ ہماری دماغی

صلاحیت، پوری طاقت، آپس میں دست و گریباں ہونے کے لیے وقف ہے جبکہ وہ اپنی دماغی صلاحیت کا صحیح استعمال کر رہے ہیں۔ وہ نت نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایجاد یہودیوں کی ہے جو ہم پر یعنی اس قوم پر آزار ہے ہیں جس نے سائنس کی نئی تشریحات دنیا کو دی تھیں۔ جو کبھی علم و عقل میں سب سے آگے تھی۔ اس جیکٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پہن کر انسان بہت آسانی سے حرکت کر سکتا ہے۔ گولیوں سے بچ سکتا ہے لیکن وہاں تک کا حصہ محفوظ رہتا ہے جہاں تک پیر ہن ہے۔ اس لیے اضافی کپڑا بھی لایا ہوں جس کا ڈھاننا باندھا جائے گا۔ یہ باریک باریک تاروں سے بنا کپڑا جیہن ضرور پیدا کرتا ہے مگر زندگی کو محفوظ رکھتا ہے۔“

”اس کپڑے کے ذریعے ہم گولیوں سے تو محفوظ رہو جائیں گے لیکن الیکٹرک شارٹ سے کیسے بچیں گے؟“ عبد اللہ نے پوچھا۔

”الیکٹریکل شارٹ کا پتہ لگانا تو معمولی بات ہے۔ ہائی وولٹیج سرکٹ پر کام کرنے والوں کی یہ عینک لے کر آیا ہوں اسے لگا کر دیکھو۔“ کہہ کر میں نے بریف کیس سے گول شیشوں والا کور لگا گولس نکال کر اسے دیا پھر الیکٹرک وائر کو سرکٹ میں لگا کر سیٹ آبن کیا اور بولا۔ ”خالی آنکھ سے کچھ نظر نہیں آئے گا مگر گولس لگا کر دیکھو۔“ سفیر اور وسیم نے گولس لگایا اور چیخ کر بولے۔ ”واہ اس چشمے کی وجہ سے ننگا تار سرخ انگارے سے بھرا دکھائی دے رہا ہے۔“

”ذرا میں بھی دیکھوں۔“ عبد اللہ نے کہا۔

سفیر نے عینک بڑھادی۔ عبد اللہ نے عینک سے ننگے تار کو دیکھا پھر اسے اتار کر تعریفی لہجے میں بولا۔

”اب مجھے یقین آ گیا ہے ہم مرشد کو گردن سے پکڑ کر باہر کھینچ لائیں گے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا ہم کامیاب ہو جائیں گے؟“ میں نے سفیر سے پوچھا۔

”کامیاب، میرا تو خیال ہے کہ ایک پرسنٹ بھی ناکامی کا سوال نہیں ہے۔“

”نہیں کامیابی اور ناکامی کا فنی فنی چانس ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں دونوں باتوں کا برابر کا چانس ہے۔“ وسیم نے تائید کی۔

”اگر ہم میں سے کوئی مر گیا تو.....؟“ عبد اللہ نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اس جنگ میں اگر میں مارا گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ عبد اللہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اگر آپ مر گئے تو ہم پر بہت فرق پڑے گا۔ ہم سب آپ کی طاقت پر کھیل رہے ہیں۔ آپ کے بعد میں اکیلا رہ جاؤں گا اور مرشد پوری قوت سے مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔“

کافی دیر تک میں خاموش رہا۔ سر جھکا کر سوچتا رہا پھر گردن نیچی کر کے بولا۔ ”تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔“

پھر میں نے سفیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اگر میں مر گیا تو میرے مشن کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہوگی اور تم تمام ساتھی اس کے اشارے پر چلو گے جو میری حیثیت ہے میرے بعد وہی حیثیت اس کی ہوگی۔ میرے بعد اگر یہ مشن مکمل کرنے سے گریز کرے پھر بھی اس کا ساتھ دو گے۔“

سب نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آج رات ہم پوری تیاری کے ساتھ مرشد کی قلعہ نما خانقاہ میں گھس جائیں گے۔“ میں نے کہا اور ان سب کے چہروں پر نظر ڈالی ہر ایک کے چہرے پر جوش تھا۔



رات کے دس بج رہے تھے مرشد کی قلعہ نما خانقاہ سے سوگڑ کی دوری پر میرے ساتھ، سفیر، اور مرتجس کھڑے تھے۔ دیگر ساتھیوں کو ہم نے دوسری طرف بھیج دیا تھا۔ میری آنکھیں لوہے کے بڑے سے گیٹ پر انکی ہوئی تھیں۔ اس سلاخوں والے گیٹ کے اندر کا منظر بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ کئی پہریدار ادھر سے ادھر گشت کیے جا رہے تھے۔ سب کے سب مسلح تھے۔ شاید اتنی مستعدی خانقاہ کی تباہی کے بعد کا نتیجہ تھی۔ میں نے مڑ کر اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ عبداللہ کے علاوہ سب نے بلٹ پروف لباس پہن رکھے تھے۔ چہرے بھی پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ بلٹ پروف کپڑوں سے انہوں نے اس طرح چہرے اور سر کو ڈھانپ رکھا تھا کہ ایک انچ جگہ بھی خالی نہ تھی۔ دیکھنے کے لیے انہوں نے تھوڑی تھوڑی جگہ چھوڑی تھی چہرے کو کور کرنے کے لیے آڑی پٹی کی طرح اوپر سے بھی کپڑے لپیٹے تھے۔ اگر وہ کپڑا عام قینچی سے کٹ سکتا تو وہ نقاب بنا لیتے مگر باریک تاروں سے بنا کپڑا جس پر کیمکل کی تھیں جمی ہوئی تھیں اتنا مضبوط تھا کہ اس پر قینچی چل ہی نہیں سکتی تھی اور الیکٹرانک کٹر ہمارے پاس تھا نہیں کہ ہم اسے استعمال کر کے نقاب بناتے۔ میں نے باریک بینی سے ان سب کا جائزہ لیا پھر عبداللہ سے کہا۔ ”تم باہر رہ کر ہم پر نظر رکھنا۔“

یوں بھی بلٹ پروف کپڑے صرف تین کے جسم پر تھے۔ سفیر، مرتجس اور میرے۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ”سامنے سے اندر داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے اس لیے ہمیں عقبی حصے کی طرف سے کوشش کرنا ہوگا۔ ادھر ایک درخت ہے اس کے ذریعے ہم سرونٹ کو ارٹھر کی چھت پر اتریں گے پھر وہاں سے سیدھے برآمدے کی طرف۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ کہہ کر سفیر اور مرتجس عقبی سمت بڑھتے چلے گئے۔

”اس خیال میں نہ رہنا کہ ادھر سے ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے یقیناً خفیہ کیمرہ ہمیں دیکھ لے گا وہ راستہ ہم نے صرف اس لیے منتخب کیا ہے کہ مزاحمت کا سامنا کچھ دیر میں ہوگا۔“ کہہ کر میں نے بھی قدم بڑھا دیا۔

ہم سب اس بیڑ پر چڑھ کر سرونٹ کو ارٹھر کی چھت پر اترنا ہی چاہتے تھے کہ میری نظر چھت پر پڑی اور میں نے سب کو روک دیا، اگر ہماری آنکھوں پر خاص قسم کے چشمے نہ ہوتے تو حادثہ یقینی تھا۔ چھت پر باریک سے تین تار ایک فٹ کی بلندی سے گزر رہے تھے۔ تاریں اتنی باریک تھیں کہ ایک نظر میں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ چشمے کی وجہ سے ہمیں ان میں دوڑتی بجلی نظر آ گئی تھی۔ اندھیرے میں وہ تاریں انگاروں سی دکھتی نظر آ رہی تھیں۔

”ان سے بچ کر۔“ میں نے دلی دلی آواز میں کہا۔

میرے کہنے پر سب ہوشیار ہو گئے۔ نہایت احتیاط کے ساتھ ان تاروں کو پھلانگ کر ہم چھت کے درمیان میں پہنچے۔ سب کے پیروں میں نفیس قسم کے لونگ بوٹ تھے بالکل ایسے جنہیں ”برساتی جوتے“ بھی کہا جاتا ہے۔ ربر کے جوتے جو الیکٹرک شاک سے تو محفوظ رکھتے ہی ہیں آواز بھی پیدا نہیں کرتے۔ اسی لیے میں نے اس قسم کے جوتوں کو ترجیح دی تھی۔ یکے بعد دیگرے ہم چھت سے لٹک کر نیچے اترے۔

ابھی ہم نے نیچے قدم رکھے ہی تھے کہ ہمارے استقبال میں پہریداروں کی گنز گرج اٹھیں۔ دھائیں

دھائیں کرتی ہوئی گولیاں ہمارے جسم سے ٹکرائیں اور ہمیں اس جدید بلٹ پروف کپڑوں کی اہمیت سے آگاہ کر گئیں۔ گولیوں کے ٹکرانے سے ہمیں خاصی چوٹ لگی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے غلیل سے کسی نے پتھر مارا ہو۔
”رکنا نہیں دوڑتے چلو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

ہم دوڑتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھے۔ اس درمیان میں کئی گارڈز رائفلیں تانے آگے آئے جنہیں ہمارے پستولوں سے نکلی ہوئی گولیوں نے روک دیا۔ کتنے زخمی ہوئے کتنے مرے یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے برآمدے میں پہنچ گئے۔ پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

ہمارا پیچھا کرنے والے بھی برآمدے تک آئے لیکن وہ سب کے سب وہیں رک گئے۔ مجھے یاد آیا کہ مرشد کا حکم تھا کہ کسی بھی حالت میں باہر کے گارڈز اندر نہ آئیں۔ اندر کی حفاظت کے لیے دوسرے گارڈز ہوں گے۔

کئی لمحے اسی طرح گزر گئے۔ ہم سب کھڑے لمبی لمبی سانسیں لیتے رہے۔ سفیر نے اپنے دونوں ریوالوروں کو پھر سے لوڈ کیا۔ مرتجس نے بھی اپنی اسٹین گن کا جیمبر بدلا۔ میں نے سب سے کم گولیاں چلائی تھیں پھر بھی خالی خانوں کو بھریا۔ اب ہم آگے بڑھنے کو تیار تھے۔

”مرشد اور اس کے گارڈز ہمیں اسکرین پر دیکھ رہے ہوں گے۔“ سفیر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”سنجھل کر بولنا ہماری زبان سے نکلا ایک ایک لفظ خفیہ مائکروفون کے ذریعہ کنٹرول روم میں پہنچ رہا ہوگا۔“

بات اس کی صحیح تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی اور تیکھی نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ہم پچاس فٹ لمبی راہداری میں کھڑے تھے۔ راہداری کے آخری سرے پر دائیں اور بائیں جانے کے راستے تھے۔ اس کے علاوہ خاموش دیواریں تھیں۔ کمروں کا دروازہ ابھی نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ دوسری طرف ہو۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ سفیر نے کہا:

”لگتا ہے وہ لوگ ابھی اسی فکر میں ہوں گے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہے ورنہ اسکرین پر تو ہم انہیں نظر ہی آرہے ہوں گے۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ ابھی وہ ہمارے اگلے قدم کے منتظر ہیں۔“ میں نے کہا میری نظریں ایک ایک گوشے کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ایسی کون سی جگہ ہے جہاں کیمرافٹ ہے مگر مجھے ابھی تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی تھی۔

”وقت برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آگے بڑھیں۔“ سفیر نے کہا۔

تب ہی میری نظر دائی جانب کی دیوار پر پڑی اور میں نے کہا۔ ”ہوشیار کرنٹ آن ہو چکا ہے۔“
دیوار پر لگے ٹائلز کے جوڑوں میں باریک باریک تاریں گزر رہی تھیں جو عینک کی وجہ سے سرخ نظر آرہی تھیں۔ ایسا ہی کچھ فرش کے ٹائلز میں بھی نظر آیا۔

”نہایت احتیاط سے بیجوں پر وزن ڈال کر آگے بڑھو۔ ذرا سی بے احتیاطی خاک کر دے گی۔ میرا خیال ہے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ گزر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

ہم سب نہایت ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ایک کے بعد ایک ٹائلز پر پیر رکھتے ہوئے چیونٹی

کی رفتار سے ہم سب آگے بڑھ رہے تھے۔ بالآخر کوریڈور کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ ہم مرنے ہی والے تھے کہ نہایت تیز آواز میں دیوار کے اندر فٹ مائیک سے آواز ابھری۔ ”ہلاؤ و سہلاؤ مرحبا شہباز میرے دشمن نمبر ایک۔ تم کیا سمجھ رہے ہو میں نے تمہیں پہچانا نہیں ہے؟ یہ سچ ہے کہ اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا اس لیے اس دھوکے میں رہا کہ تم ان کے ساتھ نہیں ہو مگر جیسے ہی تم سرونٹ کوارٹر کی چھت پر چڑھے میں نے تمہیں پہچان لیا۔ ویسے فکر کی بات نہیں میں اپنے دشمنوں کو سسکا سسکا کر مارنے میں ثانی نہیں رکھتا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے میرے داہنے ہاتھ امداد شاہ کو گلگت میں بہت اذیت دی ہے میں بھی وہ قرض اتارنا چاہتا ہوں۔“ بولتے بولتے وہ رک گیا۔ کوریڈور میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جو دل میں خوف پیدا کر دے۔ ہم سب ہم تن گوش تھے کہ وہی آواز پھر سنائی دی۔ ”تم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے جس مقام تک پہنچنے کے لیے میں نے ایک عرصہ گزارا اسے تم نے کچھ گھنٹوں میں ختم کر دیا تھا۔ میری کمر توڑنے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ مجھے معذور بنانے کے لیے میرے اہم بندوں کو تم نے ختم کر دیا۔ تم نے مجھے کروڑوں کا نقصان پہنچایا ہے۔ میں تمہارا ریشہ ریشہ الگ کروں گا۔ تمہارے ساتھیوں کو تمہاری نظروں کے سامنے اذیت دے دے کر ہلاک کروں گا۔ تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی میرا نام سن کر کانپ اٹھیں گی لیکن ابھی نہیں ابھی تو میں تمہاری مہمانداری کروں گا۔ جس طرح بلی چوہے کو مارنے سے پہلے اسے بھاگنے دوڑنے کا بھرپور موقع فراہم کرتی ہے اسی طرح میں تمہیں خوب موقع دوں گا۔ تم نے دلدل میں پیر رکھ تو دیا ہی ہے اب اپنے ذوبے کا بھی مزہ لو۔ اب یہ پہلے والی خانقاہ نہیں ہے۔ ہر راہداری ہر کمر ایک پھندا ہے۔“

”میں نے پہلے بھی کہا تھا اور پھر کہہ رہا ہوں کہ برائی خواہ کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو! چھائی سے شکست کھانا اس کا مقدر ہے۔ تم پوری کوشش کر لو مگر میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”ہاں میں تمہیں تباہ ضرور کر دوں گا۔۔۔۔۔ اور اس بار ادھورا کام نہیں کروں گا۔“

”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ ویسے تم لوگوں کا یہاں آنا مجھے راحت بخشنے کا سبب بن رہا ہے۔ ورنہ نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی پڑتی آخر کو بدلہ لینا بھی ضروری ہے ناں۔“

”چلو بھئی آگے بڑھو، اسے ہمارا انتظار ہے۔ کیوں بے چارے کو انتظار کی سولی پر لٹکائے ہوئے ہو۔“

وسیم نے کہا۔

”اسے انتظار ہے مگر ہمیں نہیں۔“ کہہ کر میں نے جیب سے سگریٹ نکالی اور اسے سلا کر گہرا کش لیا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ”آپ سب نہایت احتیاط سے آگے بڑھیں۔“

مرتب جس مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا اس لیے کہ اس نے اس سے پہلے مجھے سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن سفیر سمجھ گیا تھا کہ میں کوئی چال چلنے والا ہوں۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں نے جو عینک لگا رکھی ہے یہ اسی کا کمال ہے کہ تمہیں وہ تمام تاریں نظر آرہی ہیں جن میں کرنٹ ہے۔ خدا نا بود کر دے۔ فیض خان کو جوان عینکوں کو بیچ رہا ہے۔“

ہم میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ ہماری خاموشی پر اس نے پھر کہا۔ ”کیا بات ہے میرے قابل احترام مہمانو، ہم سے ناراض ہیں کیا؟ کوئی بھی بولنے پر رضامند نہیں ہے۔ کیا چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے ہو۔“

مرشد کی آواز میں اس کی ہنسی بھی شامل تھی۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مرشد ہمیں بولنے پر اکسارہا ہے۔ شاید آواز سے ہماری موجودگی کے مقام کا صحیح اندازہ لگانا چاہ رہا ہو۔ اس لیے بھی ہم خاموش تھے کہ عقب سے آواز آئی۔

”دائیں مڑیں یا بائیں؟“ مرتجس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

”بائیں۔“ میں نے دونوں اطراف کا جائزہ لے کر سرگوشی میں کہا۔

سفیر اسی طرف مڑ گیا۔ اس کے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے مرتجس۔

”صحیح راستے پر مڑے ہو۔“ مرشد کی کھٹکتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔ ”اگر دائیں جانب مڑتے تو میں خود

تمہیں آواز دے کر روک لیتا۔ تم لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہو اور داہنی راہداری پھر تمہیں باہر کی کھلی فضا میں پہنچا دیتی۔ میں بائیں جانب ہوں۔ آگے بڑھتے رہو۔“

”کذاب کی اولاد بھونکے ہی جا رہا ہے چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔“ سفیر بڑبڑانے کے انداز میں

بول۔

ہم سب آگے بڑھتے رہے۔ سب کے قدم پنے تلے اٹھ رہے تھے۔ کچھ دور جاتے ہی ہم ٹھنک گئے۔

آگے کرنت کا جال سا پھیلا ہوا تھا، تقریباً چھ فٹ لمبائی میں۔ پورا کارڈور گھرا ہوا تھا۔ اس طرح سے تاروں کو

بچھایا گیا تھا کہ ان کی درمیانی جگہ میں ایڑی تک نہ رکھی جاسکے۔ آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب کیا کیا جائے۔

ہم کھڑے ہو کر یہی سوچنے لگے۔ ہر چہرے پر بس یہی ایک سوال تھا۔

”تم جو اس مردوں کے لیے لانگ جمپ لگانا کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں ہے۔“ مرشد نے زہر خند لہجے میں

کہا۔ ”اس کھیل میں اب مجھے بھی مزہ آنے لگا ہے۔“

میری نگاہیں مرتجس کی جانب اٹھ گئیں۔

”چھ فٹ لمبی چھلانگ لگانا ناممکن تو نہیں ہے۔“ مرتجس نے چشمے سے چمکتے ہوئے جال پر نظریں

دوڑاتے ہوئے کہا۔

”پہلے میں پار کرتا ہوں“ میں نے مرتجس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بعد میں اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم سنبھال

لیں گے۔“

میں نے اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگائی۔ وہ چھ فٹ کی دوری جیسے سمٹ گئی۔ ایک اسپورٹس مین کے لیے

یہ دوری تو بہت عام سی بات ہے۔ میں نے تو دس فٹ کی لانگ جمپ لگائی ہے۔ میں نے دوسری جانب پہنچ کر

مرتجس کی طرف دیکھا تو اسی بے احتیاطی بڑے حادثے کو جنم دے سکتی تھی، اگر اس کا کپڑا بھی ان تاروں سے

چھو جاتا تو وہ پل بھر میں خاک ہو جاتا۔ چار سو چالیس وولٹ کا یہی تو کمال ہوتا ہے کہ جاندار کو ایک پل

میں کباب بنا دیتا ہے۔ تبھی مرتجس نے چھلانگ لگائی اس نے بھی اس دوری کو پار کر لیا۔ وہ تقریباً سات فٹ کے

فاصلے پر گرا تھا۔

”واہ بہت خوب۔ اس گلگتی میں بھی جان ہے۔“ مرشد کی طنزیہ آواز سنائی دی۔ ”لگتا ہے یہ میرے حضور

پیش ہو کر رہے گا۔“

”یہ ناگہان پر بت کی گود میں پلا بڑھا ہے۔ غور سے دیکھو، تم نے وطن دشمنوں سے ساز باز کی تو تم سے نمٹنے کے لیے میں ہر صوبے کے نمائندہ کو لے کر آیا ہوں۔ اس نے تو تمہارے کئی جانباڑوں کو جہنم کا راستہ بھی دکھایا ہے۔“

”معلوم ہے کتا جب پاگل ہو جائے تو اپنے آقا کو بھی کاٹ لیتا ہے۔ تمہارے ساتھ مجھ سے غداری کرنے والے بھی ہیں جو کبھی ہمارا جھوٹا دکھایا کرتے تھے۔“ مرشد اس بار کھل کر ہنسا۔

”میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ ریاست خان اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہے۔“ کتوں سے بچ کر رہنا کہیں تمہیں کاٹ ہی نہ لیں۔ لیکن تم بچو گے کیسے؟ کیوں کہ تمہارا زرخرہ تو میں خود ادا ہیڑوں گا۔“ مرتجس نے تمللا کر جواب دیا۔

”خوب، تو زبان میں بھی خارش ہونے لگی۔“ مرشد کا لہجہ پھر طنزیہ ہو گیا۔

”بھونک لو، جتنا جی چاہے، بھونک لو پھر موقع نہیں ملے گا۔“ مرتجس نے پھر چوٹ کی۔

”بہت موقع ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟“

بحث کو فضول سمجھ کر ہم نے قدم آگے بڑھادیے۔ فرش اور دیواریں بالکل صاف تھیں۔ لگتا تھا اب آگے کرنٹ کا جال نہیں ہے۔ ہم بے فکر ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ اس کوریڈور کے آخر میں پھر دور استے آگئے تھے۔ دنوں میں قطار سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ اب صبح معنوں میں اس عمارت پر کسی ہوٹل کا گمان ہو رہا تھا۔ تمام کمروں کے دروازے اندر سے بند تھے۔ وہ سب رک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں سوال تھا کہ اب کس طرف مڑنا چاہیے۔ ہم ابھی کھڑے ہو کر راستے کا انتخاب کر ہی رہے تھے کہ مرشد کی آواز سنائی دی۔ ”واپسی کے بارے میں مت سوچنا۔ واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ جن راستوں سے تم لوگ آئے ہو اب وہ اس طرح بند کر دیئے گئے ہیں کہ تم خود بھی پہچان نہیں پاؤ گے کہ یہاں سے گزر رہے تھے۔ سامنے ہی قطار میں کمرے ہیں جس میں دل چاہے داخل ہو جاؤ۔ ہر کمرے میں بیڈ موجود ہے۔ دل بھر کر آرام کرو۔“

”ہم آرام کرنے نہیں تم سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔“

”غصہ نہیں، تم لوگ میرے مہمان ہو اور مہمان کا میزبان کی مرضی پر چلنا فرض ہے۔ ابھی بہت وقت باقی ہے یوں بھی یہ وقت ملاقات کا نہیں آرام کا ہے، جو کچھ کہنا ہے صبح کے لیے بچا کر رکھو، اب صبح ہی ملاقات ہوگی۔“

”ہم صبح نہیں ابھی ملاقات کریں گے۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے اب صبح ہونے میں دیر ہی کتنی ہے پھر مجھے تم لوگوں کی تمللاہٹ سے بھی تو لطف

اندوز ہونا ہے۔“

”ہمیں جلدی ہے ہم فوراً تم تک پہنچنا چاہتے ہیں۔“

”اگر پہنچ سکتے ہو تو پہنچ جاؤ ورنہ آرام کرو۔ آخر ان کمروں کا کچھ تو مصرف نکلے۔ تمہاری بوٹیاں کرنے

سے پہلے میں تمہیں آرام دینا چاہتا ہوں۔ آخر کو قریبانی کے جانوروں کو کھلا پلا کر مونا تازہ بھی کرنا چاہیے نا، اسی لیے کہہ رہا ہوں آرام کر لو، اچھا شب بخیر صبح ملاقات ہوگی۔“

آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ اب اتنی خاموشی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو ہم کا دھماکا محسوس ہوتی۔ اس خاموش ماحول میں ہم ایک دوسرے کی سانسون کی آواز بھی صاف سن رہے تھے۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ سفیر نے پوچھا۔

”ایک اینٹ پر دوسری رکھ دو یو آر کھڑی ہو جائے گی۔ اس معقولے پر عمل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں گے۔ ایک ایک کمرے کی تلاشی لیں کسی میں تو وہ ملے گا۔“ میں نے کہا۔

میرا حکم پاتے ہی سب اسے ڈھونڈنے کی جستجو میں لگ گئے۔ ایک کے بعد ایک کمروں کو کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔ سفیر کمروں کو گنتا جا رہا تھا۔ دراصل ہم یہی چاہتے تھے کہ ایک کمر بھی نہ بچے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا لیکن کمروں کی تعداد کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نچلی منزل کے بعد ہم اوپر کی منزل پر آئے پھر تیسری منزل کے کمروں کو بھی دیکھ لیا۔ اب ہم اسی منزل پر کھڑے تھے جو ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ تعمیر جاری تھی۔ پلاسٹر مکمل نہیں ہوا تھا۔ دروازے کھڑکیاں بھی نہیں لگیں تھیں۔ اتنے کم وقت میں ایسی شاندار عمارت بنالینا بھی کمال تھا۔ لیکن ہم اس نکتے پر غور کرنے تو آئے نہیں تھے۔ اس لیے تلاشی کا کام جاری رکھا۔ اس منزل کے آخری کمرے کی تلاشی لینے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”سفیر تم نے اچھی طرح گنا ہے ناں کہ یہ چالیسواں کمر ہے۔“

سفیر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”گنتی میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے یہ واقعی چالیسواں کمر ہے۔ اس آخری کمرے کے بعد اب ایک کمر بھی کمر نہیں بچتا۔“

”اگر تمہاری گنتی درست ہے تو میرا خیال ہے کہ مرشد نے کچھ اور نئے کمرے بھی بنوائے ہیں۔“

”تمہارا خیال درست ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس عمارت کے اندر بہت سی تبدیلیاں کروائی ہیں لیکن تبدیلی کی نوعیت کیا ہے یہ کسی کو نہیں پتا۔ کہتے ہیں کہ اس نے جن مزدوروں سے کام کروایا تھا انہیں پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ سننے میں آتا ہے کہ انہیں مرشد نے قتل کروا دیا ہے تاکہ اندرونی راز کوئی نہ جان سکے۔“ مرتجس نے کہا۔ ”میرے دوست نے بتایا ہے کہ اندر جن لوگوں کی ڈیوٹی لگی تھی وہ بھی غائب ہو گئے۔“

”مجھے یاد آ گیا اس نے ایک اضافی جنریٹر روم بھی تو بنوایا ہے جو انڈر گراؤنڈ ہے یقیناً اس وقت وہ کسی تہہ خانے میں ہے تبھی تو اب تک نظر نہیں آیا۔ اب ہمیں تہ خانے کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔“ میری آواز اب بھی سرگوشی سے بلند نہ تھی۔

”تو آؤ ہم سب نیچے چلتے ہیں لیکن لفٹ کا استعمال اب بھی نہیں کریں گے یقیناً وہ ہمیں اسکرین پر دیکھ رہا ہوگا۔ ہماری آواز بھی سن رہا ہوگا۔ ہم لفٹ میں داخل ہو کر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبائیں اور وہ بجلی آف کر دے اس طرح تو ہم جو ہے دان میں پھنس جائیں گے۔“ سفیر بولا۔

ہم سب سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگے اب ہم نچلی منزل کے کمروں کا معائنہ پھر سے کر رہے تھے۔ اس بار ہم اس زاویے سے دیکھ رہے تھے کہ شاید کہیں ایسا نشان مل جائے جس سے ثابت ہو کہ وہاں تہ خانہ بھی ہے۔ کافی دیر کی تلاش نے بھی ہمیں امید کی کرن نہ دکھائی۔ اب مجھے بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔ تھکن بھی بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ”میرا خیال ہے کہ اس تلاش کو ادھورا ہی چھوڑ دیا جائے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”کیوں؟ واپس چلنے کا ارادہ ہے کیا؟“ سفیر نے پوچھا۔

”شاید تم کو اندازہ نہیں کہ اب واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ مرشد نے گارڈز کو خصوصی ہدایات جاری نہیں کی ہوں گی؟ اب تک گارڈز کی تعداد بھی بڑھا دی گئی ہوگی۔ گارڈز خود بھی پوری ہوشیاری کے ساتھ پہرے پر بیٹھے ہوں گے۔ سب کی گنز کا رخ دروازے کی سمت ہوگا۔ جیسے ہی ہم باہر نکلیں گے وہ سب ٹوٹ پڑیں گے۔ اب بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مرشد پر قابو پالیں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”پھر کیا کریں؟“ مرتجس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہم اس وقت میدان جنگ میں ہیں عقل مند دشمن مقابل کو تھکا دینے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ تھکا ہوا دشمن ترنوالہ ہوتا ہے۔ عقلندی کا تقاضہ ہے کہ ہم خود کو تازہ دم رکھیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تازہ دم رہنے کے لیے نیند ضروری ہے ایسا کرتے ہیں کہ ہم اوپر کے کمروں میں سے ایک کا انتخاب کر کے کچھ دیر سو لیتے ہیں۔“

”سویا ہوا انسان مردے کے برابر ہوتا ہے۔“ سفیر نے ہنس کر کہا۔

”ہم سب سوئیں گے مگر قسطوں میں۔ دو آدمی سوئیں گے اور ایک آدمی پہرہ دے گا۔ دو تین گھنٹے بعد اٹھا دے گا تب جاگنے والا نیند پوری کرے گا۔“

”ٹھیک ہے، چلو اوپر چل کر اسی کمرے میں سو جاتے ہیں جو سجا ہوا ہے۔ وہاں ایک بیڈ ہے اس پر دو آدمی سو سکتے ہیں۔“ سفیر نے کہا۔

ہم تینوں پھر سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اوپر لائن سے بنے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم آخر والے کمرے کے سامنے پہنچے۔

”ہاں یہی ایک ایسا کمرہ ہے جس میں رات گزاری جاسکتی ہے۔ سیڑھیوں سے دور ہے۔ اس لیے اوپر آنے والے کو ہم پہلے ہی دیکھ لیں گے۔“ سفیر نے کہا۔

ہم سب اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ نیند لینے سے پہلے جاگنا آسان ہے لیکن آدمی نیند کے بعد پہرا دینا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں نے کہا۔ ”پہلے میں اور سفیر سو لیتے ہیں۔ دو گھنٹے بعد مرتجس ہمیں اٹھا دے گا۔“

”ہاں یہ صحیح ہے۔“ کہہ کر سفیر نے کندھے سے لٹکی کلاشکوف کو بستر پر پھینکا اور لیٹ گیا۔

”آپ کے انداز سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم یہاں پکنک منانے آئے ہیں۔“ مرتجس نے ہنس کر کہا۔

”ہم سب قسمت کے محتاج ہیں۔ قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا تو پھر ہم کیوں پریشان ہو کر انرجی برباد کریں۔ سوچنے، راہ تلاش کرنے کے لیے شہباز ہے اس لیے ہم بے فکر ہو جاتے ہیں۔“ کہہ کر سفیر نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں لا تعلق سا بنا لیتا تھا۔ کہتے ہیں نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ وہی میرے ساتھ ہوا۔ میں بے خود ہو گیا۔

ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ فائر کی آواز سنائی دی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”مرتجس کہاں گیا؟“ سفیر کے ہونٹوں سے حیرانی بھری آواز نکلی۔

میں پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ گن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ میری آنکھیں سرچ لائٹ کی طرح گھوم رہی تھیں۔ میری نظروں کے سامنے تین راستے تھے۔ ایک بالکل

سامنے دوسرا دائیں اور تیسرا بائیں طرف جا رہا تھا۔ ہر سینکڑ میں تینوں راستوں پر میری نظریں جارہی تھیں۔ کمانٹ اسی طرح گزر گئے۔

”گولی کس نے چلائی، کسے لگی؟“ سفیر بولا۔

مرتبجس یوں اچانک غائب ہو گیا تھا اس وجہ سے سب پریشان ہوا تھا تھا۔ وہ اتنا تو غیر ذمہ دار نہ تھا کہ ہمیں سوتا چھوڑ کر کہیں چلا جاتا۔ اسے کوئی زبردستی لے گیا ہو یہ اتنا آسان بھی نہ تھا۔

”بولتے کیوں نہیں، گولی کسے لگی؟ کہاں چلی؟“ سفیر نے اپنا سوال دہرایا۔

”گولی یہاں نہیں چلی ہے کہیں دور سے آواز آئی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ سفیر کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”گولی کہیں دور چلی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہاں بارود کی بو نہیں ہے۔ اگر کہیں قریب میں گولی چلتی تو بارود کی بو فضا میں تیرتی ضرور محسوس ہوتی۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں ہم تھک کر پورے تھے اسی لیے نیند بھی گہری آئی تھی۔ نیند کی حالت میں آواز سنی تھی اسی لیے صحیح اندازہ نہیں ہو سکا ہے۔“

میں نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجے تھے ہم نے تین گھنٹے لمبی نیند کا مزہ لیا تھا۔

”کچھ تو منہ سے پھوٹو یہ کیا ہوا ہے؟“

”مرتبجس پر قابو پانا آسان نہیں ہے یہ جو کچھ ہوا برا ہوا ہے کیونکہ فائر کی آواز کے ساتھ مرتبجس یہاں۔ غائب ہے۔“ کچھ دیر تو وقف کے بعد میں نے کہا۔ ”مرتبجس کے سلسلے میں ہمیں کچھ نہیں کرنا ہے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ہمیں صرف اپنے لیے کرنا ہے اپنے لیے۔“

”بڑے مطلبی ہو، وہ مصیبت میں ہے اور تم.....“ سفیر نے جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ مرتبجس کے ساتھ کیا ہوا“ وقت وہ کس حالت میں اور کہاں پر ہے۔ اسے تلاش کرنا مشکل ہے جب کہ ہمیں اپنی جان کو بھی محفوظ رکھنا ہے اسے تلاش کرنے کے چکر میں وقت برباد کرنا بیکار ہے پھر اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالیں؟“

سفیر کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ میری باتوں سے متفق نہیں ہے۔ لیکن جواب میں اس نے کچھ نہیں اور خاموشی سے کھڑا رہا جیسی دیواروں میں چپے ہوئے کئی مائیک ایک ساتھ چیخ پڑے۔ ”صبح بخیر میرے عزیمہانوں کو میرا سلام پہنچے امید ہے میرے مہمانوں کو بہت گہری نیند آئی ہوگی۔“

سفیر کے جڑے بھنچ گئے غصے کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی اس نے نہایت تیز لہجے میں پوچھا۔ ”مرتبجس کہاں ہے؟“

”وہ کمروں کے جال میں الجھا ہوا بھٹک رہا ہے بے چارہ۔“

”گولی کس نے چلائی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”مرتبجس نے، ہم اپنے مہمانوں کی گولیوں سے میزبانی نہیں کرتے۔“ آواز میں ہنسی کی جھلک تھی

”آپ لوگوں کو بھوک لگی ہوگی۔ واپس پلٹنے اگلے کورڈور میں ٹرائی آپ کی منتظر ہے جائیے۔“

میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔ ”تم سامنے کیوں نہیں آتے؟“

”ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے میرے بلاوے پر آتے تو بات کچھ اور تھی، باتیں تو ہو ہی جائیں گی ضرورت سمجھوں گا تو بلا لوں گا۔“

”کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس سے پہلے ہی اس تہہ خانے کو ڈھونڈ لیں جہاں تمہارا کنٹرول روم ہے اور تم خود چھپے ہوئے ہو۔“

”کوشش کر کے دیکھ لو، اگر تم نے نہ خانہ ڈھونڈ لیا تو مرشد تمہارا غلام ہو جائے گا۔ جاؤ ناشتا کر لو، کھاپی کر تلاش کرنا بھوکے پیٹ سے اچھا ہے ورنہ تو دل ہی نہیں لگے گا۔“

میں نے کچھ کہنے کے بجائے کوریڈور کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ سفیر بھی میرے ساتھ تھا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ مرتجس کہاں ہے؟“ میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

”میں نے بتایا تو تھا کہ وہ ایک کوریڈور سے دوسرے کوریڈور کی طرف بھاگ رہا ہے۔ وہ بھٹک کر گیا ہے

اسے بلانا چاہتے ہو تو آوازیں دو، وہ آواز کے سہارے چلا آئے گا۔“ خفیہ مائیک سے مرشد کی آواز آئی۔

باتوں کے درمیان ہم برابر والے کوریڈور میں پہنچ گئے وہ کوریڈور بھی سیڑھیوں کے سیدھ والے کوریڈور

جیسا تھا۔ اس کوریڈور کے بھی دونوں طرف کمرے تھے۔ وہاں ٹرائی موجود تھی ٹرائی پر ناشتے کی پلیٹیں سجی ہوئی

تھیں۔ سفیر جلدی سے آگے بڑھا مگر نزدیک پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔

”اس میں زہر بھی ہو سکتا ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”نہیں فکر نہ کرو اس میں زہر نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر مرشد ہمیں ختم کرنا چاہتا تو کب کا ختم کر چکا

ہوتا۔ وہ مزہ لے رہا ہے، ہماری بے بسی کا لطف لے رہا ہے۔“

”شہباز صحیح کہہ رہا ہے۔“ خفیہ مائیک سے آواز آئی۔

میں بھی ٹرائی کے نزدیک پہنچ گیا تبھی میری نظر سامنے کی دیوار پر پڑی۔ میں نے کہا۔ ”گولی اسی کمرے

میں چلی ہے گولی کا نشان سامنے والی دیوار پر صاف نظر آ رہا ہے۔“

”ہاں، اسی لیے بارود کی بو اس کوریڈور تک نہیں پہنچی۔“ سفیر نے گولی کے نشان پر انگلی پھیر کر کہا۔

”اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ مرشد کا نوکر ٹرائی دھکیلتے ہوئے یہاں پہنچا، اس پر مرتجس کی نظر پڑ

گئی۔ مرتجس نے اسے گھیرنے کی کوشش کی وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا مرتجس بھی اس کے پیچھے دوڑا اور

کوریڈور کے جال میں پھنس گیا۔“

”اب کیا کریں؟“ وسیم نے پوچھا۔

”اسے تلاش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے آواز کو قید نہیں کیا جاسکتا اگر مرشد کی بات سچ ہے تو مرتجس

یہیں کہیں بھگ رہا ہے۔ ایسا کرو کہ اسے آواز دو۔“

سفیر نے زور سے پکارا۔ ”مرتجس“ اس کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی بازگشت بھی سنائی دی لیکن کوئی

جواب نہیں آیا۔

ایمان کی دہائی دیتے رہو میں دولت کی چمک پکھا کر سب کو توڑ لوں گا۔ اب اس ملک پر میری حکومت ہوگی میرے دوستوں نے مجھے بھرپور مدد دینے کی یقین دہانی کرادی ہے۔“

”جو صاحب ایمان ہوتے ہیں وہ دنیاوی چمک کو ٹھوکر ماردیتے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو تمہیں لاتعداد اہل مثالیں ملیں گی۔ رہ گیا اس ملک پر حکومت کرنا..... تو یہ ملک عوام کا ہے اور اس پر صرف محبت وطن کا حق ہے۔ کتنے لوگ آئے اور چلے گئے۔ ہزاروں سازشیں ہوئیں لیکن کامیابی کسی کو نہیں ملی۔ تمہیں بھی اقتدار نہیں ملے گا۔“

”وقت پر وہ بھی دیکھ لیں گے، تم نے تو میری خانقاہ کو تباہ کر کے سمجھ لیا تھا کہ میں ٹوٹ گیا ہوں۔ میرے بندوں کو ختم کر کے تم نے سمجھ لیا تھا کہ میرا مورال کم ہو جائے گا۔ بے وقوف آدمی یہ میرے بندے تو میرے۔ تن ڈھانپنے کے کپڑے ہیں۔ پھٹ گئے تو پھینک دیئے۔ دودن میں سب پہلے جیسا کر لیا۔ تمہاری اچھی حرکت سے مرشد کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اب جا کر ہتھے چڑھے ہو۔ میں ایک ایک بات کا بدلہ لوں گا۔“

”غلط تمہارے ہتھے چڑھانہیں، خود آیا ہوں۔ تمہارے بل سے تمہیں کھینچ کر باہر نکالنے کے لیے آیا ہوں۔“ یہ چوہے کا بل نہیں شیر کی کچھار ہے۔“ مرشد کی ہنسی میں موت کی چاپ تھی۔ عجیب سی کھرکراتی تھی۔ ”اس حد تک بے وقوفی کی بات کرو گے مجھے معلوم نہ تھا۔ شہباز، کسی چھوٹے سے بچے کو شیر کے سامنے بٹھ جائے تو وہ خوش ہوگا۔ قہقہے لگائے گا۔ اس سے کھیلنے کی کوشش کرے گا کیونکہ اس بچے کو کیا معلوم کہ شیر کی دہشت ہوتی ہے۔ بچے میں سمجھداری نہیں ہوتی اس لیے وہ شیر سے نہیں ڈرتا، سمجھدار انسان کو معلوم ہے کہ شیر شیر ہوتا ہے۔ اس کے قریب نہیں جانا چاہیے، اگر گیا تو وہ اسے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ تم بھی اس نا سمجھ بچے کی طرح ہو جسے نہیں کہ شیر کا خوف کیا ہوتا ہے۔ ایسی بے وقوفی کرنے والے کی تعریف نہیں کرنا چاہیے۔ سمجھے۔“

”تم اور شیر“ میں نے قہقہہ لگایا۔ ”شیر کبھی دم دبا کر گیدڑ کی طرح دیکتا نہیں ہے بلکہ دھاڑتا ہوا باہر آتا ہے۔ تم ایسے گیدڑ ہو جسے غلطی سے شیر کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے اور تم خوش ہو رہے ہو، ہمت۔ سامنے آ کر دکھاؤ۔“

”ٹھیک ہے اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں خود کو گیدڑ اور تمہیں شیر مان لیتا ہوں۔“

”مرتب جس پر سے یہ پنجرہ کب ہٹے گا۔“

”یہ موت کا پنجرہ ہے اور جان لے کر ہی ہٹے گا۔ یہ مر چکا ہے۔ اس کی قسمت میں موت لکھ دی ہے۔“ مرشد کی آواز میں خونخواری بھری تھی۔ ”موت تو اسی دن تم سب کا مقدر بن گئی تھی جس دن تم لوگوں دوبارہ سے خانقاہ میں آنے کا پلان بنایا تھا۔ اب موت کو اتنے قریب پا کر تمہارے ہوش کیوں اڑ گئے۔ کیا آ سے پہلے تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں جا رہے ہو۔“

”ہمیں معلوم تھا۔“ اس بار میں نے سیاست بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ”اچھی طرح جانتے تھے کہ موت کے منہ میں سر دینے جا رہے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری حالت ایسی ہو جائے گی۔ ہم بھ بھیلوں میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ ہم تم سے ملنے آئے تھے، تمہیں بہادری کے ساتھ سامنے آنا چاہیے تھا ا بزدلی کا تو ہمارے ذہن میں شائبہ تک نہ تھا کہ تم پھندہ لگائے بیٹھے ہو گے اور ہم اس دام میں پھنس جائیں گے جو کام بغیر سامنے آئے ہو جائے وہی اچھا ہے، اسے بزدلی نہیں سیاست کہتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے

تم بہادر ہو۔ مجھے تم سے دشمنی مول نہیں لینی چاہیے تھی۔ اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو ہم ”اس ملک“ کے مالک ہوتے مگر اب تو یہ پرانی بات ہو گئی ہے دشمنی کا فیتہ جل چکا ہے بغیر دھماکے کیسے خاموش ہوگا؟ مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا کہ تم جیسے بہادر انسان کا مجھے ساتھ نہ مل سکا۔ تمہیں جس مقصد سے ساتھ ملانا چاہتا تھا وہ بھی فوت ہو چکا ہے اب تو موت ہی تمہارا مقدر ہے۔ صبح کا سورج دیکھے گا کہ تمہارے ایسے بہادر آدمی کی لاش چوراہے پر پڑی ہے تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ ہم سے نکرانے والوں کا انجام کتنا بھیانک ہوتا ہے۔ آج دن اور آنے والی رات تم سے ٹھیلنے کے لیے مختص ہے۔ جتنی اچھل کود چا سکتے ہو چالو۔“

”تم کل صبح کی بات کر رہے ہو جبکہ ابھی پورا دن اور پوری رات باقی ہے۔“

”کل صبح کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ کل دن بھر میں تمہارا حشر کروں گا۔“

”تمہیں خود پر اتنا غرور ہے یقین ہے تمہیں کہ تم ہمیں قید رکھ سکو گے۔“

”بالکل اس کے علاوہ اور مجھے کیا کرنا ہے؟“

میں نے اس بار کچھ بولنے کے بجائے گن کارخ پنجرے کی جانب کیا اور ٹریگر پد باؤ بڑھاتا چلا گیا ٹھک ٹھک دو گولیاں پنجرے کی سلاخوں میں لگیں مگر اسے نقصان پہنچائے بغیر دونوں گولیاں اچٹ کر گر گئیں۔

”بے کار ہے میرے مٹی کے شیر، یہ پنجرہ عام لوہے کا نہیں۔ تم چاہو تو مزید فائر کر کے دیکھ سکتے ہو لیکن سلاخوں پر ہاتھ نہ رکھ دینا سلاخوں میں کرنٹ دوڑنے والا ہے۔“

میں نے بے بس نظروں سے مرتجس کو دیکھا اور سفیر کی طرف بڑھا۔

”نصیر وا“ مرشد کی آواز گونجی۔ ”فائر کر کے تم اس لڑکے کو آزاد کر سکتے ہو مگر گولی سے تیز کرنٹ دوڑ رہا ہے ادھر لمبی دبی اور میں نے مٹن دبا یا چند سیکنڈ صرف چند سیکنڈ میں اس کا جسم کوئلہ بن جائے گا۔“

مرشد کی آواز نے میرے دل میں بھی دہشت پیدا کر دی۔ سفیر کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ موت کی آہٹ کتنی وحشت ناک ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا۔ جس پر گزرتی ہے صرف۔ ہی جانتا ہے۔

”پلیز شہباز صاحب کچھ کریں، مجھے آزاد کرانے کی کوشش کرو، ہو سکتا یہ کھوکھلی دھمکی ہو۔“ مرتجس کی آواز میں خوف کا عنصر بہت زیادہ تھا۔

ابھی اس کا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایک چمک سی پیدا ہوئی مرتجس کی بھیانک چیخ گونجی اور مجھ پر جیسے سستہ طاری ہو گیا۔ مرتجس میرا بار اس کا ساتھ بہت تھوڑے دنوں کا تھا لیکن اس کی معصومیت۔ اس کا الہانہ پن مجھے گرویدہ کیے رکھتا تھا۔ جو لڑائی بھڑائی کی دنیا کا بندہ نہیں تھا بھر بھی ہمارے ساتھ ہر محاذ پر قدم سے قدم ملا کر چلتا تھا۔ جس نے اکیلے ایک بار پوری بازی الٹ دی تھی وہ اتنی آسانی سے ساتھ پھوڑ جائے گا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں اس کا جسم سیاہ پڑ گیا تھا۔ پتا نہیں کتنے ووٹ کا کرنٹ تھا کہ ایک پل میں وہ سوختہ ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر تم پھر ایسا بن گئے تھے۔

”میں کھوکھلی دھمکی نہیں دیتا۔“ مرشد کی مکروہ آواز گونجی۔ ”موت کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایک کمرے میں تم سب کو اسی طرح ماروں گا۔ شہباز سب سے بھیانک موت تمہاری ہوگی۔ تمہی نے مجھے تباہ کیا ہے۔ یہ تمہی تھے جس نے مجھے ڈیوڈ سے فتح خان سے دوست بنا کر رکھلائی۔ مجھ سے فاضلی کو چھینا اسے مکاری

سے ڈیوڈ شا کا نشانہ بنوایا۔ یہ تمہارے ہی شیطانی دماغ کی پیداوار تھی جس نے مجھے دھچکا پہنچایا ہے اس کا تمہیں ضرور چکھنا ہوگا۔ تم ہر ایک کی موت کا منظر دیکھو گے۔ مجھے صرف اس کا رنج ہے کہ تمہاری موت کا منظر صرف میں دیکھوں گا۔ اب تم سفیر کا حشر دیکھو۔“

”ٹھہرو۔“ سفیر نے چیخ کر کہا۔

”موت سے ڈر گئے۔“ مرشد نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”موت برحق ہے ہر ایک انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ مسلمان موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ پھر ہم حالت جہاد میں ہیں گھر سے یہ سوچ کر نکلے ہیں کہ ہم موت پر جاگریں گے یا موت ہم پر آگرے گی۔“ پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”شہباز ہم خود کو پاکستانی کہتے ہیں اور پاکستان تمام عالم میں واحد ملک ہے جہاں اسلام۔ شیدائی گلی کوچوں میں سر بکف ملتے ہیں۔ یاد رکھو پاکستان تحفہ خداوندی ہے۔ نزول قرآن کے روز یہ ملک ہمیں ہے۔ اسی بات سے اس ملک کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہو تمہیں اسی ملک کی قسم ہے اپنے مشن سے پیچھے ہٹنا۔ وطن کے لیے ہم جیتے ہیں اسی کے لیے ہم مرتے ہیں۔ فوج اگر سرحد کی حفاظت کرتی ہے تو ہم اندر رہ کر وطن کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ حافظ۔“

میں یہ کہہ کر وہ ایک قدم آگے بڑھا پھر گن کی نال سفیر کے ہاتھ کو جکڑے شکنجے کے بالکل نزدیک لے کر ٹیگر پر دباؤ ڈالتا چلا گیا۔ تڑتڑ کی آواز سے ہال گونج اٹھا۔

”بے کار ہے۔“ مرشد کی آواز سنائی دی۔ ”ان سلاخوں پر گولیاں بے اثر ہیں۔“

”دیکھ اداکار کے بچے سلاخیں مڑ گئی ہیں۔“ سفیر کی آواز میں خوشی کی چمکارتھی۔ ”اب میں اسے توڑ کر دم لوں گا۔“ کہہ کر میں نے گولی چلائی مگر افسوس میگزین خالی ہو چکا تھا۔

”چچ چچ چچ یہ کوشش بھی بیکار گئی اب میرا کمال دیکھو۔“ اس مردود کی آواز کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی چھنا کا سا ہوا اور اور سفیر پر ایک جال سا آگرا۔ اس جال کے گرتے ہی سفیر کی دردناک چیخ گونجی۔ میں۔ اسپیشل لینس والے چشمے سے جال میں دوڑتی چنگاریوں کو دیکھ لیا تھا اس جال میں کرنٹ تو دوڑا تھا مگر چند لمحوں کے لیے جس نے اسے نیم جان کر دیا۔ ظالم کی طاقت کو سرنگوں کرنے کی قسم کھا کر ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے والا شیر مرد بے ہوش ہو گیا۔ اس کی بے بسی پر میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ اوپر سے اس پر گرنے والا جال پھراٹھ گیا تھا۔ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ مرشد ہم سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہے۔ اس نے سفیر کو دے کر مجھے دھمکایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سفیر مجھے بہت عزیز ہے۔ اسی لیے اس نے اسے بجلی کا جھٹکا دے کر مجھے پیغام دیا ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مجھے اب خاموش نہیں رہنا تھا۔ اسے بھرپور جواب دینا تھا۔ لیکن جوش نہیں ہوش سے۔ جوش اندھا بنا دیتا ہے اور اندھے پن میں غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مجھے عقل سے یہ جنگ جیتنا ہے۔ اس خیال سے میں نے کہا:

”مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیسی موت ملے گی جب ملے گی تو تمہارے سارے الفاظ کو تول لوں گا کہ تم۔“

”کچا کہا تھا یا جھوٹ میرے مرنے میں ابھی بہت وقت باقی ہے۔“

”کوئی وقت نہیں ہے۔“ مرشد کا لہجہ پُر یقین تھا۔

میں نے سفیر پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا، مجھے اب کون سا قدم اٹھانا چاہیے کیونکہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ کمراموت کا کنواں ہے۔ کنٹرول روم میں بیٹھا مرشد بٹن پر انگلی رکھے موت بانٹ رہا ہے۔ میں نے جھک کر مرتجس کے پستول کو اٹھایا جو اس کی کے ہاتھ سے پھسل کر سلاخوں سے باہر آ گیا تھا پھر میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ تبھی مرشد کی آواز گونجی۔ ”کمرے سے نکلنا چاہتے ہو؟ اپنے دوست کو اس حالت میں چھوڑ کر جاؤ گے؟ لو میں نے اسے آزاد کر دیا۔“

کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ اس کے ہاتھ پیر کو جکڑنے والا شکنجہ کھل گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ مرشد میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ شکنجہ کھلتے ہی میں نے اسے گود میں اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ کمرے سے باہر آ کر میں نے مڑ کر ایک نظر مرتجس کی سوختہ لاش پر ڈالی اور اس کمرے سے دور ہوتا چلا گیا۔

گزشتہ رات کی بھاگ دوڑ نے کمروں کے اس جنگل کا جغرافیہ بتا دیا تھا۔ اب یہاں ٹھہرنا بے وقوفی تھی۔ میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر ڈالی تھی۔ مجھے یہاں آنا نہیں چاہیے تھا۔ زندگی کے لالے پڑ چکے تھے زندگی بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اس عمارت سے باہر نکلا جائے لیکن باہر کیسے نکلا جائے۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گلیاروں کی اس بھول بھلیوں میں پھنس کر میں اصل راستہ بھول چکا تھا۔ سیڑھیوں کی طرف جانے والا کوریڈور پتا نہیں کس طرف ہے۔ تبھی ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس منزل پر بنے کمروں کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں تھیں۔ اگر میں کھڑکی سے لان میں کود جاؤں تو بچ سکتا ہوں۔

میں نے سامنے والے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر جا کر میں نے دروازہ بولٹ کر دیا پھر کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا باہر گارڈز کا جھوم تھا۔ سب کی نگاہیں بلڈنگ پر جمی ہوئی تھیں انہوں نے گولیوں کا انجام دیکھ لیا تھا ان کی گولیاں میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکی تھیں۔ شاید اسی لیے اب ان کے ہاتھوں میں روایتی ہتھیار تھے کسی کے ہاتھ میں کلہاڑا تھا تو کسی نے تلوار اٹھا رکھی تھی کوئی برچھا لیے کھڑا تھا۔ آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی، اب میں کیا کروں؟ کھڑکی پر کھڑا میں یہی سوچ رہا تھا کہ مرشد کی آواز گونجی۔ ”کیا موت سے ڈر گئے؟“

”موت میرے لیے کھیل ہے۔“

”پھر رک کیوں گئے۔ کود جاؤ۔ بے چارے گارڈز کی حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔“



کھڑکی سے ہٹ کر میں دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ ہم تین آدمی یہاں آئے تھے۔ ایک مرچکا تھا دوسرا بے ہوش تھا۔ میرا قیاس تھا کہ مرشد کو سفیر سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اسے اگر سزا دینا ہوتی تو وہ ایک بار میں ہی اسے ختم کر دیتا۔ وہ تو مجھے دھمکانے کے لیے اسے شک دے رہا تھا۔ اسے سزا دینے کی وجہ میں ہوں اسی لیے مرشد طنز کی تیلی سے مجھے سلگا رہا ہے۔ میں نے دانت بھیج کر کہا۔ ”مرشد میں تجھے تو ایسا سبق دوں گا کہ تو زندگی بھر یاد رکھے گا۔“

ذہنی دباؤ سے ایک حد تک آزادی ملی تو میں نے کندھے سے لٹکتی ہوئی کلاشن کو داہنے ہاتھ سے اٹھا کر چوما اور کہا۔ ”مرشد تجھے میں راکھ کر دوں گا۔“ میں نے خود کلامی کی پھر میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ گارڈز کی

پوری جماعت مستعد تھی۔ ان کے حوصلے پست کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسٹین گن کی نال کھڑکی سے باہر نکالی اور بغیر نشانہ لیے برسٹ مارا۔ کئی پہریدار گرے باقی نے ادھر ادھر ہو کر آڑ لے لی۔ اب میں ٹھہر ٹھہر کر فائر کر رہا تھا جو بھی نشانے پر آتا خاک اور خون میں لتھڑ جاتا۔ موت کا کھیل عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اس کھیل کو مرشد نے شروع کیا تھا انجام پر اسے میں پہنچا رہا تھا۔ میرے دوست کو اس نے زندہ جلایا تھا۔ میں اس کے بدلے دو سو کی زندگیاں چھین لوں گا۔ اب تک پچاس سے زائد گارڈز میرا نشانہ بن چکے تھے۔ پھر بھی اچھی خاصی تعداد اِدھر اُدھر چھپی نظر آرہی تھی۔ اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر یہی سوچا جاسکتا تھا کہ مرشد نے اپنی حفاظت کے لیے ایک پوری فوج جمع کر رکھی تھی۔ گارڈز جو روایتی ہتھیار تلوار، خنجر، کلہاڑی وغیرہ سے مسلح تھے اب انہوں نے وہ پھینک کر پھر سے آتشیں ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ جوابی گولیاں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے اب تک دو بار میگزین بدلا تھا۔ اسٹین گن کی نال گرم ہو چکی تھی۔ میرے پاس فالتو گولیاں بھی نام کو نہ تھیں۔ مجھے اب فیصلہ کن قدم اٹھالینا چاہیے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔ مرشد کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ شاید اپنے آدمیوں کی موت پر وہ گھبرا اٹھا تھا۔ یقیناً وہ اندر باہر دونوں اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا ہوگا۔ میں نے ایک نظر کمرے پر ڈالی اور دوڑتا ہوا بیچ باتھ روم میں گھس گیا۔ نل کی ٹوٹی کھول کر پانی کی دھار پر نال کو رکھ دیا تاکہ حدت کم ہو جائے۔ پھر میں باہر نکلا تھا کہ مرشد کی مکروہ آواز سنائی دی۔ ”اب کیا کرو گے میری جان گولیاں تو ختم ہونے والی ہیں۔“

”آخری گولی سب سے اہم ہوتی ہے اور وہ میں نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔“ میں نے باتھ روم سے باہر آتے ہوئے کہا۔

”یہ الفاظ میرے لیے نئے نہیں ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگوں کے منہ سے سن چکا ہوں۔“ مرشد نے قہقہہ لگایا۔ ابھی اس کے قہقہے کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے کہا۔ ”میرا کہا پتھر کی لکیر ہے اس وقت میرا پلہ ہلکا پڑ رہا ہے مگر یقین کرو میں تمہیں جہنم واصل ضرور کروں گا۔“

”کیسے؟“

”میں جارہا ہوں۔ اس عہد کے ساتھ کہ میں پھر آؤں گا۔ بہت جلد۔ تم سے ایک ایک زخم کا حساب لینے۔“ ابھی میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ پوری عمارت کانپ کر رہ گئی۔ میں خود بھی چونک گیا تھا پھر تو دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ”یہ دھماکے گرینینڈ کے ہوں گے۔“ میرے دماغ نے کہا کیونکہ دھماکے تیز تھے اور ان کی گونج کافی دیر تک قائم رہتی تھی لہذا آواز بھی دور تک پھیل رہی ہوگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔ دروازے کھڑکیاں بجنے لگے تھے۔



میں دوڑتا ہوا کھڑکی پر پہنچا۔ باہر کا منظر دیکھتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گیٹ کے باہر چار فور وہیل ڈرائیوئرز کھڑی تھیں۔ ان کی کھڑکیوں سے جھانکتی نالیں گولیاں برسا رہی تھیں۔ گرینڈ بھی پھینکے جا رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میرے ہمدرد ہیں۔ عبد اللہ جسے میں باہر چھوڑ آیا تھا اسی نے اپنے ساتھیوں کو خبر دی ہوگی۔ میں گاڑی میں بیٹھے آدمیوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا مگر مجھے ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ جوابی گولیاں بھی چل رہی تھیں اسی لیے وہ لوگ باہر نہیں نکل رہے تھے۔ گاڑیوں کی باڈی چھلنی ہوتی جا رہی تھی۔ تبھی میگافون پر پکارا گیا۔ ”سفیر۔ مرتجس۔ شہباز۔“

میں نے آواز پہچان لی، یہ ریاست خان کی آواز تھی۔

”یہ ریاست خان ہے نا“ مرشد کی آواز سنائی دی۔

”ہاں یہ وہی ہے۔ تمہارا خونی جال ٹوٹ چکا ہے۔ تمہارے احتساب کا وقت قریب ہے۔ یہ تمہارے خون سے ہولی کھیلنے آ پہنچے ہیں۔“

”بچوں کی شرارتوں کا میں برا نہیں مانتا۔ انہیں شوق ہے تو شوق پورے کر لینے دو۔ یہ قیامت تک مجھے نہیں ڈھونڈ سکتے۔“

”میں خود تمہیں گردن سے پکڑ کر باہر نکالوں گا۔“

”اتنی دیر سے تو کوشش کر رہے ہو لیکن پھر بھی دل نہیں بھرا۔“

”سانپ بل میں داخل ہو جائے تو اسے نکالنا آسان نہیں۔ میں پھر بھی کوشش کروں گا۔ مجھے یقین ہے

میں تمہیں تمہارے بل سے کھینچ ہی لوں گا۔“

”بچوں کی طرح بڑھک نہ مارو، مجھے ڈھونڈنا آسان نہیں ہے، تم سمجھ رہے ہو کہ میں خانقاہ میں ہوں، غور

سے سنو، اس وقت میں خانقاہ سے بہت دور بیٹھا ہوں، پھر بھی تمہاری ایک ایک حرکت دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ ایسی عجیب بات نہیں ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کے کونے میں بیٹھا آدمی بھی سامنے نظر آتا ہے

ویسے یہ بات بتا کر تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب تمہیں میں خانقاہ کے باہر تلاش کروں گا۔“

”یہاں سے نکلو گے کیسے؟ تمہارے راستے بند ہو چکے ہیں اگر یقین نہ ہو تو باہر نکل کر دیکھو گیارہ تمہیں نظر

ہی نہیں آئے گا، صرف دیواریں ہی دیواریں ملیں گی۔“

”کیا تم نے جادو سے گلیا راغائب کیا ہے؟“

”اسے جادو ہی سمجھو..... جس آرکیٹیکچر نے ڈیزائن کیا ہے، وہ اپنے کام کا ماہر ہے۔ دنیا بھر کی عمارتوں میں اس کے ڈیزائن کردہ گھر عجوبہ کہلاتے ہیں۔ تم نے سنا ہوگا۔ پیرس میں ایک بلڈنگ ایسی ہے جو دن میں تین بار تین الگ الگ انداز کی نظر آتی ہے۔ اسی طرح کا یہ ماڈل ہے۔ اُس بلڈنگ میں صرف باہر کے شیشے زاویہ بدلتے ہیں جس سے عمارت کا نقشہ بدل جاتا ہے لیکن اس عمارت کا پورا اسٹرکچر مٹن دباتے ہی بدل جاتا ہے۔“

”مجھے اس کا اسٹرکچر نہیں دیکھنا ہے۔ مجھے تو صرف باہر نکلنا ہے۔“

”تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ تم تیسری منزل پر کھڑے تھے اور تمہیں احساس بھی نہیں ہوا اور تم پہلی منزل پر آ گئے۔ کھڑکی سے باہر دیکھو خود سمجھ میں آ جائے گا کہ تم نیچے آ چکے ہو۔“

”واہ..... تم نے خود باہر نکلنے کا راستہ دکھا دیا۔ اب یہ کھڑکی کام آئے گی؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔
میں جس مقصد سے آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا لیکن مرتجس کی موت اور سفیر کی بے ہوشی نے مجھے اکسا دیا تھا کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ سفیر کو کچھ ہونہ جائے اسی ڈر سے میں نے فرار کی راہ اپنائی تھی۔
”پاپ کے سہارے اترو گے پاپ میں کرنٹ دوڑ رہا ہے۔“ مرشد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
”اچھا۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اس چادر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ کہہ کر میں نے دو چادروں کے کونے آپس میں باندھے پھر اس کا ایک کونا بیڈ میں باندھا اور سفیر کو کندھے پر لادنا پھر پھرتی سے چادر کو پکڑ کر باہر کود گیا۔ تقریباً تین حصہ فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ اب زمین زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے چادر چھوڑ کر جمناسٹک کا مظاہرہ کیا اور نیچے آ گیا۔
کندھے پر وزن ہو، تو کودنے پر پیر پر یکا یک بہت زیادہ وزن آ جاتا ہے۔ اگر میں ہوا میں خود کو اچھالنے کی کوشش نہ کرتا تو وزن یقیناً پیروں پر ہی پڑتا لیکن یہاں جمناسٹک کام آئی تھی اور اوپر کا فورس اچھال بھرنے کی کوشش کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ اب ایک نیا۔ ”گریوٹی فورس“ پیدا ہوا جس کی وجہ سے گرنے کی رفتار بدلی اور پیروں پر وزن کم پڑا۔

میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ پیر کی ہڈی ٹوٹ بھی سکتی تھی۔ اس کے علاوہ گولیوں سے تو محفوظ رہتا مگر گرینینڈ سے کیسے بچتا؟ گرینینڈ اپنے پرانے کی پہچان نہیں رکھتے۔ ریاست خان کا پھیکا ہوا کوئی گرینینڈ میرے چیتھڑے اڑا سکتا تھا۔

ابھی میرے پیر فرش سے نکلے ہی تھے کہ کوئی چیز میرے سینے سے آ کر لگی۔ پتا نہیں کہاں سے ایک گارڈ آ گیا تھا یہ اسی کے پستول کی گولی تھی۔ میں نے بلا توقف کلاشن کا ٹریگر دبا دیا گارڈ کا بھیجا اڑ گیا۔ میں سرعت سے گیٹ کی طرف دوڑا پیچھے سے گولیوں کی باڑھ آئی۔ اگر میرے جسم پر بلٹ پروف نہ ہوتا تو میں چھلنی بن چکا ہوتا۔ گولیاں ٹکرا ٹکرا کر نیچے گر رہی تھیں۔ رہاست خان نے کور فائر شروع کر دیا تھا۔ میں اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔ اگر گارڈ تھوڑی سے ہمت دکھاتے تو مجھے پھندا پھینک کر پھنسا لیتے۔ مگر وہ دور دور سے ہی فائر کر رہے تھے۔ میں نے فائرنگ کی پروا کیے بغیر دوڑ لگا دی تھی۔ مجھے فکر تھی تو بس سفیر کی کیونکہ اس کا فائر پروف لباس کہیں سے بھی ہٹ سکتا تھا اور تب اس کے جسم میں گولی کا اثر نا ضروری تھا۔ دوڑتے ہوئے میں کسی نہ کسی طرح گیٹ

تک پہنچ ہی گیا اور باہر آتے ہی پہلی دین میں گھس گیا۔



دین آندھی طوفان کی طرح مرکزی دروازے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ گیٹ ابھی کافی دور تھا۔ پھر بھی میں نے دیکھ لیا تھا کہ گیٹ کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ تینوں گیٹ آئی ڈی فیکس تھے۔ میں جب آ رہا تھا تو تینوں گیٹ پر آئی ڈی چیک کرائی تھی۔ آئی ڈی چیک کرانے کا طریقہ عام سا تھا جواب ہر جگہ، ہر اہم دفتر میں رائج ہوتا جا رہا ہے۔ سفیر نے خانقاہ میں کام کرنے والے ایک بندے سے اس کا کارڈ حاصل کر لیا تھا۔ اس کارڈ کو گیٹ پر لگے آئی ڈی چیکر سے لگانا پڑتا تھا تبھی گیٹ کالاک کھلتا تھا۔ لیکن اس وقت گیٹ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا۔ تینوں گیٹ کا ایک ہی حشر تھا۔ گو یہ خانقاہ شہر سے کافی فاصلے پر تھی۔ مگر اتنی دور بھی نہیں کہ یہاں کی خبر شہر تک نہ پہنچے۔ پہلے بھی ایک بار یہاں خونی مقابلہ ہو چکا تھا۔ اس لیے پولیس دیر میں سہی لیکن آئے گی ضرور۔

ڈرائیونگ سیٹ پر ریاست خان تھا۔ اس کے برابر اس کے دوست تھے۔ پیچھے والی گاڑیوں میں کتنے بندے تھے اس کا پتا نہ تھا۔ میں نے ریاست خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کیسے آ گئے؟“

”میرے پاس جو نمبر تھا وہ وسیم صاحب کا تھا۔ پنڈی پہنچتے ہی میں نے کال کی۔ ان سے پتا چلا کہ آپ خانقاہ گئے ہیں۔ میں نے آنے کی اجازت طلب کی تو وہ بولے کہ اگر آنا ہے تو فوراً آ جاؤ اس لیے کہ ہمیں ایک ضروری کام سے نکلنا ہے۔ میں آندھی طوفان کی طرح ان کے پاس پہنچا۔ تب پتا چلا کہ عبداللہ صاحب خانقاہ کے احاطے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ اور سفیر صاحب بھی اندر ہیں۔ میں اتنا اندر کبھی نہیں آیا۔ وسیم صاحب کے ہمت دلانے پر میں بھی اسی گاڑی میں بیٹھ گیا جس پر وہ دونوں تھے۔ میری گاڑی کو میرے دوست سنبھال رہے تھے۔ اندر آنے سے پہلے عبداللہ صاحب سے ایک گھنٹے کی میٹنگ کر لی تھی۔ دراصل وہ خانقاہ سے باہر نکل آئے تھے اور انہوں نے وسیم کو بتا دیا تھا کہ آپ اندر پھنس گئے ہیں۔ وسیم اور عبداللہ صاحب نے مانی کی مدد سے یہاں کے کمپیوٹرائز سسٹم کو ہیک کر لیا۔“ ریاست خان نے عادت کے مطابق ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”راستے بھر وہ آئی ایم او پر رابطے میں رہے اور عبداللہ صاحب لیپ ٹاپ پر اس کے ٹیس کو آزماتے رہے۔ سڑک اور اس گیٹ کے تمام چیکنگ پوائنٹس کے کمپیوٹر کو ہیک کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے میں انہوں نے معاملہ نمٹا لیا۔“

”چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ مانی سے رابطہ ہو گیا۔ اندر کے حالات دیکھ آیا ہوں۔ اس موقع پر مانی کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ گھر پہنچ کر میں بھی اس سے بات کروں گا۔“

باتوں کے درمیان راستہ کٹ گیا اور ہم اس بنگلے تک پہنچ گئے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔



بنگلے میں ہم تین افراد بیٹھے تھے وسیم کا چہرہ غم و درد کی تصویر بنا ہوا تھا۔ میں نے مرشد کی سریت کا مکمل احوال بتا دیا تھا۔ اپنے دوست پر ہونے والے مظالم کی روداد اس نے آنسو پیتے ہوئے سنی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ ”میں اپنے دوست کی شہادت پر آنسو نہیں بہاؤں گا۔ شہید مراد نہیں کرتے میرا دوست بھی زندہ ہے۔ اس کے ادھر رے خواب کو میں پورا کروں گا۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں غداروں کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے مرشد جیسے غداروں کو سزا دینی ہوگی۔ ہمارے ملک کو انتشار کے گرداب میں دھکیلنے والے صہیونیت و بھارت کے علمبرداروں کو واصل جہنم کرنا ہی اب میرا مقصد حیات ہے۔ اب مجھ پر واجب ہے کہ مرشد جیسے غداروں کا گلا کاٹوں۔“ وسیم نے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔ ”مجھے ریاست خان کے ساتھی نے جو کچھ بتایا ہے وہ بھی اس کا گلا کاٹنے کے لیے کافی ہے۔ مرشد دولت کی خاطر ماں کا سودا کر رہا ہے۔ وطن ہماری ماں ہے۔ اس کی حرمت پر ہم آنچ نہیں آنے دیں گے۔“

”ارے میں تو بھول ہی گیا۔ ریاست خان کو بلاؤ۔ اس سے کچھ اور باتیں معلوم کرنا ہے۔“ میرا جملہ ختم ہوتے ہی سفیر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ دروازے سے باہر جاتے ہوئے بولا:

”ریاست خان باہر کہیں جانے کی بات کر رہا تھا کہیں وہ چلا نہ گیا ہو۔“

سفیر کے باہر جاتے ہی وسیم نے کہا۔ ”جب آپ خانقاہ جا رہے تھے تو میں نے کچھ کہا نہیں تھا لیکن اب میں کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کا وہ فیصلہ غلط تھا۔ اکیلے کچھار میں کود جانا عقل مندی نہیں ہے۔ اگر ہم سب ساتھ ہوتے تو معاملہ کچھ اور رخ اختیار کیے ہوتا۔“

”سب سے پہلی بات کہ میں وہاں مقابلہ کرنے نہیں گیا تھا۔ ایک بھر پور حملے کی پیش بندی تھی وہ۔ میں وہاں کی سیوریج چیک کرنے گیا تھا۔ ورنہ میں تمہیں اور عبداللہ کو چھوڑ جاتا؟ لیکن اب اس ناہنجار کو اس کے انجام تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔“

”خیر جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن اب آپ مجھے چھوڑ کر کوئی مشن انجام نہیں دیں گے۔“

”مرشد کو میں نے چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دیا ہے۔ میں پھر اس موت کے کنوئیں میں جاؤں گا۔ اس کی خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجاؤں گا۔ خواہ اس بار میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔“

”آپ نے جو کچھ بتایا ہے ان باتوں کو مد نظر رکھ کر سوچیں تو وہاں اسے تلاش کرنا بھی مشکل ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”اب تک ہم چھاپہ مار انداز میں لڑتے رہے ہیں مگر اب ہم کھل کر سامنے آئیں گے۔ اخبارات کو شہ سرخیاں فراہم کریں گے۔ اس طرح سامنے آئیں گے کہ ہر طرف ہلچل مچ جائے۔ کیونکہ ملک کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ رونما ہوگا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ریاست خان اور سفیر داخل ہوئے۔ میں نے ریاست کو اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا جب کہ سفیر سامنے بچھے صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔ میرا نے ریاست خان سے کہا۔ ”اب تم بھی ہمارے اہم ساتھیوں میں سے ایک ہو اسی لیے میں نے تمہیں اس میننگ میں شریک کر لیا ہے۔“

”اس اعزاز پر میں فخر کرتا رہوں گا۔“ ریاست خان بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ اس خانقاہ کی نئی تعمیر شدہ عمارت کو تو ہم نے دیکھ لیا پھر بھی یہی کہوں گا کہ میری معلومات ادھوری ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی ایسا شخص بھی ہے جو اندر کا نقشہ صحیح بتا سکے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔ ایسے کئی بندے ہیں جو میری وجہ سے مرشد کا اصل چہرہ دیکھ چکے ہیں۔ اور اب اس

کے نام پر تھوک رہے ہیں۔ ایسے کئی لوگوں کو میں جانتا ہوں جو ایک دو دن پہلے تک مرشد کے ساتھ تھے۔“
 ”ایسے کسی آدمی کو بلا لوتا کہ اندر کی تفصیل مکمل مجھ تک پہنچ جائے۔ وہ میرے سامنے اندر کا پورا نقشہ کھینچ دے۔“

”ابھی بلا کر لاتا ہوں۔“ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

ریاست خان کے باہر جاتے ہی سفیر نے کہا۔ ”میرے علم میں ایک اہم بات آئی ہے۔“

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسا کرتا ہوں میں اس بندے کو بلا لاتا ہوں جس نے مجھے یہ بات بتائی ہے لیکن ریاست خان کے سامنے اس سے کوئی پوچھ گچھ نہ کریں۔“

”اس کمرے کے برابر میں بھی تو ایک کمرہ ہے اور اس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا۔ تم اسے لے کر باہر والے دروازے سے اندر آؤ۔ میں وہیں اس سے سوال جواب کر لوں گا۔“

”ہاں یہ صحیح ہے۔ آپ اس کمرے میں جا کر بیٹھیں۔ وسیم اسی کمرے میں رہے گا۔ ریاست خان آیا تو وہ اسے یہیں بٹھالے گا۔“

”گڈ اچھا آئیڈیا ہے۔“ کہہ کر میں بیڈ سے اتر گیا اور سفیر باہر نکل گیا۔ دراصل میں ہی نہیں ہمارے تمام دوست آنکھ بند کر کے کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اسی لیے اس نے ریاست خان کے سامنے کچھ کہنے سے منع کیا تھا۔

میں اس برابر والے کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے کی سیٹنگ کچھ اس قسم کی تھی کہ ایک نظر میں ہی وہ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم نظر آ رہا تھا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس کمرے میں آئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پچھلا دروازہ کھلا اور سفیر داخل ہوا اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ اس نے نئے انداز میں بال ترشوائے ہوئے تھا۔ اس نے بلیو جینز پر ریڈیٹ شرت پہن رکھی تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”اشفاق نام ہے میرا۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”تم مرشد کے ساتھ کب سے ہو؟“

”یہی کوئی تین مہینہ پہلے اس کی نوکری میں آیا ہوں۔“

”تمہارے ذمے کیا کام تھا؟“

”مرشد نے ایک اسپیشل فورس بنا رکھی ہے جو اس کے حکم پر دیا گیا ٹاسک پورا کرتی ہے۔ جسے اس دنیا سے ہٹانا ہے اس کا کام تمام ہم کرتے ہیں۔ اس ٹاسک فورس میں کل گیارہ بندے ہیں۔“

”ان سے تمہارا رابطہ ہے؟“

”صرف ایک بندے سے جو میرا رشتہ دار بھی ہے۔ اس کی پوسٹ بھی میرے برابر ہے یعنی ٹارگٹ

کرنا۔“

”وہ گیارہ کے گیارہ اسی کام کے لیے ہیں؟“

”جی نہیں۔ ان میں سے دو بندے ٹمینہ کے گاڑی گاڑ رہے ہیں؟“

”یہ ثمنینہ ہے کو؟“

”ثمنینہ کون ہے یہ تو معلوم نہیں لیکن اتنی خبر ضرور ہے کہ وہ مرشد کو بھی جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔ وہی مرشد کے لیے ٹاسک تیار کرتی ہے اور پھر اسے منظوری دینا مرشد کا کام ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم مرشد نے دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کام ثمنینہ کا ہوتا ہے۔“

”ثمنینہ دیکھنے میں کیسی ہے۔“

”خوبصورتی اس کے انگ انگ سے پھوٹی ہے لیکن وہ لڑائی کا فن بھی جانتی ہے۔ میں نے خود اسے کراٹے کی پریکٹس کرتے دیکھا ہے۔“

”رہتی کہاں ہے؟“

”مرشد کا متروک بنگلا اس کے استعمال میں ہے۔، باڈی گارڈ میرا کزن ہے۔ اسی نے بتایا کہ وہ کبھی بھی بینک نہیں گئی لیکن جب بھی مرشد کا پیغام آتا ہے ثمنینہ کے بندے نوٹوں سے بھرے بریف کیس لے کر پہنچا آتے ہیں۔“

”یعنی وہی اسپانسر کر رہی ہے؟“

”ہم سب کو شک ہے کہ مرشد کو رقم وہی دے رہی ہے ورنہ مرشد تو ایک مراہو اگھوڑا ہے۔ اس پر داؤ کون لگائے گا؟ خانقاہ کی جو آمدنی ہے وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ خرچ بھی بہت زیادہ ہے۔ احاطے میں تعمیرات کا ایک جال سا پھیلا لیا ہے اس نے۔ آپ جس بلڈنگ میں گئے تھے وہ خاص طور سے بنائی جا رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس حصے کی تعمیر میں مقامی مزدوروں سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ تمام انجینئر گورے ہیں۔ جن مزدوروں سے کام لیا گیا تھا۔ وہ بھی باہر سے لائے گئے تھے۔ اور کام ختم ہوتے ہیں وہ کہاں چلے گئے کسی کو پتا نہیں۔“

”ایسا کرتے ہیں کہ پہلے ثمنینہ کو چیک کر لیتے ہیں۔“ سفیر نے فریج میں کہا۔

”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔“ میں نے بھی فریج میں جواب دیا۔

”بچپن میں پڑھا تھا کہ آج کا کام کل پر نہ ڈال..... اس لیے دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔“ سفیر نے تجویز

دی۔

میں نے اس بندے سے کہا کہ ابھی آپ دو تین دن آرام کریں۔ پھر میں آپ کو بلا لوں گا۔

اسے بھیج کر میں نے سفیر سے کہا۔ ”تم اپنے دونشا چچی لے لو۔ آج ہی ثمنینہ کو چیک کرنا ہے۔ شام اب

گہری ہو رہی ہے۔ رات میں دہش ڈالیں گے۔“ میں نے کہا۔

”اور کون کون جائے گا؟“

”تین گروپ میں ہم نکلیں گے۔ ایک گروپ میں وسیم اور عبداللہ ہوں گے ان کے ساتھ ان کے آدمی بھی

رہیں گے۔ دوسرے کی کمانڈ سفیر کرے گا۔ اس گروپ میں بھی سفیر اور عبداللہ کے آدمی رہیں گے۔ تیسرے میں،

میں اور ریاست خان ہوں گے۔ ہماری مدد کے لیے ریاست خان کے دو آدمی اور وسیم کے بندے ہوں گے۔“

”گویا بھر پور حملہ کرنا ہے؟“ وسیم نے کہا۔

”ثمینہ کے بارے جتنی باتیں علم میں آئی ہیں وہ اسے نہایت اہم کردار ثابت کر رہی ہیں۔ اس لیے اسے گھیرنے کے لیے پوری تیاری کرنی ہوگی۔ اسے معمولی لڑکی نہ سمجھا جائے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ وہ راکی تیار کردہ ایجنٹ ہے۔ کسی خاص کام سے یہاں آئی ہے، کسی اہم مشن پر۔ اس لیے اسے گھیرنے کے لیے ہمیں ہوشیاری کے ساتھ بھرپور طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔“

میری بات پر سفیر نے کہا۔ ”ان بیویوں کے پاس عورت نامی ہتھیار بہت ہے۔ انہیں شرم بھی نہیں آتی کہ وہ عورت کو ڈھال بنا کر اپنا کام نکالتے ہیں۔“

”جن گاڑیوں پر جانا ہے انہیں چیک کر لو۔ ہائی وے پر جا کر آزمالو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی گاڑی دھوکا دے جائے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”او کے چیک کر لیتے ہیں۔“ کہہ کر عبداللہ اور سفیر باہر نکل گئے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ جب میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اسی وقت وسیم نے اپنا کمال دکھا دیا تھا۔ جب وہ اسلحہ خریدنے گیا تھا تو ساتھ میں بکس کا سامان بھی لے آیا۔ مٹر کے دانے برابر مائکروفون اس نے چاروں گاڑیوں میں لگا بھی دیا تھا۔ بکس (Bug) اتنا چھوٹا سا تھا کہ اسے ڈھونڈنا بھی آسان نہ تھا۔ وسیم کا کہنا تھا کہ یہ دس میل تک کام کرتا ہے۔ میں بھی اسے آزمانا چاہ رہا تھا۔ سفیر وغیرہ کو ابھی تک اس کے مطلق کچھ بھی بتایا نہیں تھا۔ ان کی لاعلمی میں اسے استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔

سفیر کے جاتے ہی میں نے لیپ ٹاپ کھول لیا جو وسیم نے لا کر دیا تھا۔ اس میں ایسے سوفٹ ویئر تھے جو ہیوی ٹرانسمیشن میں کام آتے ہیں۔ گاڑیوں میں لگائے گئے بکس اتنے حساس تھے کہ وہ سرگوشی کو بھی پکڑ لیتے تھے۔ گاڑی میں ہونے والی ایک ایک بات کو وہ کیچ کر کے اس رسیور تک پہنچا دیتے۔ اسی بات کو جانچنے کے لیے میں نے انہیں بھیجا تھا۔

میں نے رسیورنگ سیٹ کو آن کر دیا تھا۔ کبھی سفیر کی گاڑی میں ہو رہی باتوں کو سنتا اور کبھی فریکوئنسی تبدیل کر کے عبداللہ کی۔ تینوں گاڑیوں کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

یہ قدرت کی دین ہے کہ میرا اندازہ بہت کم غلط ہوتا ہے۔ میں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ جیسے ہی عبداللہ کی گاڑی میں چھپے بکس کی فریکوئنسی سیٹ کی تو میں چونک اٹھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے کسی بندے نے پوچھا تھا۔ ”یہ کیسی آواز تھی۔ ہمیں کس نے ویل کم کہا؟“

عبداللہ سے پہلے کسی نے کہا تھا۔ ”ویل کم..... میں شہباز کے ساتھیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

”کون ہو تم۔“ عبداللہ نے پوچھا تھا پھر اس کی سرگوشی سنائی دی۔ ”اندازہ لگاؤ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟“

وہی آواز پھر سنائی دی۔ ”پنڈی میں داخل ہوتے ہی تم لوگ میری نظروں میں آ گئے تھے لیکن پھر میں نے تم لوگوں کو کھو دیا۔ یہ غلطی جس سے ہوئی تھی اسے سزا دینے کے بعد میں نے تم لوگوں کی تلاش میں ایک پوری ٹیم لگا دی۔ میرے آدمی ایک ایک جگہ تم لوگوں کو تلاش کر رہے تھے کہ اتفاقاً نظر آ گئے۔ اگر تم لوگ وہاں نہ رہتے تو ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کھاتے رہتے۔ یہ تو میرے فرشتوں کو بھی پتا نہ تھا کہ جسے ہم ڈھونڈ رہے ہیں وہ خود چل کر ہمارے پیٹرول پمپ پر آ جائے گا۔“

”پیٹرول پمپ؟ ادا چھا ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ایک پیٹرول پمپ پر ر کے تو تھے۔“ عبداللہ کی آواز آئی۔

”جیسے ہی آپ لوگ آئے میرے کارندوں نے مجھے خبر دے دی کہ جو تصویریں بھیجی ہیں ان میں سے ایک پیٹرول پمپ پر آیا ہوا ہے..... بس میں نے اشارہ دے دیا اور پمپ پر کھڑے میرے آدمیوں نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی۔ بیس منٹ کا کام ہے کہہ کر کار کو سروس کے لیے روک لیا اور یہ مائکروفون لگا دیا۔ جس کی وجہ سے اس وقت میں آپ لوگوں سے مخاطب ہوں۔“

”یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ بکس کرنا تو اب بچوں کا کھیل ہے۔“

”گاڑی بگ کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم آپ کو صحیح راستہ بتائیں۔ آپ لوگ جس طرح لانگ ڈرائیو کر رہے ہیں، اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ نئی راہ ہم بتاتے ہیں۔“ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر وہی آواز سنائی دی۔ ”ارے یہ گاڑی کیوں روک لی۔ چلاتے رہیں۔ راستہ میں بتاتا ہوں۔“

”کون ہو تم؟ اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”اشارہ تو دے ہی دیا ہے۔ شہباز کے ساتھی ایسے کند ذہن ہوں گے یہ پتا ہی نہیں تھا۔ اگر دوبارہ سننا چاہتے ہیں تو سن لیں۔ میں مرشد سائیکس کا معمولی غلام ہوں۔ اکبر کہتے ہیں مجھے۔ اکبر یعنی بڑا۔ میں اپنے گروپ میں سب سے بڑا ہوں۔ موسٹ پاورفل بندہ۔“

”تم نے ہماری کار میں ٹرانسمیٹر کیوں لگایا ہے؟“

”صرف ٹرانس میٹر ہی نہیں، کیمرہ بھی لگایا ہے۔“

اسی وقت عبداللہ کی آواز آئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”ٹرانس میٹر اور کیمرہ ڈھونڈو۔“

”آپ لوگ فضول میں وقت برباد کریں گے۔ میں خود بتائے دیتا ہوں۔ اپنے سر کے اوپر دیکھیں بیک ویو مرر جہاں لگا ہے اسی کی سیدھ میں اوپر کی طرف نظر اٹھائیں۔ وہاں ایک چھوٹا سا مٹر کے دانے برابر ایک ابھرا ہوا اسپاٹ نظر آ رہا ہوگا۔ وہی کیمرہ ہے۔ نہایت طاقتور کیمرہ۔ جدید ترین کیمرہ۔ ففٹی میگا پیکسل کا کیمرہ ہے۔ ایک ایک حرکت کو واضح دکھاتا ہے۔ اسی کے ساتھ مائکروفون بھی بلٹن ہے۔“

شاید عبداللہ نے ادھر ہاتھ بڑھایا تھا کہ آواز سنائی دی۔ ”نہ نہ ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔ اس وقت وہ صرف کیمرہ ہے لیکن اسے چھیڑا گیا تو یہ کسی بم کی طرح پھٹ جائے گا اور تب آپ لوگوں کے تھڑے بھی گھسنے نہ جاسکیں گے۔ دراصل اسے میں ری موٹ کنٹرول سے کنٹرول کر رہا ہوں۔ جیسے ہی انگوٹھے کا دباؤ بڑھاؤں گا یہ بم ٹمک پاور کی طرح تباہی پھیلا دے گا پھر آپ لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ نہ گاڑی رہے گی اور نہ گاڑی میں سوار انسان۔ لیکن میں ایسی حرکت کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں آپ لوگوں کا خیر خواہ ہوں۔ ہوں ناخیر خواہ؟..... ارے آپ لوگوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔ بتائیے نا، ہوں ناخیر خواہ؟ اگر نہ ہوتا تو آپ کو روکنے کی کوشش کیوں کرتا۔ اور آپ لوگ نادانستگی میں موت کی گود میں جا سوتے۔ اناللہ ہو چکے ہوتے۔“

”کینے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ایک نئی آواز سنائی دی۔ شاید یہ عبداللہ کے ساتھی کی آواز تھی جو غصے میں پھنکا رہا تھا۔

”ضرور ضرور، اگر ایسا موقع آجائے تو ایسا ہی کرنا کیونکہ چوٹ کھائے سانپ کو کبھی زندہ نہیں چھوڑا جاتا۔“ طنزیہ انداز میں کہا گیا۔

”تم..... تم ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔“ وہی آواز سنائی دی۔ شاید وہ غصے کو دبا نہیں پارہا تھا۔

”بالکل سچ، میں تم لوگوں کا کچھ بگاڑنا بھی نہیں چاہتا۔ ہاں اگر مجبور کیا گیا تو اور بات ہے۔“

گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں کیسے انہیں بچاؤں۔ وہ اس وقت ہیں کہاں۔ کس علاقے میں ہیں یہ بھی پتا نہیں تھا۔ کچھ اور وقت گزر گیا لیکن میری قوت سماعت گوش برآواز تھی۔ تبھی وہ منحوس آواز پھر سنائی دی۔ جیسے وہ ان کی بے بسی کو انجوائے کر رہا ہو۔ ”نہ نہ عبداللہ صاحب، ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔ ادھر تم نے دروازہ کھولا ادھر میں نے مٹن پر دباؤ بڑھا دیا۔ پھر کیا ہوگا اس کا اندازہ آپ کو خوب ہوگا۔ یہ گاڑی کسی بھری ہوئی ماچس کی ڈبیا کی طرح بھک سے جل جائے گی۔“

”تم..... تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز میں ایسا کوئی عنصر نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا کہ وہ پریشان ہے۔ خوفزدہ ہے۔ اس کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

”میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ زندگی کو انجوائے کرو۔ یہ زندگی خدا کی دین ہے۔ جتنی زندگی قسمت میں لکھ دی گئی ہے اسے انجوائے کرو۔ ویسے بھی تم لوگوں کی اب بہت تھوڑی زندگی رہ گئی ہے۔“

”سنو مسٹر غائب! اگر تم اس وقت میرے سامنے حاضر ہوتے تو میں بتاتا کہ کس کی زندگی تھوڑی ہے۔“

عبداللہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”مسٹر عبداللہ! آپ کتنے بہادر ہیں یہ ابھی پتا لگ جائے گا فی الحال تو ڈرائیونگ دوبارہ شروع کر دیں۔

میں راستہ بتاتا رہوں گا آپ کو اسی رستے پر بڑھتے رہنا ہے۔ تاکہ بلد سے جلد آپ ہمارے سامنے حاضر ہو سکیں۔“

گاڑی اشارٹ ہونے کی آواز گونجی پھر وہی آواز سنائی دی۔ ”ہاں بالکل سیدھ میں بڑھتے رہو۔“

کافی دیر تک ٹریفک کا شور سنائی دیتا رہا۔ پھر وہی مکروہ آواز گونجی۔ ”اب داہنی جانب والی سڑک پر مڑ جاؤ۔ بازار میں پہنچ کر اکلوتی مٹھائی کی دکان ہے۔ اس سے تین فرلانگ آگے جانا ہے پھر داہنی جانب والی سڑک پر مڑ جانا۔ جب اس سڑک پر پہنچو گے تو میں آگے کا راستہ بتاؤں گا۔“

مجھے رہ رہ کر عبداللہ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ سڑک کا نام یا کوئی نشانی کیوں نہیں بتا رہا۔ اپنی گفتگو میں اگر نام لے لیتا تو میں وہاں پہنچ جاتا۔ اب مجھ سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیپ ٹاپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام کو انجام دینا بھی ناممکن لگنے لگا تھا اس لیے کہ اس رسیونگ سیٹ کی وجہ سے میں ان لوگوں کی نقل و حرکت سے آگاہ ہو رہا تھا۔ سفیر وغیرہ بھی نہیں تھے کہ ان میں سے کسی کو وہاں بٹھا دیتا۔ تبھی وسیم چائے کا کپ اٹھائے اندر آیا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کہا۔ ”عبداللہ خطرے میں ہے لیکن ہے کہاں اس کا پتا نہیں لگ پا رہا۔ وہ بے وقوف بھی علاقے کا نام نہیں بتا رہا کہ اس کی مدد کو ہم پہنچ سکیں۔“

”یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ ہم بڑی آسانی سے لوکیشن دیکھ سکتے ہیں۔“ کہہ کر وہ اس لیپ ٹاپ

کے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا پھر بولا۔ ”لیجئے پتا لگایا کہ وہ ہے کہاں؟“

لیپ ٹاپ کی اسکرین پر گولگول ارتھ کے ذریعہ شہر کے نقشے پر گول سرکل نظر آیا، اس نشان کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا۔ ”یہی وہ جگہ ہے جہاں اس وقت عبداللہ کی گاڑی کھڑی۔“

”تو پھر دیر کرنا مناسب نہیں۔ فوراً نکلو۔ ہمیں عبداللہ کی مدد کرنی ہے۔“ کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔ جلد بازی میں ریوالور لیا اور کچھ اضافی گولیاں لیں۔ ایک پستول بھی لے لیا جس کی نال پر سیلنسر لگا ہوا تھا۔ یہ اسلحہ وسیم نے خریدا تھا۔

باہر بلیک کلمر می بجیر وکھڑی تھی اسی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ وسیم نے سنبھال لی تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ بھی لے لیا تھا کہ راستے میں ان کی باتیں سننا جو تھیں۔

گاڑی چلی تو میں نے لیپ ٹاپ کو دوبارہ سے آن کر لیا۔ مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔ صرف ٹریفک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دور گئے ہوں گے کہ دوسری جانب کی آواز سنائی دی۔ ”اب تم داہنی جانب مڑ جاؤ۔ چھٹے بنگلے کے بلیک گیٹ پر رک کر ہارن بجاؤ۔ دروازہ کھل جائے گا۔ اس میں داخل ہو جانا۔“

میں نے چھٹا بنگلا اور بلیک گیٹ کو ذہن میں رکھ لیا۔ تبھی وسیم نے کہا۔ ”آپ کو یاد ہے۔ صبح میں نے ایک ایک چپ سفیر اور عبداللہ کو دی تھی کہ اسے پرس میں رکھ لو۔ آپ کو بھی دی تھی۔“

”ہاں وہ چپ میرے پرس میں محفوظ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ بھی بگ ہے۔ اس کی فریکوئنسی سیٹ کریں۔“

میں نے وسیم کے بتائے ہوئے نمبر کو ایڈ کیا تو دل خوش ہوا تھا اس لیے کہ وہ کام کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کام کر رہا ہے۔“

”اب اگر عبداللہ گاڑی سے اتر بھی جائے گا تو ہمارے رابطے میں رہے گا۔“ وسیم نے کہا۔ ”یہ چپ ڈیٹیکٹر کا کام کرے گی۔“

عبداللہ کی کار کی باتیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ میں اسکرین پر اس تھرتھرتے ہوئے نقطے کو دیکھ رہا تھا۔ جو آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ وسیم کی اس عقلمندی نے کام دکھایا تھا۔ اب وہ کہیں بھی چلا جاتا ہم اسے ڈھونڈ لیتے۔ ہم اسی نقطے کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ بلیک گیٹ اب تک ذہن میں محفوظ تھا اس لیے زیادہ فکر کی بات نہیں تھی۔ اسی پہچان سے ہم اس بنگلے کو تلاش کر لیتے جس میں اسے لے جایا گیا ہے۔

اس جانب سے بے فکر ہو کر اب میں پوری طرح اسکرین کی طرف متوجہ تھا لیکن ادھر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ عبداللہ بھی خاموش تھا۔ صرف آگے بڑھتا نقطہ نظر آ رہا تھا جس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ابھی سفر میں ہے۔ تبھی وہی گونجدار آواز سنائی دی:

”بس اسی گیٹ کے سامنے گاڑی روک لو۔“

گاڑی روکنے کا حکم دے کر بولنے والا پھر خاموش ہو گیا۔ عبداللہ کی کار میں خاموشی چھائی رہی۔ گاڑی کے چلنے کی آواز آتی رہی پھر گاڑی رکی تھی شاید۔ اس لیے کہ نقطہ ٹھہر گیا تھا۔ اسی وقت پھر آواز گونجی۔ ”نہیں نہیں، یہاں رکتا نہیں ہے۔ داہنی جانب مڑ جاؤ..... آگے گیراج ہے اس کے اندر گاڑی پارک کر دو۔ ہم اپنے معزز مہمانوں کو شایان شان عزت و توقیر دیتے ہیں۔“

گاڑی بڑھنے پھر رکنے کی آواز اور پھر شرانٹھنے اور گرنے کی آواز آئی۔ میں جان گیا کہ وہ لوگ گیراج کے اندر پہنچ چکے ہیں اور دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ہماری گاڑی بھی اسی سمت بڑھ رہی تھی جس سمت کا اشارہ اسکرین پر مل رہا تھا۔ ابھی اس سے وہی مکروہ آواز آئی۔ ”مسٹر عبداللہ یہ جو سامنے کلاشکوف تھا سہ کھڑے ہیں یہ پانچوں کے پانچوں گونگے اور بہرے ہیں۔ انتہا درجے کے شقی القلب ہیں۔ ہمارے سب سے بہترین اور قابل بھروسہ لڑاکا ہیں یہ۔ انہیں ایک ہی شوق ہے، انسانوں کو ایذا دینا۔ اگر تم لوگوں نے چالاکی دکھائی تو ان کے کلاشن سے گولی پہلے نکلے گی اور انتباہ بعد میں سنائی دے گا۔ وہ گولی جسم کے ان حصوں میں دھنسے گی جہاں گولی جا کر موت دینے کی بجائے ایذا پہنچاتی ہے۔ انہیں لوگوں کو ترپانے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ یہ آپ لوگوں کو مہمان خانے میں لے جائیں گے۔“

”یہ مہمان خانہ ہے کہاں؟ کیا اسی بلڈنگ میں ہے یا کہیں اور؟“ عبداللہ نے پوچھا۔
 ”یہ بلڈنگ دیکھنے میں پانچ مرلہ پر ہے لیکن ایسا ہے نہیں، اسے خصوصی طور پر بنایا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ اب دس مرلہ پر ہے۔ ایسا کیسے ہوا یہ بعد میں بتاؤں، فی الحال آپ لوگ ان کے ساتھ گیسٹ روم میں جائیں۔ ایک بات اور بتا دوں، آپ کو ٹھہرانے کے لیے گرین گیسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا گیا ہے اس گیسٹ روم کی ہر چیز سبز ہے۔ اسی بنگلے میں ایک پورشن کو بلیک گیسٹ روم کا نام دیا گیا ہے۔ وہاں کی ہر چیز سیاہ ہے۔ سیاہی موت کی علامت ہے۔ اس کمرے میں صرف ان لوگوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ جن کا مقدر موت ہے۔ ویسے اطمینان رکھیں ابھی آپ لوگوں کو وہاں نہیں بھیجا جائے گا۔ کیونکہ ہمیں شہباز کی تلاش ہے۔ جیسے ہی وہ آئے گا آپ لوگوں کو اس گیسٹ روم میں بھیج دیا جائے گا۔“

”لیکن شہباز کو ڈھونڈو گے کیسے۔ وہ شہباز ہے، اونچے آسمانوں پر ہی اس کا بسرا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔
 ”دیکھتے رہو۔ اگر وہ تخت الٹری میں بھی چھپ جائے پھر بھی ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔ فی الحال تم آرام کرو، ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالو کیونکہ کھیل کا اگلا راؤنڈ بھی جلدی شروع ہوگا۔“
 ”آرام وہ کرتے ہیں جنہیں امید نہیں ہوتی۔ مجھے تو سو فیصد امید ہے کہ تم جلد واصل جہنم ہو گے اور تمہیں جہنم کا ٹکٹ شہباز دے گا۔ وہ اب تب میں پہنچنے ہی والا ہوگا۔“

”یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ تمہیں یہ سوچ کر لایا گیا ہے کہ انگلی پکڑنے سے ہی پہنچو یعنی کلائی ہاتھ آتی ہے۔ ہمیں خود بھی یقین ہے کہ شہباز تمہیں چھڑانے آئے گا۔ بس وہ لمحہ ہی اس کے لیے آخری ہوگا۔“
 ”ایسی خواہش بہت لوگوں نے کی تھی۔ اور ایسی خواہش کرنے والے خواہش کے ساتھ قبر میں جا سوئے۔“ کہہ کر عبداللہ نے تہقہہ لگایا۔

”ہاتھ کنگن کو آرسی کیا..... جلد تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ شہباز کا انجام کیسا بھیانک ہوا۔“
 ”ضرور ضرور..... ہم بھی دیکھیں گے کہ کون سچا اور کون شیخی خور ہے۔“

”اب تک شہباز کا مقابلہ جن لوگوں سے تھا وہ سب سڑک چھاپ تھے لیکن میرا تعلق جس قوت کے ساتھ ہے وہ جس مشن پر کسی کو بھیجتی ہے اسے پہلے ٹرینڈ کرتی ہے۔ مجھے بھی ٹریننگ کے بعد بھیجا گیا ہے..... اب بہت باتیں ہو گئیں۔ وہ لوگ تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے کھڑے ہیں۔ ان سے تعاون کرو، جا کر کمرے میں آرام

”کرو۔“

شاید عبداللہ اس گیراج سے چلا گیا تھا کیونکہ اب کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کار میں لگایا گیا بکس کام نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ گاڑی کے نزدیک ہوتے تو شاید ان کی آواز سنائی دیتی رہتی لیکن بریف کیس نمالپ ٹاپ پر عبداللہ کی جیب والے چپس کا اشارہ موصول ہو رہا تھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا نقطہ آگے بڑھ رہا تھا۔ شاید عبداللہ نزدیک کے کسی کمرے کی جانب جا رہا تھا۔

ہماری کار اسی جانب بڑھتی جا رہی تھی جدھر کا اشارہ مل رہا تھا۔ اب وہ مقام نزدیک آتا جا رہا تھا۔ وسیم نے پوچھا۔ ”ان کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کافی سارے لوگ ہیں۔ اور ہم دو ہیں۔ کیوں نادوسروں کو بھی بلا لیا جائے۔“

”یہی بہتر ہے۔ تم کال کر کے سفیر کو بھی بلا لو۔ اس کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ مدد کے لیے کافی ہوں گے۔“

وسیم نے موبائل فون پر سفیر سے رابطہ کیا اور اشارے میں بتا دیا کہ ایک بڑی پریشانی کا سامنا ہے۔ اسے تیار ہو کر آنا ہے۔

اب ہم اس سڑک پر پہنچ چکے تھے جس کے بارے میں عبداللہ کو اس آواز نے بتایا تھا۔ وہ کس کی آواز تھی، کون ہے اس کا پتا نہیں تھا بس اتنا اندازہ تھا کہ وہ جو بھی ہے۔ مرشد کے بہت نزدیک کا آدمی ہے۔ اس مخصوص سڑک پر پہنچ کر وسیم نے گاڑی روک لی تھی جس کا اشارہ ہمیں عبداللہ سے ہونے والی گفتگو سے ملا تھا۔ اب ہمیں انتظار تھا کہ سفیر آجائے تو ہم اس عمارت میں داخل ہوں۔

انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ کچھ ہی دیر میں سفیر کی کار آتی نظر آگئی۔ ہماری کار کے برابر میں اس نے اپنی کار روکی اور اتر کر ہماری کار میں آگیا۔ ساری باتیں سننے کے بعد بولا۔ ”وقت گونا بے کار ہے۔“

”میں کچھ اور سوچ رہا ہوں؟“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ وقت برباد نہ کر کے ہمیں ایکشن میں آ جانا چاہیے؟“ سفیر بولا۔

”میرا خیال ہے کہ رات ہو رہی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔“ وسیم نے بھی سفیر کی تائید کر دی۔

”تو پھر ایسا کرو کہ اپنے بندوں کو بلا لو۔“ میں نے رضامندی ظاہر کی۔ اس نے موبائل پر اپنے بندوں کو بلانا شروع کر دیا۔ میں اس عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ باہر کی دیوار خاصی اونچی تھی پھر اس پر خاردار تار بھی لگے ہوئے تھے۔

ابھی میں اس عمارت کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مرکزی دروازے سے ایک بندہ باہر نکلا۔ اس نے گیٹ بند نہیں کیا تھا۔ شاید اسے کہیں نزدیک ہی جانا اور پھر لوٹنا تھا۔ یہ موقعہ اچھا تھا۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ”تم اس بندے کو قابو کرو۔“

سفیر آہستہ چال چلتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے ہوا خوری کے لیے نکلا ہو۔ نزدیک پہنچتے ہی اس نے کچھ کہا تھا جو دوری کی وجہ سے ہم سن نہ سکے صرف اتنا دیکھا کہ اس بندے نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے کچھ بتایا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھتے ہی سفیر ایکشن میں آیا اور اس نے اس بندے کی گردن میں آرم

لاک لگا دیا پھر ایسا دھوبی پچھاڑ لگایا کہ وہ منہ سے آواز بھی نہ نکال سکا۔

اسے بے ہوش کر کے سفیر نے جھاڑی میں ڈالا پھر واپس آنے لگا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ میں نے رکنے کا اشارہ دیا اور پچھلی سیٹ پر پڑے الیکٹریکل وائر کو اٹھالیا۔ یہ وائر میں نے آج ہی منگوایا تھا تا کہ ایکسٹنشن بنا سکوں۔ ایکسٹنشن تو بن نہ سکا مگر اب کام آ رہا تھا۔ سفیر کے قریب پہنچ کر میں نے کہا۔ ”اگر اسے ایسے ہی چھوڑ دو گے تو یہ ہوش میں آتے ہی اندر کی جانب دوڑ لگا دے گا۔“ پھر میں نے اس کے ہاتھ پیروں کو باندھنا شروع کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے سفیر کو مخاطب کیا۔ ”اس کے منہ میں بھی کچھ ٹھونس دو تا کہ یہ مدد کے لیے کسی کو بلا نہ سکے۔“

سفیر کار کی جانب مڑ گیا اور جب لوٹا تو اس کے ہاتھ میں اجرک تھا۔ اجرک کے ایک حصے کو گولا سا بنایا پھر اسے اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اب ہمیں اندر داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بند ہونے سے پہلے ہمیں اندر داخل ہو جانا چاہیے۔“

”کوشش کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے لیکن میں پہلے اپنے آدمیوں کو آنے کا کہہ دوں۔“

وہ موبائل فون نکال ہی رہا تھا کہ سامنے سے آتی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کو دیکھ کر رک گیا۔ ”شاید میرے بندے آ گئے۔“

میں بھی اسی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گاڑی ہماری کار کے پاس آ کر رک گئی۔ وسیم کار کے پاس کھڑا تھا۔ اس گاڑی سے اترنے والے نے اس سے مصافحہ کیا۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ وسیم کو جانتا ہے۔ سفیر اور ہم واپس اپنی کار کے پاس آ گئے۔ نووارد نے سفیر سے کہا۔ ”ہم تینوں الگ الگ مقام پر تھے اس لیے آنے میں کچھ دیر ہوئی۔“

”کوئی بات نہیں..... اب سنو کرنا کیا ہے۔“ کہہ کر سفیر نے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے پوچھنا چاہتا ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔

”ہمیں اس بجٹ کے اندر داخل ہونا ہے۔ اندر سخت پہرہ ہے۔ وہ لوگ مقابلے کے لیے تیار ہوں گے۔ گارڈ سے منٹ کر ہمیں اندر اپنے ایک ساتھی تک پہنچانا ہے۔ اسے چھڑانا ہے۔“

”گیٹ تو کھلا ہوا ہے۔“ نووارد نے کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے۔ شاید شمشاد ہے نا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی سر میرا نام شمشاد ہے اور اس کا اشرف، اس کا ندیم۔“

”ہم دو طرف سے اندر داخل ہوں گے۔ سفیر میرے ساتھ ہوگا۔ ہم دیوار پھاند کر اندر جائیں گے لیکن تم اور وسیم گیٹ سے داخل ہو گے۔ باقی لوگ باہر رہیں گے۔ تمہارے ان دو ساتھیوں سے ہمارا رابطہ موبائل پر رہے گا۔ جب باہر والوں کو بلانا ہوگا تو بلا لیا جائے گا۔“

”جی بہتر ہے۔“ اس نے کہا۔

”یاد رکھنا سی ٹی کیمرے بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہمارے اندر جاتے ہی انہیں خبر ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ہم دو الگ الگ گروپ میں اندر جا رہے ہیں کہ ایک گروپ نظروں میں آ بھی جائے تو دوسرا مدد کے لیے تیار رہے۔ ہاں، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس بنگلے کا کوئی اور راستہ بھی ہے کیونکہ ایک شخص نے ہمارے ساتھی سے کہا تھا کہ یہ دس مرلے پر پھیلا ہوا ہے جب کہ اس بنگلے کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ یہ دس مرلے کا ہے اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ برابر والے یا پیچھے والے بنگلے سے اسے ملایا گیا ہے جو سامنے سے محسوس نہیں ہو رہا ہے۔“

”ایسا ہو سکتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب تیار ہو جاؤ۔ میں اس طرف جا رہا ہوں۔ سفیر میرے ساتھ ہوگا۔ وہیں سے ہمیں دیوار پھاندا ہے۔ جب میں موبائل آن کروں تو اس چمک سے سمجھ جانا کہ تمہیں دروازے کی طرف بڑھنا ہے۔“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا اور اس طرف بڑھنے لگا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اس بنگلے میں کتنا نہیں ہے کیونکہ ابھی تک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ بس مجھے کیمرے سے بچنا تھا۔ ایک کیمرہ تو میں نے گیٹ کے اوپر لگا دیکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کہیں کوئی کیمرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس دیوار کو اس لیے پسند کیا تھا کہ وہاں ایک پیڑ تھا جس کی شاخیں دیوار تک پہنچ رہی تھیں۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے سفیر کو اشارہ کیا اور وہ بندر کی سی پھرتی سے پیڑ پر چڑھتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے میں بھی اوپر چڑھ آیا پھر میں نے سفیر کو اشارہ کیا کہ وہ دیوار پر چڑھے۔ وہ دیوار کی طرف جانے والی شاخ کی طرف بڑھا تھا کہ میں نے موبائل کو آن کر کے بند کیا۔ اندھیرے میں موبائل اسکرین کی روشنی دور تک نظر آئی ہو گی۔ شمشاد نے بھی دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ میں جب اس ڈال پر پہنچا تو سفیر دیوار تک پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں مجھے وہ جیکٹ بہت یاد آئی تھی جسے پہن کر ہم لوگ کل خانقاہ میں داخل ہوئے تھے۔ اس جیکٹ کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ گولیاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ ساتھ نہیں تھی تو سوچ کر ہلکان ہونے سے فائدہ نہیں تھا۔ ذہن کو جھٹک کر میں نے اندر نظر ڈالی۔ گیٹ کے پاس کسی بندے کو گرا کر ایک بندہ اس کا گلاباں ہاتھ۔ احاطے میں روشنی تھی۔ میں نے پہچان لیا کہ گلاباں والا شمشاد ہے اور نیچے گرا ہوا بندہ چوکیدار کے قبیل کا کوئی ہے۔ اس طرف سے نظریں ہٹا کر میں نے سفیر کو دیکھا جو دیوار سے نیچے اتر چکا تھا۔ میں بھی دیوار پر ہاتھ جما کر نیچے کی طرف لٹک گیا۔ نیچے اترتے ہی میں نے برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ پہرے داری کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ دو گارڈ پر بھروسہ کر کے بنگلے والے مطمئن ہو گئے تھے۔ جب کہ عبد اللہ کو اغوا کرنے والے نے جس انداز میں عبد اللہ کو بریف کیا تھا اس سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی خاص انتظام ہے۔

برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ لائٹ بجھ گئی۔ یہ کام سفیر نے کیا تھا اس نے آتے وقت مین سوئچ آف کر دیا تھا تاکہ اس بنگلے کا خود کار نظام بند ہو جائے۔ میں دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سامنے کمر انہیں، کھلا بیچ تھا۔ سامنے ہی اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ تبھی میں نے عقب میں آہٹ محسوس کی، چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وسیم اور شمشاد آ رہے تھے۔ میں نے وسیم کے نزدیک پہنچتے ہی کہا۔ ”اب ہمیں مزید ہوشیار رہنا ہوگا کیونکہ اندر والے ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے آنے کی کسی کو خبر نہیں ہوئی ہوگی۔ باہر سی ٹی کیمرہ لگا ہوا

ہے۔ مانیٹر پر جو بھی ہوگا اس نے ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔“

”ہاں یہ خطرہ موجود ہے۔“ وسیم نے جواب میں کہا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک ساتھ پانچ آدمی باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا باقی روایتی ہتھیار بدست تھے۔ تبھی عقب میں پھر پیروں کی چاپ گونجی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو دو بندے تھے۔ ایک نے گن تھام رکھی تھی دوسرا خالی ہاتھ تھا۔ وہ باہر سے اندر آرہے تھے۔ گویا ہم دونوں طرف سے گھر کر اس گلیارے میں محصور ہو چکے تھے۔

”اب کیا کیا جائے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”جیسے ہی اشارہ کروں تم دونوں پستول والے کو سنبھال لینا باقی کو دیکھ لیا جائے گا۔“ میں نے کہا۔

نو واردوں نے گھیرا جگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہم بھی اپنے دفاع کے لیے تیار تھے اور پوزیشن لے چکے تھے۔ تبھی میں نے اشارہ دیا اور دونوں پیروں کو جوڑ کر اچھال بھری۔ فلائنگ کلک بروقت مگر شدت کے ساتھ پستول والے کے برابر میں کھڑے شخص کے سینے پر پڑی۔ کلک ایسی تھی کہ زندہ کو بھی مردے میں بدل دے۔ اتنی زوردار کہ دیوار پر پڑتی تو وہ بھی چٹخ جاتی۔ مقابل پیٹھ کے بل زمین پر گرا۔ میں نے گرتے گرتے کمال پھرتی سے اپنا داہنا ہاتھ پستول والے کے ہاتھ پر مارا تھا نتیجتاً اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ چکنے فرش پر پستول گرا تو پھسلتا ہوا کافی دور چلا گیا۔ میرے ساتھ ہی سفیر نے بھی بوٹ کی بھر پور کلک اپنے مقابل کے ہاتھ پر ماری تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ اپنے ہولسٹر سے پستول نکال رہا تھا۔ بروقت کلک لگی تھی اور اس کے ہاتھ سے بھی پستول نکل کر دور جا گرا تھا تبھی مجھے کھٹ کی آواز سنائی دی یہ آواز سفیر کے سر سے ابھری تھی۔ ڈنڈا اٹھائے شخص نے ڈنڈا چلا دیا تھا۔ سفیر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا تبھی وسیم نے اس شخص کی کپٹنی پر گھونسا رسید کیا جو اپنے ہاتھ میں کھانا خنجر لیے کھڑا تھا۔ وہ شخص کسی لڑاکا مرغ کی طرح بازو پھیلائے آگے بڑھ رہا تھا مگر گھونسا پڑتے ہی سلوموشن میں زمین پر گرتا چلا گیا تھا۔ وسیم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور مقابل کے سینے پر فلائنگ کلک ماری تھی۔ کلک مارنے کے چکر میں وہ پیٹھ کے بل گرا تھا مگر برق رفتاری سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ٹرینڈ لڑاکا تھا اس کے ہاتھ اور پیر دونوں چل رہے تھے۔ اس کا نپا تلا گھونسا کسی کے سینے پر پڑتا تو کسی کے چہرے پر لات پڑتی۔ اس کے اس جارحانہ موڈ کو دیکھ کر پانچوں نے ایک ساتھ حملہ کیا۔ اس کی مدد کے لیے شمشاد اور میں بڑھ آئے پھر ہم سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔

اب عالم یہ تھا کہ کس کی لات کسے لگی اور کس کا گھونسا کہاں پڑا خود مارنے والے کو بھی پتا نہ تھا۔ بس ہم سب بھڑے ہوئے تھے۔ ہتھیار کب کے کہاں پھینک چکے تھے کسی کو خبر نہ تھی۔ ایسی اندھی لڑائی کا نتیجہ توقع کے برعکس ہی نکلتا ہے اس لیے میں نے آہستہ آہستہ پیچھے کھسکنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ ہمارے دونوں مقابل بھی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ یہ بات سفیر سے چھپی نہ رہ سکی اس نے بھی میری تقلید کی اور وہ بھی پیچھے ہٹنے لگا۔ کچھ پیچھے ہٹتے ہی یکایک اس نے خود کو زمین پر گرایا اور تیزی سے پھسلتا ہوا اپنے مقابل کی ناگوں سے جا بکرایا وہ دونوں اس اچانک آئی افتاد پر سنبھل نہ سکے اور پیچھے کی طرف گرتے چلے گئے۔ خود بھی گرے اور سنبھلنے کی کوشش میں اپنے دوستاتھیوں کو بھی لے کرے۔

گرے ہوئے دشمن پر وار کرنا بزدلی ہے مگر جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ سفیر اور وسیم نے ان تینوں پر ٹھوکریں برسانا شروع کر دیں ساتھ ہی ساتھ وہ دونوں باقی تینوں جو کھڑے تھے ان کے حملوں سے بھی خود کو بچا رہے تھے۔ اس وقت سفیر کا چہرہ کچھ ایسا ہورہا تھا کہ دیکھنے والا خوفزدہ ہو جاتا۔ ڈنڈے کے ضرب نے سر پر زخم بنا دیا تھا جس سے نکلنے والا خون چہرے پر لکیریں بنا گیا تھا۔ لیکن سفیر کو خون بہنے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اسی دم خیم سے مقابلے میں ڈٹا ہوا تھا۔ ہم بھی پوری طرح مصروف تھے۔

اب مجھے اور وسیم کو سہ طرفہ وار کرنا پڑ رہے تھے۔ کبھی ہم پیروں کا استعمال کرتے تو کبھی گھونوں کا۔ ہم تھک چکے تھے اور مقابل کے گھونوں اور لاتوں کی چوٹ کا اثر بھی محسوس کر رہے تھے۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا مگر یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ ذرا سی بھی سستی دکھاتے تو مقابل موت کی نیند سلا دیتے اسی لیے ہم تینوں اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کر رہے تھے تبھی میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے سفیر کو زمین پر گرا دیا ہے اور اس کا گلابانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ تو پہلے ہی سر پر پڑنے والی ضرب سے زخمی تھا اس لیے کچھ کمزور پڑ رہا تھا۔

یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں تماشائی بنا رہتا۔ میں جانتا تھا کہ سفیر ذہنی طور پر بہت قوی ہے، بڑے سے بڑے گنجلک مسئلے کو منٹوں میں حل کر لیتا ہے مگر زخمی حالت میں ہاتھ پیر چلانے میں، قوت کا مظاہرہ کرنے میں اس وقت ذرا پیچھے ہے۔ جذبات میں آکر وہ دشمنوں سے ٹکراتو گیا ہے مگر اس حالت میں وہ کمزور ہی ثابت ہوگا۔ جس طرح سے دشمن اس کا گلابا رہا تھا وہ زندہ نہیں بچے گا۔ اسے بچانے کے لیے میں اپنی جگہ سے اچھلا اور سیدھا اس دشمن پر جا پڑا جو اس کے سینے پر سوار تھا۔

میری کھڑی لات کھا کر وہ دور جا گرا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ میں نے سامنے سے ایک اور لات ماری تھی۔ میری لات اس کی پیٹھ پر پڑی تھی۔ لات ایسی زبردست تھی کہ وہ کھڑا نہ رہ سکا اور چیختے ہوئے بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی چیخ میں کرب تھا اور اب وہ بن پانی کی مچھلی بن چکا تھا۔ میں نے لات ہی پر اکتفا نہیں کیا پے درپے کئی گھونے بھی مارے تھے۔ اس کا نتیجہ بھی جلد سامنے آ گیا۔ وہ بے ہوش ہو کر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا۔ اب ہم تینوں کے مقابلے میں پانچ آدمی تھے۔

”کھیل لمبا ہو رہا ہے۔“ میں نے مقابل پر گھونے برساتے ہوئے کہا۔ تبھی میری نظر سفیر پر پڑی۔ وہ پھر دو آدمیوں میں گھر چکا تھا۔ دشمنوں نے تاڑ لیا تھا کہ سفیر زخمی ہے۔ ان کا مقابلہ نہیں کر پار رہا ہے۔ اسی لیے لگا تار پٹ رہا ہے۔

میں نے اپنے مقابل کی ناک پر ایک زوردار گھونسا مارا اور لمبی چھلانگ لگا کر سفیر کے قریب پہنچ گیا پھر داہنے پیر پر وزن ڈال کر بائیں پیر کو سیدھا کر دیا تھا اور پھر کی طرح گھوم گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس کے بدن پر لات پڑی تھی وہ اچھل کر وسیم کے مقابل پر جا گرا تھا۔ وسیم نے لگے ہاتھوں اسے بھی سمیٹ لیا تھا ایک ساتھ دو لاتیں رسید کر دی تھیں۔ سفیر جو زمین پر گر چکا تھا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تبھی اس کی نظر وہیں پڑے پستول پر پڑی اور اس نے پھرتی سے اسے اٹھا لیا۔ وہ پستول اٹھا کر کھڑا ہونا چاہتا تھا اور ابھی ہتھکڑی کا زاویہ بنا رہا تھا کہ اسی وقت اس کی کمر پر ایک قوی ہیکل شخص کی گرز جیسی لات پڑی اور وہ پھر سے زمین بوس ہو گیا۔ اسے پٹنے دیکھ کر شمشاد کو تاؤ آ گیا اور اس نے دوبارہ اچھال بھری اور اس شخص پر جا پڑا جس نے سفیر پر حملہ کیا تھا۔ اس

نے ساتھ ہی ساتھ اس شخص کے جڑے پر پوری طاقت سے گھونسا مارا تھا۔ گھونسا اتنا شدید تھا کہ وہ لڑکھڑا کر سفیر پر جا گرا تھا۔ سفیر نے سنبھلنے کے نام پر صرف اتنا کیا کہ ہاتھ اٹھا دیا اور گولی داغ دی۔ فائر اتنے نزدیک سے ہوا تھا نتیجہ بھی خاطر خواہ نکلا اس شخص کی کھوپڑی پر نچے میں بدل گئی تھی اور اس کا دماغ دور دور تک بکھر گیا تھا۔

گولی کے سماعت شکن شور نے سب کو چونکا دیا تھا۔ لڑائی رک گئی تھی کہ سفیر نے ایک دوسرے شخص کا نشانہ لیا اس نے پستول کی نال اپنی طرف آتے دیکھ عجیب حرکت کی۔ وہ پھرتی سے زمین پر گر اور پھر پھسلنے کے انداز میں زمین پر لوٹ لگاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ سفیر اگر چاہتا تو اسے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا اور وہ بندہ کمرے سے بہ آسانی باہر نکل گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے باہر بھاگنے کا چانس خود سفیر نے دیا ہے۔ اب وہاں صرف تین آدمی بچے تھے جو سکتے کے عالم میں کھڑے تھے کہ سفیر نے ان کو نشانہ بنانے کے لیے پستول سیدھا کیا۔ پستول کی نال اپنی طرف اٹھتے ہی وہ تیزی سے گلیارے میں دوڑ گئے۔ کمر بالکل خالی ہو گیا تھا۔

”خس کم جہاں پاک۔“ وسیم نے کہا۔ ”مگر اصل مجرم تو ہاتھ ہی نہیں آیا۔ اب کیا کیا جائے؟“

”کرنا کیا ہے عبداللہ کو تلاش کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن یہ بھی خیال رہے کہ فرار ہونے والے نئی کمک لے کر آ سکتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بھاگنے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ اس لیے کہ ان کے لڑنے کا انداز بتا

رہا تھا کہ وہ سب سڑک چھاپ ہیں۔ ایسے لوگ خواہ مخواہ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالتے۔ جنہوں نے ان کو بلایا ہوگا یہ ان سے کوئی بہانا کر کے اپنی رقم کھری کر لیں گے۔“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

ہم سب سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے رک کر سفیر نے کہا۔ ”وہ جو بے ہوش پڑے ہیں انہیں کیا یونہی چھوڑ دیا جائے؟“

”پھر کیا ان کا اچار ڈالا جائے گا، بے وقوف آدمی وہ کرائے کے ٹٹو ہیں، ہم عبداللہ کی تلاش میں آئے ہیں اسے تلاش کرو۔ باہر ہمارے آدمی پہلے سے موجود ہیں۔ جو لوگ افراتفری میں نکلے ہوں گے وہ ان کی نظروں سے بچ نہیں پائے ہوں گے۔ انہیں ان لوگوں نے سنبھال لیا ہوگا۔“

”شہباز صحیح کہہ رہے ہیں۔“ وسیم بولا۔ ”ہم عبداللہ کو بازیاب کرانے آئے ہیں۔ اسے ڈھونڈیں گے ناکہ

غور و فکر کی کتاب کھول کر بیٹھ جائیں۔ چلو ایک ایک کر کے تمام کمروں کی تلاشی لیتے ہیں۔“

”وسیم نے بالکل صحیح کہا ہے۔ جس شخص نے عبداللہ کو اغوا کیا ہے وہ بھی کوئی اہم بندہ ہے اور اسے تلاش

کرنا ضروری ہے۔ اس عورت کو بھی تلاش کرنا ہے جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مرشد کو دوبارہ سے مستحکم کرنے میں وہ اہم کردار ادا کر رہی ہے۔“ میں نے رائے دی۔

”وہ عورت یہاں ہوگی؟ اس کے گھر کا پتا تو کچھ اور بتایا گیا ہے۔“ وسیم بولا۔

”اس کے بعد اسے ڈھونڈنا ہے۔ وہ جب تک نہیں ملے گی اصل بات کھل کر سامنے نہیں آئے گی کہ یہ

کون لوگ ہیں؟ کیوں مرشد کا ساتھ دے رہے ہیں؟“

”خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں عبداللہ تک پہنچ کر بھی سوچا جاسکتا ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”چلو!“ کہہ کر میں نے پھر سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ایک کے بعد ایک کمروں میں جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کیونکہ اس دن ہم سب بنگلے کی تلاشی اس طرح سے لے رہے تھے جیسے سوئی کھو گئی ہو۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ کہیں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب کہ دو آدمی میرے سامنے اندر کی طرف بھاگے تھے۔ عبد اللہ کو بھی اسی بنگلے میں لایا گیا تھا۔ اتنے سارے لوگ اندر آئے لیکن اب کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ سب گئے کہاں؟ ایسی کون سی خفیہ جگہ ہے جہاں وہ لوگ چھپ کر بیٹھ گئے ہیں؟ میں اسی نکتے پر غور کر رہا تھا کہ لیپ ٹاپ کا خیال آ گیا۔ میں نے وسیم کو مخاطب کیا۔ ”کسی کو باہر بھیج کر لیپ ٹاپ منگوا لو۔“

”یہی مشورہ میں دینے والا تھا۔“ وسیم نے کہا اور پھر ایک بندے کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ہری اپ..... سن لیا نا کہ کیا منگوا یا گیا ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے باہر والے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اب کمرے میں ہم چار ہی آدمی بچ گئے تھے۔ سفیر، وسیم، شمشاد کا ایک ساتھی اور میں۔ تبھی سفیر بولا۔ ”کیا ہم اسی طرح یہاں کھڑے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہیں گے؟“

”نہیں ابھی بھری گائیں گے۔“ وسیم بولے بغیر نہ رہ سکا۔

”نہیں نہیں راگ دہار گانا، تا کہ بارش ہو اور اگر نیچے کوئی تہ خانہ ہو تو اس میں پانی بھر جائے اور اندر والے پانی سے خوفزدہ ہو کر باہر نکل آئیں۔“ سفیر نے سنجیدہ لہجے میں چوٹ کی۔

وسیم کچھ کہتا کہ باہر جانے والا لیپ ٹاپ اٹھائے آ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے لیپ ٹاپ لیا اور اسے آن کر دیا۔ ونڈو کھلی تھی کہ میں نے وسیم کا بتایا ہوا نمبر انٹر کیا۔ اسکرین پر نقشہ ابھر آیا۔ نقشے میں سرخ دائرہ نظر آ گیا۔ عبد اللہ والی چپ فائینڈ ہو گئی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے اس سے چالیس میٹر دور عبد اللہ تھا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں سفیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بنگلے کی دیوار پندرہ سولہ میٹر کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن عبد اللہ کی دوری چالیس میٹر بتا رہی ہے۔ کیا اس دیوار سے اندر جانے کا کوئی راستہ بھی ہے؟“

”مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ وسیم نے جھک کر اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یاد آ رہا ہے کہ عبد اللہ سے اس آواز نے کہا تھا کہ یہ بنگلا جتنا نظر آ رہا ہے اس سے بڑا ہے۔ گویا عقب والی عمارت بھی اس سے جڑی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر انتظار کیا۔ ہم اس خفیہ دروازے کو ڈھونڈتے ہیں۔“ وسیم بولا۔

ہم سب دیواروں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ڈھونڈنے لگے کہ شاید کوئی کلیوٹل جائے۔ نیچے کے تمام کمروں کو چیک کر لیا۔ ایک ایک دیوار کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا مگر ایسا کچھ نظر نہیں آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس بنگلے میں کوئی رہتا ہی نہیں۔ تمام کے تمام خالی کمرے ہمارا منہ چڑھا رہے تھے۔

”یہی کمرے آخری سرے پر ہیں اور عبد اللہ بھی نزدیک ہے۔ لیکن اس تک پہنچا کیسے جائے۔“ سفیر نے کہا۔

ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے کہ شاید کوئی حل بتا دے لیکن سب خاموش تھے۔ تبھی وسیم بولا۔

”عام طور پر لوگ جب بلڈنگ بناتے ہیں تو دوسری عمارت کی دیوار سے کچھ ہٹ کر دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ ایک

بارلان میں نکل کر دیکھنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عمارت کے پیچھے کچھ جگہ چھوڑی ہوئی ہو اور دروازہ باہر کی دیوار میں بنایا گیا ہو۔“

”واقعی اس کی بات کو جانچنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس کا اندازہ صحیح ہو۔“ سفیر نے کہا۔

وسیم کی بات مجھے بھی پسند آئی۔ میں نے باہر والے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ دروازے کے پیچوں بیچ ایک آدمی آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشکوف تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ڈھانٹے سے چھپا رکھا تھا۔ اس نے لکارنے کے انداز میں کہا۔ ”تم سب چاروں طرف سے گھر گئے ہو۔ اپنے اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ منہ دیوار کی طرف ہونا چاہیے۔“

یہ آواز نہیں ہم کا دھماکا تھا۔ کمرے میں موجود تمام افراد چونک گئے تھے۔ اب تک ہم کامیابی کے نشے میں پورے تھے۔ تبھی تو ہم ہر جانب سے غافل ہو چکے تھے، دشمن کے گھر میں کھڑے ہو کر ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ عقلمندی کا تقاضہ تھا کہ ہر طرف نظر رکھتے لیکن سب کے سب بے پروا ہو گئے تھے۔ جس کا نتیجہ بھی سامنے آ گیا تھا۔ اب پچھتانا بیکار تھا۔

اس نے پھر وارنگ دی۔ ”سراٹھا کر روشن دان کی طرف دیکھو۔ ہر طرف سے تم لوگوں کو نشانے پر لے لیا گیا ہے۔“

میں نے اوپر نظر ڈالی تو سکتے میں رہ گیا۔ کمرے میں چار روشن دان تھے اور ہر روشن دان سے نال باہر جھانک رہی تھی۔ اس سے پہلے درجنوں مہم سر کر چکا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک ہی دن اتنے لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بنگلہ صرف لڑائی کے لیے مختص ہو۔ ایک کے بعد ایک پارٹی الجھنے آ جا رہی ہے۔ جب کہ ایک لاش اب بھی ڈرائینگ روم میں پڑی ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نقاب پوش نے کہا:

”اب تو تسلی ہوگئی ہوگی اگر ابھی بھی نہیں ہوئی ہے تو فائر کر کے یقین دلاؤں مگر اس میں تمہارا ایک آدھ آدمی جان سے جائے گا۔“

”اگر ہاتھ سر پر نہ رکھ کر سر پر رکھوں تو کیا پھر بھی تم گولی مارو گے؟“ اس حالت میں بھی وسیم کی بذلہ سخی کم نہیں ہوئی تھی۔

”یہ آخری وارنگ ہے۔ کسی نے کوئی غلط حرکت کی اور اوپر سے گولیاں برسیں۔ اس لیے تعاون کرو۔ میں خود اندر آ رہا ہوں تاکہ تلاشی لے سکوں۔ اس سے پہلے جس کے پاس جو اسلحہ ہے وہ نکال کر زمین پر رکھ دے۔“

مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی انہیں معلوم ہوگا کہ میں ہی شہباز ہوں یہ سیدھے مجھے گولی مار دیں گے۔ شیر جب شکاری کے جال میں پھنستا ہے تو چوہا بن جاتا ہے۔ میں بھی اس وقت چوہا بنا ہوا تھا۔ تبھی وہ اندر آیا۔ ڈھانٹے سے صرف دو آنکھیں نظر آرہی تھیں جن میں نفرت ہی نفرت تھی۔ وہ آگ برساتی نگاہوں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ اس نے چہرہ چھپا کر سمجھا تھا کہ میں اسے پہچان نہیں سکوں گا۔ حالانکہ اس کے نزدیک آتے ہی میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ کیسے آ گیا۔ اس نے مجھے سڑک چھاپ غنڈہ سمجھا تھا تبھی تو رعب جمانے آ گیا تھا۔ اسے شاید علم نہیں تھا کہ میں اپنے شکار کو کبھی بھولتا نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ جس آدمی کے جسم پر پڑتے ہیں، جہاں پڑتے ہیں وہاں کا گداز پن، نشیب و فراز میرے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ شمشاد نے اس گارڈ

کو جب بے ہوش کیا تھا تو میں ایک نظر اسے دیکھنے نزدیک گیا اور اس کی تلاشی لی تھی۔ تبھی تو میں نے اس کے جسم کی بناوٹ سے اسے پہچان لیا تھا اور حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ شاید شمشاد کا ہاتھ ہلکا پڑا تھا یا وہ کچھ زیادہ ہی سخت جان تھا۔ اسی لیے دوبارہ آگیا تھا اور اسلحے کے زور پر اکڑ رہا تھا، تیزی دکھا رہا تھا مگر اس سے بھی تیز میرے ساتھی تھے۔ جیسے ہی وہ سفیر کے نزدیک پہنچا سفیر نے اچھل کر اس کے ہاتھ پر کلک ماری۔ کلاشنکوف چھوٹ کر دور جا گرا۔ یہ بہت بڑی بے وقوفی تھی۔ روشن دان سے انکارے برس سکتے تھے مگر اب سوچنے فکر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وسیم نے بھی سفیر کی تقلید کی اور لڑکھڑاتے اس بھگوڑے کی کمر پر لات ماری۔ اسی کے ساتھ شمشاد نے بھی وزنی گھونسا آزمایا۔

اس کی چیخ گونجی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا شمشاد کے ساتھی کی طرف گیا تھا کہ اس نے بھی کلک چلا دی۔ وہ دوبارہ سے میری طرف آگیا۔ میں نے بھی بہتی لنگا میں ہاتھ دھولیا۔ کھڑی لات اس کے کمر پر ماری۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر سنبھل نہ سکا اور پھر سے سفیر کی طرف چلا گیا۔ سفیر پہلے سے ہی مستعد تھا، اس نے گھٹنے کی قوت آزمائی، سفیر نے اس کے پیٹ پر وار کیا تھا۔ وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سفیر کے گھٹنے کی ضرب سہہ لینا معمولی بات نہیں تھی۔ اسی وقت شمشاد نے آگے بڑھ کر اسے پروفیشنل ریسر کی طرح دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور سر سے بلند کر کے کچھ توقف کیا اور پھر پوری قوت سے اسے زمین پر دے مارا۔ وہ مری ہوئی چھپکلی کی طرح زمین پر بکھر گیا تھا۔ اس معرکہ کے دوران میں بھی میری توجہ روشندان کی طرف تھی۔ اس سے جھانکتی ہوئی نالوں کی طرف تھی۔ میں منتظر تھا کہ ادھر سے کب فارز آتا ہے مگر حیرت کی بات تھی کہ بیرل میں ذرا بھی ارتعاش پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہلکی سی بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے فٹ کر کے چھوڑ دیا گیا ہو۔ ان کا بندہ اس بری طرح پٹ رہا ہے پھر بھی وہ فارز نہیں کر رہے۔ یہ کیسے نشا چنچیں ہیں جو اپنے ساتھی کی بھی مدد نہیں کر رہے ہیں۔ سفیر اور وسیم کی پوری توجہ اس بے ہوش بندے پر تھی اس لیے میں نے سوچا کہ باہر جا کر روشندان پر بیٹھے بندوں کو دیکھ آؤں۔

باہر آ کر گر بہ پا چلتا ہوا میں بنگلے کے عقب میں پہنچا۔ روشندان اسی طرف کھل رہے تھے۔ عقب میں پہنچتے ہی میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اندر بے ہوش پڑے شخص پر مجھے ہنسی آنے لگی۔ اس نے غضب کی چالاکی دکھائی تھی۔ اس نے چاروں روشندان میں رائفلز نکال کر یہ پوز دیا تھا کہ باہر بہت سارے لوگ ہیں۔ جب کہ باہر ایک بھی شخص نہیں تھا۔ اندر واپس آ کر میں نے کہا۔ ”اس بے ہوش شخص کو باندھ کر ایک طرف ڈال دو اور چلو عقب میں ایک گلی نظر آئی ہے اس میں دیکھتے ہیں کہ وہ کہاں ختم ہو رہی ہے۔“

وسیم نے فوراً ایک بیڈ کی چادر اتاری اور اسے درمیان سے پھاڑ کر رے جیسی شکل دی اور اس سے اس بندے کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگا۔ اس کام سے فرصت پا کر ہم سب باہر آ گئے۔

”اتنی سی دیر میں ہم نے خوب مقابلہ کیا ہے۔ شاید یہ زندگی کا ایسا مشن ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ کی پناہ۔ اتنے لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔“ وسیم نے کہا۔

”کیوں، وادی میں جب سامیرا کی مدد کے لیے ہم جنگ میں کودے تھے اس دن ایسا موقع کئی بار نہیں آیا تھا۔“ سفیر نے جواب دیا۔

”وہ جنگ تھی۔ دو بڑی قوتوں کے درمیان ایک جنگی منظر تھا۔ اس کی بات دیگر ہے۔“ وسیم اپنی بات پر اڑا رہا۔

”تم لوگ ایسے مطمئن ہو جیسے گھر میں بیٹھے ہو۔ یہ نہ بھولو کہ یہ دشمنوں کا گھر ہے۔ کئی لوگ میدان چھوڑ کر بھاگے بھی ہیں۔ وہ جتھا بنا کر پھر سے مقابلے پر آسکتے ہیں۔“ میں نے ٹوکا۔

”آپ کہتے ہیں تو میں ان باتوں کو بھلا دیتا ہوں اور سنجیدگی سے عبداللہ کو تلاش کرنے میں عقل صرف کرتا ہوں۔ اب تو خوش؟“ وسیم نے ہنس کر کہا۔

اتنی دیر میں ہم بنگلے کے عقب میں پہنچ چکے تھے۔ دو عمارتوں کے درمیان ایک گلی سی موجود تھی لیکن دیوار میں کوئی در نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر وسیم پھر بولا۔ ”اب ایسا کرتے ہیں کہ دیوار کو گرا کر دیکھتے ہیں کہ اس کے پیچھے تو کوئی دروازہ نہیں ہے۔“

میں نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ادھر دیکھو، عبداللہ کی جیب میں جو چپ ہے اس کے سگنل دیوار کے پیچھے سے آرہے ہیں۔ یعنی وہ ادھر موجود ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ دیوار کی دوسری جانب جو بنگلا ہے اس کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہے۔“

سفیر نے اسکرین کو دیکھ کر کہا، ”بات تو صحیح ہے۔ وہ داخل اس بنگلے میں ہوا اور اب سگنل ادھر سے آرہے ہیں تو اسے کسی خفیہ دروازے سے ادھر پہنچایا گیا ہے۔“

”اس لیے ہمیں نئے سرے سے اس دروازے کو ڈھونڈنا پڑے گا۔“

”ہر کمرے کی دیوار کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا۔ کسی دیوار میں ایسا کچھ نظر نہیں آیا جسے دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ وہاں کوئی دروازہ ہے۔“ وسیم نے جواب میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم غلط رخ پر سوچ رہے ہیں۔ دیواروں میں تلاش کر رہے ہیں۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ راستہ سرنگ میں ہو؟“ میں نے اپنا خیال پیش کیا۔

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ چلو اب کمرے کی زمین کو بھی ٹھونک بجالیں۔ اس لیے کہ عبداللہ کو کمرے میں لایا گیا۔ پھر اسے آگے لے جایا گیا۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ سرنگ اگر ہے تو کسی تہ خانے سے ہے۔“ وسیم نے کہا اور مڑ گیا۔

ہم سب لوٹ کر پھر ڈرائیونگ روم میں آگئے اور کارپٹ الٹ کر ڈرائیونگ روم کے فرش کا معائنہ کرنے لگے۔ اس فرش میں ایسا کچھ نہیں ملا۔ اس کے بعد دوسرے اور پھر تیسرے کمرے کے فرش کو دیکھا لیکن ناکامی مقدر رہی۔ پھر ہم سب سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں اوپر والی منزل کو جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے کے حصے کو دیوار اٹھا کر چھوئے کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ عام طور پر ایسی جگہ پانی چڑھانے کی موٹر کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہے۔ پہلے میں نے بھی یہی سمجھا تھا اس لیے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس بار میں نے سیدھے جا کر اس کے چھوئے سے دروازے کو کھولنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ کھلتا چلا گیا۔ اندر جھانکتے ہی وسیم نے نعرہ لگایا۔ ”اسے کہتے ہیں، بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔“

اس کمرے کے درمیان فرش سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اندر جھانکتے ہی سیڑھیاں نظر آگئیں۔ لگتا ہے کہ

بعد میں جو دو آدمی میدان چھوڑ کر بھاگے تھے انہوں نے جلد بازی میں فرش میں بنا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ نیچے سیڑھیاں سی جا رہی تھیں۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ شمشاد نے سرگوشی میں پوچھا۔

”نیچے اترنا ہے لیکن احتیاط سے۔ پہلے میں اترتا ہوں۔ نیچے جا کر میں سفیر کے موبائل پر مس کال دوں گا تب ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر آپ سب نیچے اتریں گے۔“ انہیں ہدایت دے کر میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ میری نظریں اس دروازے پر لگی ہوئی تھیں جو نیچے، سیڑھیوں کے اختتام پر تھا۔ اس دروازے سے روشنی اندر تک آرہی تھی۔ یقیناً اس کے بعد دوسری طرف والا بنگلا تھا۔ آدھی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد میں نے مس کال دی تاکہ مجھے کور آپ کرنے والا نیچے اترنا شروع کر دے۔

سامنے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس سے باہر آنے والی روشنی اندر تک آرہی تھی۔ میں اسی روشنی کو دیکھ رہا تھا کیونکہ اگر کوئی آتا تو اس کا سایہ نظر آ جاتا۔ آہستہ آہستہ میں نیچے اتر آیا۔ اس دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ سفیر اور اس کے پیچھے ویم نیچے آرہے تھے۔ میں نے گربہ پا چلتے ہوئے ادھر دیکھا۔ وہ کمر بالکل خالی تھا۔ پھر بھی میں اندر داخل نہیں ہوا۔ مجھے سفیر کے آنے کا انتظار تھا۔ ابھی میں اندر جھانک ہی رہا تھا کہ آواز آئی۔ ”خبردار ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ گارڈ کی وردی میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔

میں نے مڑ کر سفیر کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اسی وقت اندر سے پھر آواز آئی۔ ”سنائیں ہے۔“ میں نے ہاتھ اٹھانے کا کہا ہے؟“

میں سمجھ گیا کہ وہ اندھیرے میں تیر چلا رہا ہے۔ اسے مطلق دکھائی نہیں دیا ہے کہ میں کس طرف کھڑا ہوں۔ میں دیوار سے چپک کر کھڑا تھا اور اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دبے قدموں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اسٹین گن کو اس طرح سنبھال رکھا تھا جیسے ابھی فائر کر دے گا۔ اس کے بڑھتے قدم بتا رہے تھے کہ وہ اندازے سے آگے آرہا ہے۔ یعنی کہ اسے ابھی تک یقین نہیں ہے کہ اس جگہ کوئی چھپا ہوا ہے۔ شاید اسے حکم دیا گیا ہوگا کہ اندر آنے والے کو روکے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں بھی خفیہ کیمرہ لگا ہوا ہے جس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ اس خیال نے مجھے مزید ہوشیار کر دیا اور میں دیوار سے بالکل چپک کر کھڑا ہو گیا۔ سفیر بھی ہوشیار ہو گیا تھا۔ نو وارد آگے بڑھتے بڑھتے بالکل نزدیک آ گیا۔ میں اسی وقت کا منتظر تھا۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچا میں نے اس کی اسٹین گن پر ہاتھ ڈال دیا اور ایسا جھٹکا دیا کہ وہ منہ کے بل گرا۔ اسٹین گن اب میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ وہ اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ سفیر نے اسے چھاپ لیا۔ وہ اس کی جگڑ سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اتنی دیر میں ویم بھی نزدیک آ چکا تھا۔ اس نے گارڈ کی گردن پر پیر رکھ کر دبا یا۔ گارڈ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید اس کی سانس رکنے لگی تھی۔ سفیر نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر لگا کر کہا۔ ”اب ہاتھ پیر چلایا تو گردن دب جائے گی۔ اگر مرنا نہیں چاہتے تو خاموش ہو جاؤ۔“

اس نے حالات کی نزاکت سمجھ لی تھی اس لیے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے۔ سفیر نے وہیں پڑے الیکٹریک تار کے ٹوکے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا۔ ”وہ تار اٹھانا۔“

میں نے آگے بڑھ کر تار کو اٹھالیا۔ اس تار سے سفیر نے اس کی مشکیں کیں پھر سیدھا ہو کر بولا۔ ”اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔“

”چلو۔“ کہہ کر میں نے دوسرے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ وسیم نے اس کی شرٹ کو جھٹکے سے کھینچا۔ شرٹ پھٹ کر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے ایک اور جھٹکا دیا۔ پھٹنے والا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس ٹکڑے کو گول کر کے گارڈ کے منہ میں ٹھونس دیا۔ ”اب یہ یہیں آرام کرے گا۔“

ہم اسے وہیں بندھی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھے۔ دروازے کو پار کیا تو سامنے ہی ایک اور دروازہ نظر آیا۔ میں نے اس دروازے کو پار کیا۔ ادھر بھی گلیار نظر آیا۔ اس کمرے کا جائزہ لینے کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ گلیار بالکل سونا پڑا تھا۔ سامنے ہی ایک کیمرا نظر آیا۔ میں نے اسٹین گن کو سیدھا کیا اور کمرے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی کی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ کیمرا بند ہونے سے ہم انہیں نظر نہیں آرہے ہوں گے لیکن وہ اندازہ لگا چکے ہوں کہ ہم گلیارے میں پہنچ چکے ہیں۔ اس لیے میں نے اگلا قدم نہایت احتیاط سے اٹھایا اور بلی کی چال چلتے ہوئے گلیارے میں داخل ہوا۔ گلیارے کے آخری سرے پر ایک اور دروازہ تھا اسے پار کرتے ہی میں نے خود کو ایک بڑے ہال نما کمرے میں پایا۔ اس کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ سفیر نے کمرے میں اڑ سے ہوئے اس ریلو کو نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جس سے اس نے کمرے میں ایک کا بھیجاڑا یا تھا۔ وسیم بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم تینوں آگے بڑھ رہے تھے کہ کمرے میں ایک آواز گونجی۔ ”ویل کم..... مجھے پوری امید تھی کہ شہباز اپنے ساتھی کو چھڑانے ضرور آئے گا۔“

”جب میرے آنے کی امید تھی تو تم چھپ کر کیوں بیٹھے ہو سامنے آؤ تاکہ میں دیکھ سکوں کہ ہو کیسے۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”ضرور ضرور میں سامنے آؤں گا۔ لیکن کیا کروں کہ میری ایک عادت ہے کہ میں فوراً کسی سے نہیں ملتا۔ کیوں کہ سانپ کو ہاتھ میں اٹھانے سے پہلے میں اس کے زہریلے دانت کو توڑ ضرور دیتا ہوں۔“ کسی خفیہ جگہ پر لگے اسپیکر سے آواز آئی۔

”تو پھر دیر کیسی، سامنے آ جاؤ تاکہ میں بھی دیکھ لوں کہ تم میں کتنا زہر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بس ایک قدم آگے بڑھو۔ سامنے والے دروازے سے داخل ہوتے ہی میرے سامنے پہنچ جاؤ گے۔“

شبابش آگے بڑھو۔“

میں نے خود آگے بڑھنے سے پہلے سفیر کو آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھا۔ اس پر کسی نے ڈنڈا چلایا۔ سفیر پہلے سے ہوشیار تھا اس لیے ڈنڈا چلانے والے نے منہ کی کھائی۔ سفیر پھرتی سے آگے بڑھ گیا تھا اس لیے ڈنڈا ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ وہ دوسرا دروازہ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈنڈے والے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وسیم نے اسے مزید آگے کھینچ کر زمین پر گرا دیا اور اس کے سر پر بوٹ کی ٹھوک ماری۔ وہ تمل گیا۔ وسیم نے اسے موقع نہیں دیا اور تابڑ توڑ ٹھوکریں مارنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے وسیم کے پاس چھوڑا اور خود اندر داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں صرف ایک آدمی تھا جس نے اپنے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا مائیک سنبھال رکھا تھا۔ اور اس وقت بالکل خاموش تھا۔ شاید اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ اس کے پیچھے زمین پر عبد اللہ بے ہوشی کی حالت میں پڑا

تھا۔ میں نے ایک نظر میں کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔

”ہاں بھی تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے، لو میں آ گیا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آ تو گئے ہو لیکن جانیں پاؤ گے۔“ مائیک والے نے کہا۔

”مجھے روکے گا کون؟ تم؟“

”ہاں میں تمہیں روکوں گا۔ آج مرشد بھی خوشی سے پھولے نہیں سمائے گا۔“ ابھی اس نے جملہ پورا بھی

نہیں کیا تھا کہ وہ اچھل کر آگے آگرا۔ ایسا ہوا کیسے میں بھی حیران کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ عبد اللہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسے کھڑا ہوتے دیکھ میں نے سمجھ لیا کہ عبد اللہ نے ہاتھ دکھا دیا ہے۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہی پوری قوت سے

اسے دھکا دیا تھا۔ گرنے والا ابھی اٹھنے ہی والا تھا کہ اندر داخل ہو رہے سفیر نے اس کے سر پر ٹھوکر ماری۔ وہ

اٹھتے اٹھتے پھر گر پڑا۔ گرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”اس خوش فہمی نہ رہنا کہ تم مجھ پر قابو پا لو گے۔“

”خوش فہمی میں رہنا تمہاری عادت ہوگی۔ ہم تو خود موابقتے تیار کرتے ہیں۔ اب اپنی خیر مناد۔“ کہتے

ہوئے میں نے اس کے گلے پر اپنا پیر رکھ دیا۔

ابھی میں نے پورا زور بھی ڈالا نہیں تھا کہ میری پنڈلی میں سوئی سی چبھی۔ یہ وار ایسا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے

بھی میں اچھل سا گیا اور اسے اٹھنے کا موقع مل گیا۔ وہ جھپ لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوئے جیسی

کوئی چیز تھی جس سے اس نے میری پنڈلی کو زخمی کیا تھا۔ میں اپنی پنڈلی کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ کھڑا ہو گیا۔

اس نے کھڑے ہونے میں ایسی تیزی دکھائی تھی جس نے خاموش زبان سے کہہ دیا تھا کہ یہ بندہ ٹرینڈ ہے۔

کھڑے ہوتے ہی اس نے پھر اچھال بھری تھی اور دیوار کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ وسیم جو اس کے سب سے قریب

تھا اس نے اسے لپیٹ میں لے کر پھر اچھال بھری تھی۔ اس نے جس انداز میں وسیم کو پکڑا تھا وہ نہایت خطرناک

انداز تھا۔ اپنے داہنے بازو کو اس نے وسیم کے گلے میں پھنسا دیا تھا۔ وسیم بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ اگر زور لگاتا تو

اس کا گلا دبے لگتا۔ سفیر کے ہاتھ میں پستول تھا لیکن وہ فائر نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ گولی وسیم کو لگ سکتی تھی۔ میں

بھی جس پوزیشن میں تھا وہاں سے بھی میں اسے نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ اس شخص کی ایک ایک حرکت بتا رہی تھی کہ

وہ لڑائی بھڑائی کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔ اس طرح کی اپنی پوزیشن رکھی تھی کہ سفیر اور میں پستول رکھتے ہوئے بھی

لاچار تھے۔ اس نے میری بے چارگی کو محسوس کر لیا تھا اسی لیے وہ اٹھلاتے ہوئے بولا۔ ”چلاؤ گولی..... خاموش

کیوں کھڑے ہو۔“

”موقع کی تلاش ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس کی نظریں ہم دونوں پر تکی

ہوئی تھیں۔ سامنے وسیم تھا اس لیے میں کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے داہنے پیر کو آگے بڑھا کر وسیم کے پستول

کو قریب کرنا چاہا تھا۔ اس کوشش میں ایک ذرا سا وہ جھکا تھا کہ میں نے تریچے ہو کر فائر کرنا چاہا اسی وقت کھٹکی

آواز ابھری اور اس کی چیخ کمرے میں گونج اٹھی۔ یہ کام کر دکھایا تھا شمشاد نے۔ پتا نہیں کب وہ اندر آیا تھا اور

ہاتھ میں پکڑے راڈ کو اس کے سر پر بجا دیا تھا۔ اسی پر اس نے بس نہیں کیا تھا۔ دوبارہ ایک اور وار کر بیٹھا تھا۔ وسیم

کو موقع مل گیا تھا اس نے جھکا دے کر خود کو چھڑا لیا تھا اور غصے میں اس پر ٹھڈوں کی بارش کر دی تھی۔ اس وقت

اس کا چہرہ حد درجہ خوفناک ہو گیا تھا۔ سر سے بہنے والے خون سے چہرہ تر ہو رہا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ بار

بار اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وسیم کے ٹھڈے اور شمشاد کے ڈنڈے نے اسے مجبور بنا دیا تھا۔ لگاتار پڑنے والی ضربوں نے اسے زمین پر گرا دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

”ادھر ادھر تلاش کرو۔ کوئی رستی کوئی تار ملے تو لے آؤ۔ اسے باندھنا ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔
سفیر اور وسیم دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ اس لیے کہ عام طور پر کاٹھ کباڑی سیڑھیوں کے نیچے ہی رکھا جاتا ہے۔

عبداللہ جواب تک زمین پر سر پکڑے بیٹھا تھا کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں اس کمبخت نے کون سی دوا انجکٹ کی تھی جس نے جسم کی قوت تک سلب کر لی ہے۔“

”فکر نہ کرو، میں ابھی مونا کو فون کرتا ہوں وہ بات کر دے گی۔ اس کی آواز سنتے ہی تمہارے جسم میں نئی قوت آجائے گی۔“ سفیر نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں مونا الیکٹریکل وار تھا۔ تار میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ چھوٹا ہے لیکن کام چل جائے گا۔ ہاتھ پشت پہ کر کے باندھ دیں۔“
میں نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے باندھ دیئے تاکہ وہ ہوش میں آنے کے بعد کوئی پھٹا کھڑا نہ کر دے۔

”یہاں کل کتنے آدمی تھے؟“ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔
”اس کے علاوہ صرف دو آدمیوں کو دیکھا۔ جب کہ پہلے والے کمرے میں چار پانچ بندے تھے جو وہیں رک گئے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے زیادہ بندے یہاں نہیں تھے۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔
”دو بندوں کو تو ہم نے باہر والے کمرے میں اٹا غفیل کر دیا ہے۔“ وسیم بولا۔
”اندر آتے ہوئے میں نے ایک ہی بندے کو اس کمرے میں بے ہوش پڑے دیکھا ہے۔“ شمشاد نے بتایا۔

”دوسرا اس کمرے میں پڑا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔
”دیکھو کہیں سے پانی مل سکتا ہے یا نہیں۔ اسے ہوش میں لانا بہت ضروری ہے۔“ میں نے اس بے ہوش پڑے شخص کی طرف دیکھ کر کہا۔

عبداللہ نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اس طرف کچن ہے۔ میرے پانی مانگنے پر اسی کمرے سے گارڈ نے پانی لا کر دیا تھا۔“

وسیم اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں جگ تھا۔ میں نے جگ لے کر اس سے چلو میں پانی اٹھایا اور اسے اس بندے کے چہرے پر چھینٹا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اسے آنکھیں کھولتے دیکھ وسیم نے کہا۔ ”بھائی میاں، کافی دیر ہو چکی ہے ہمیں واپس بھی جانا ہے۔“

جواب میں اس نے غصیلی نظروں سے وسیم کو دیکھا۔

”ایسے تو نہ دیکھو۔ میں مزدور دل ہوں، کہیں بے ہوش ہو کر گر نہ جاؤں۔“ وسیم نے مسکراتے ہوئے

جواب دیا۔

”تم کون ہو، مجھے صرف اتنا معلوم کرنا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”اس لیے کہ تمہارے بازو پر میں نے سواستک کا نشان گدا ہوا دیکھا ہے۔ ایسے نیو مسلمان نہیں بنواتے۔“

”تم خود پتا کر لو کہ میں کون ہوں۔“ اس نے اس حالت میں بھی مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

”عجب ڈھیٹ ہڈی ہے۔“ وسیم بولا۔ ”ابھی اس کا پیٹ بھرا نہیں ہے۔ میں نے اس کمرے میں ایک پلاس دیکھا تھا۔ وہ لے کر آتا ہوں۔ بغیر سبق پڑھے یہ کچھ بتائے گا نہیں۔“

”اس پوری عمارت میں ایک چبٹا تک نہیں ہے۔ تم نے پلاس کہاں سے دیکھ لیا۔“ وہ اس طرح بولا جیسے ہم دوستانہ ماحول میں بیٹھے کپ لگا رہے ہیں۔

”تم کون ہو۔ تمہاری حقیقت کیا ہے۔ یہ بعد میں بھی معلوم کر لوں گا۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ مرشد کہاں ہے؟“ میں نے اس کی ہٹ دھرمی کو نظر انداز کر کے کہا۔ ٹیوڈیکھنے کے بعد میرے اندر ایک عجیب سا غصہ ابھرا آیا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ کوئی بڑا کھیل کھیلنے کے لیے وطن عزیز میں داخل ہوا ہے۔ ایسے کسی شخص پر میں رحم کر ہی نہیں سکتا جو میرے وطن کے خلاف سازش کر رہا ہو پھر بھی میں خود کو سنبھالے رہا۔

”اگر میں نہ بتاؤں تو؟“ وہ گویا اپنی بات پر جم گیا تھا۔ ”تم نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے کہ اتنی بڑی گوٹ میرے پاس ہے، اس کے بارے میں بتا دوں گا تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے نہیں، کبھی نہیں وہ کہاں ہے اس کے بارے میں صرف میں جانتا ہوں مجھے مار دو گے تو اسے کیسے حاصل کرو گے؟ میں تو نہیں بتاؤں گا۔“ اس شخص نے ہٹ دھرمی دکھائی۔

”بتائے گا تو تیرا باپ بھی۔“ وسیم نے اس کی پیٹھ پر دھپ جھاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت سفیر نے اچھل کر اس کے پیر کی انگلیوں پر جوتے رکھ کر مسل دیا تھا۔

”میں کوئی سڑک چھاپ غنڈا نہیں جو ایک دو طمانچے پڑتے ہی فر فر بولنے لگے۔“ وہ داہنے پیر کو پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس اذیت کو کبھی برداشت نہ کر پاتا۔

”تمہارے بازو پر سواستک کا نشان دیکھنے کے بعد میرے دل میں تمہارے لیے ذرا بھی ہمدردی بچی نہیں ہے۔“

”تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے ہمدردی کرو۔“

”اسے میں اپنے طور پر سمجھاتا ہوں۔“ کہہ کر سفیر نے پستول نکال لیا۔

”لاؤ پستول مجھے دو۔“ میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”یہ لو۔“ سفیر نے جلدی سے پستول آگے بڑھا دیا۔ میں نے پستول تھام لیا۔

”ہاں اب بولو۔“ میں نے اس کے پیر پر فائر کر کے کہا۔ اس کے پیر سے خون کا فوارہ نکل رہا تھا مگر اکڑ کم نہیں ہوئی تھی۔

”نہیں بتاؤں گا۔“ وہ ڈھیٹ بن کر بولا۔

”اس بار میں تمہارے بازو پر فائر کر دوں گا جلدی بولو۔“

”نہیں بتاؤں گا۔“ وہ ہڈیانی انداز میں چیخا۔

”لو اپنے ہاتھ سے بھی محروم ہو جاؤ۔“ کہہ کر میں نے اس کے دائیں بازو پر فائر کیا۔ مجھے اس پر ذرا رحم نہیں آ رہا تھا۔

”بول دے بھئی کیوں اپنی جان کا دشمن بن رہا ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”اسے صرف مرشد سے مطلب ہے۔ اس کی تجھ سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے پھر کیوں اپنی جان کا دشمن بن رہا ہے۔“

”لے تیرا دوسرا ہاتھ بھی گیا۔“ کہہ کر میں نے اس کے بائیں بازو پر گولی چلا دی واقعی وہ فولادی اعصاب کا انسان تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک مر چکا ہوتا۔ اس کے جسم سے جس قدر خون گر چکا تھا وہ کسی بھی انسان کو ڈھیر کرنے کے لیے کافی تھا لیکن وہ اب بھی بیٹھا تھا۔ کرب اس کے چہرے سے عیاں تھا مگر زبان خاموش تھی۔

”بول اب بھی وقت ہے ورنہ اس بار میں تیری پسلی میں گولی ماروں گا۔“

”بتانا ہوں۔“ اس نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ ”وہ اب خانقاہ میں نہیں ہے۔“

”کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شہر والے بنگلے میں۔“ اس نے کہا۔

شہر والا بنگلا کہاں ہے یہ مجھے معلوم تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ ”اگر میں چاہوں تو تجھے ختم کر دوں مگر میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔ تو سسک سسک کر مرے گا۔ یہی تیرا انعام ہے۔“ کہہ کر میں نے اس کے پیر کے قریب گولی چلا دی۔ اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

دہشت کی علامت کہلانے والا کچھوے کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن اس کی آہ وزاری سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا میں نے سفیر سے کہا۔ ”اب باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرو۔ ہم نے کافی وقت برباد کر لیا ہے۔“

”ہمارے بندے تو اُس گیٹ پر ہوں گے اگر ہم اس بنگلے کے گیٹ سے نکلے تو کافی لمبا چکر لگا کر ادھر جانا ہو گا۔“ وسیم بولا۔

”ادھر والے بنگلے سے باہر نکلے تو کوئی پریشانی گلے پڑ سکتی ہے۔ اس لیے کہ ہم کافی دیر سے اندر ہیں۔ باہر کی کوئی خبر نہیں۔ اندر اتنی گولیاں چلی ہیں۔ دھماکے کی آواز باہر تک گئی ہوگی۔ اس لیے رسک لینا مناسب نہیں ہے۔ اسی بنگلے کے گیٹ سے باہر نکلو۔“ میں نے کہا۔

”اور اندر جو دو بے ہوش بندے پڑے ہیں، ان کا کیا کرنا ہے؟“ شمشاد نے پوچھا۔

”وہ دونوں کرائے کے ٹنڈے ہیں۔ اسی طرح خالی گھر میں پڑے رہیں۔ جب اس بندے کی لاش سڑے گی تو بدبو پھیلے گی۔ کوئی نہ کوئی پولیس کو خبر دے گا۔ پولیس آئے گی تو انہیں بھی رہائی مل جائے گی۔ ان کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ بندھے پڑے رہیں۔ بھوک پیاس کی اذیت برداشت کریں۔“ میں نے کہا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جو باہر کھلتا تھا۔

اس دروازے کو کھولتے ہی سامنے بڑا سالان نظر آیا۔ اسے پار کر کے ہم گیٹ پر پہنچے۔ گیٹ مقفل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہو کہ یہ بنگلا خالی پڑا ہے۔ پہلے دیوار پھلانگ کر میں باہر نکلا۔ پوری گلی سنسان پڑی تھی۔ میں نے باقی لوگوں کو بھی باہر آ جانے کو کہا۔ ایک کے بعد ایک سب باہر نکل آئے۔

باہر آکر ہم سب ٹہلنے کے انداز میں گلی کے موڑ کی طرف چلنے لگے۔ اس گلی میں چھ بنگلے تھے اور کسی بھی بنگلے کا گیٹ کھلا ہوا نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پورے علاقے میں کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ اگر مکانوں میں روشنی نہ ہو رہی ہوتی تو ہم بھی یہی سمجھتے کہ علاقہ ویران ہے۔

گھوم کر جب ہم اپنی گاڑیوں تک پہنچے تو پہرے پر مستعد افراد اپنی جگہ موجود تھے۔ ان کے قریب پہنچ کر میں نے پوچھا۔ ”کوئی ہلچل، کوئی نئی بات؟“

”جی نہیں۔ اتنی دیر میں صرف ایک بنگلے میں ایک کار آئی ہے۔ کوئی بنگلے سے باہر تک نہیں نکلا ہے۔ عجیب لوگ ہیں یہاں کے۔“

ہم لوگ بھی اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ اس وقت بھی میرے دل میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت امنڈ رہی تھی جسے ہم اذیت دے کر مرتے ہوئے چھوڑ آئے تھے۔ سواستک کا نشان بتا چکا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ نشان کٹر ہندو ہی اپنے جسم پر گدواتے ہیں۔ مسلمان تو اسے ناپاک نشان سمجھتے ہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی برے کام کا انجام اتنا ہی برا ہوتا ہے یہ دیکھنے کے لیے بھی ہم نہ رکے۔ وہاں سے سیدھے اپنے بنگلے پر آ گئے۔

ہمارے اندازے سے پہلے ہی پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔ اگلے دن کے اخبارات نے شہ سرخیاں لگائی تھیں سب کا خیال تھا کہ اتنی بڑی واردات کسی خاص مقصد کے لیے کی گئی ہے۔ قیاس آرائیاں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ سفیر نے اخبار پڑھتے پڑھتے رک کر کہا۔ ”شہباز اب تمہارے گرد خطرات کا گھیرا مزید تنگ ہو گیا ہے اب تک تو صرف مرشد سے مقابلہ تھا مگر اب تمہیں دو طرفہ خطرہ ہے۔“

”دو طرفہ خطرہ؟ میں سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو کہ خفیہ محکمے کے پاس تمہاری فائل نہیں ہوگی؟ جسے زخمی کر آئے ہو وہ سفارتی اہل کار ہے۔ یعنی یہ بہت بڑی واردات ہے۔ اتنی بڑی واردات کے بعد پورا محکمہ ہل کر رہ جائے گا نتیجتاً محکمے والے تم تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کریں گے۔“

”مجھے کسی کی پروا نہیں ہے بس مجھے مرشد مل جائے میں یہی چاہتا ہوں۔“

ابھی ہم باتوں میں مشغول تھے کہ باہر کسی کے چیخنے کی آواز آئی ہم چونک گئے سفیر اٹھ کر باہر کی طرف دوڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ ابھی ہم صدر دروازے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور میں نے خود کو پھرتی سے نیچے گرا لیا تب مجھے احساس ہوا کہ گولیاں اندر نہیں باہر چل رہی ہیں۔ سفیر دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک گیا تھا۔ میں نے وہیں سے پوچھا۔ ”کیا ہوا سفیر؟“

”یلغار، لگتا ہے کسی پارٹی نے ہلہ بول دیا ہے۔“

باہر سے کئی قسم کے ہتھیاروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے گھمسان کا رن پڑا ہو۔ میں سفیر کے پاس پہنچ گیا۔ باہر سفیر کے خاص بندے پہرے پر موجود تھے لگتا تھا مقابلہ انہی سے ہو رہا ہے۔ وسیم نہ جانے کب اندر سے آکر ہمارے پاس کھڑا ہو گیا تھا اس نے لائٹ مین گن لٹکا رکھی تھی۔

”میں باہر جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اتنی جلدی باہر جانا ٹھیک نہیں ہے پہلے معاملے کو سمجھنے دو۔“ میں نے اسے جھڑکا۔ ”یہیں مستعد رہو۔“
 ”اسے تو رکھ لیں۔“ کہہ کر اس نے ایک ریوالور میری طرف بڑھایا۔
 ”میرے پاس اسلحہ ہے۔ میں کبھی نہتا نہیں رہتا۔ نہتا شخص خالی بندوق کی طرح ہے جو کسی کام کی نہیں ہوتی۔“

”یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟“ وسیم نے سفیر سے پوچھا۔
 ”میں ابھی پتا کرتا ہوں۔“ کہہ کر سفیر اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔
 ”ہم نے انہیں مار بھگایا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ تعداد میں چار تھے۔ سفید شیراڈ میں آئے تھے۔ دوزخی ہوئے اور ایک جہنم واصل..... جاتے وقت وہ لاش کو بھی لے گئے ہیں۔“
 ”آؤ کمرے میں چل کر باتیں کریں۔“ کہہ کر سفیر مڑا، میں بھی پیچھے پیچھے بیڈروم میں آ گیا۔ ابھی میں نے صوفے سے پیٹھ ٹکائی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سفیر نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سے کی گئی باتوں کو وہ کچھ دیر تک سنتا رہا پھر ریسیور رکھ کر مڑا اس کے چہرے پر تفکرات کے پرتو تھے۔
 ”کیا بات ہوئی؟ کوئی خاص خبر تھی کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”فون کرنے والا شاید مرشد تھا۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ اس تباہی کا انتقام ہم سے لے گا۔“
 ”انسان جب مرنے پر آمادہ ہو تو پھر موت اس سے پہلو بچاتی ہے اور وہ خود موت بانٹتا ہے۔ میں تو خود ان کے لیے تباہی بنا ہوا ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”مگر دشمن کو کمزور سمجھنا عقلمندی نہیں ہے۔“ سفیر بولا۔
 ”ہاں تمہاری سوچ صحیح ہے۔ یہاں فون آنا بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے کہ دشمن کی نظروں میں یہ بنگلا آچکا ہے۔“ میں نے پُر سوچ انداز میں کہا۔
 ”اس بنگلے میں ہم ہیں، اس کا پتہ لگانا کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں ہے۔ یاد نہیں کہ ایک بندہ آپ کی ریکی کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔“ وسیم بولا۔
 ”اس کے لیے ہمیں سوچنا ہوگا۔“

”کیا سوچیں گے؟ اس جگہ کو چھوڑ دیں؟ کہتے تو کوئی اور جگہ دیکھ لیتے ہیں۔“
 ”ہمیں فوراً بنگلے سے دور ہو جانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”یوں بھی فائرنگ ہوئی ہے۔ پولیس پہنچتی ہی ہوگی۔“

”پھر کہاں رہیں گے؟“ سفیر نے سوال کیا۔
 ”ایسا کرتے ہیں کہ پھر سے ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ مت بھولیں کہ پورے شہر کی پولیس ہماری بوسوگھتی پھر رہی ہوگی۔“ سفیر نے کہا۔
 ”کوئی نئی بات کرو۔ یہ پولیس والے تو ہمیشہ سے ہمارے پیچھے رہے ہیں۔“ وسیم نے جواب دیا۔
 ”یہ بھی ٹھیک کہا مگر اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں ہے۔“
 ”ہم الگ الگ رہیں گے تو دشمن کسی ایک کو پھر اغوا کر لے گا جیسے عبداللہ کو کیا تھا۔“ سفیر نے گفتگو میں

حصہ لیا۔

”ایک کام کرتے ہیں میرے اور عبداللہ کے ہاتھ میں جو گھڑی دیکھ رہے ہو یہ معمولی گھڑی نہیں ہے وائیس ہے۔ اس سے ہم ایک دوسرے سے رابطہ میں رہیں گے۔“ وسیم نے کہا۔

”ٹھہریں گے کسی ہوٹل میں ہی۔ وہ بھی صرف آج کی رات۔ اس لیے کہ صبح تک مرشد کی خبر مل جائے اور تب تک ہمیں دشمنوں سے بچ کر رہنا ہے۔“ عبداللہ نے اپنا خیال پیش کیا۔

”تو کیا میرے لیے تیسری گھڑی کا انتظام کرو گے؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”نہیں، میرا خیال ہے کہ آپ میری گھڑی لے جائیں۔ آگے آگے ہم رہیں گے جس ہوٹل میں ٹھہریں گے اسی ہوٹل میں آپ بھی آ جانا مگر اجنبیوں کی طرح الگ الگ کمرے میں ٹھہرنا۔ اگر ضرورت پڑی تو گھڑی کے ذریعہ رابطہ کر لیں گے۔“ وسیم بولا۔

”تو پھر اٹھ جاؤ۔ ہم ابھی یہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔“ کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔

ہم سب بڑی آسانی سے اس عمارت سے باہر آ گئے۔ باہر ایسے کوئی آثار نہ تھے کہ جس سے پتا چلتا اندر گولیاں چلی ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہی ہمیں ٹیکسی مل گئی اور ہم تینوں اس میں سوار ہو کر چل پڑے۔

یہ سفر بالکل خاموشی سے کٹا اور ہم لوگ بازار پہنچ گئے۔ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے باہر ہم نے ٹیکسی رکوا اور اتر کر ایک ریستورنٹ میں داخل ہو گئے کچھ وقت وہاں گزار کر باہر آئے اور الگ الگ سمت میں چلنے لگے۔ دور جا کر سفیر نے ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا تاکہ باتوں کے دوران وسیم کو موقع مل جائے اور وہ بک ٹیکسی لے لے۔ میں خاموش کھڑا سفیر کو باتیں کرتا ہوا دیکھتا رہا۔

وسیم کے ٹیکسی لیتے ہی سفیر نے ٹیکسی والے کو کسی بڑے ہوٹل میں چلنے کے لیے کہا۔ ٹیکسی چل پڑی ڈرائیور نے ٹیکسی ایک معروف ہوٹل کی روش پر روکی۔ سفیر نے نیچے اتر کر بل ادا کیا اور چند لمحوں بعد وہ میرے ساتھ ہوٹل کے گیٹ سے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔

وہ اشارہ فیملی ہوٹل تھا۔ میں نے سفیر کو باہر رکنے کا اشارہ دیا اور خود کمپاؤنڈ سے گزر کر ہال میں داخل ہو گیا۔ ہال میں بیشتر میزیں آباد تھیں اور لوگ لوازمات سے دل بہلا رہے تھے۔ بائیں جانب کاؤنٹر تھا۔ کاؤ پر ایک آدمی کھڑا کلرک سے باتیں کر رہا تھا۔ شام ہونے کے باوجود اس نے آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک رکھی تھی۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

میں نے ہال کا جائزہ لیا۔ ہلکی سی طائرانہ نظر ڈالی پھر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچنے سے پہلے تاریک شیشوں کی عینک والا وہاں سے ہٹا اور ہال کے آخری سرے پر واقع زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

”حکم سر؟“ کلرک رجسٹر بند کر کے میری طرف متوجہ ہوا۔

”مجھے ڈبل بیڈ کا ایک کمر چاہیے مل جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ کلرک نے سرگھما کر عقب میں لگے کی بورڈ کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ”آپ کس فلو قیام کرنا پسند کریں گے۔“

”کسی بھی فلو پر۔ فرسٹ فلو پر ہو تو کیا بات ہے۔“

”سیکنڈ فلور روم نمبر نو تھری ٹو۔“ کلرک نے رجسٹر کھول کر کہا۔ ”پلیز نام دیتا بتائیں..... شناختی کارڈ دکھائیں۔“

”شناختی کارڈ..... وہ تو میں بریف کیس میں بھول آیا ایک ڈیڑھ گھنٹے میں میرا دوست آجائے گا اسی کی گاڑی میں ہے۔“

”کوئی بات نہیں نام دیتا بتادیں۔ شناختی کارڈ کا نمبر بعد میں لکھوادیتے ہیں گا۔“

میں نے اپنا فرضی نام بتا کر کراچی کا پتا لکھوادیا۔ آمد کے خانے میں کلرک نے کراچی لکھا اور ایڈوانس کرایہ جمع کر کے چابی دے دی پھر اس نے مٹن دبا کر ویٹر کو بلا کر کہا۔ ”صاحب کو روم نمبر نو تھری ٹو میں پہنچا دو۔“ ویٹر نے سر ہلایا اور مجھے ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سیکنڈ فلور پر پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا تالا کھولا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ وہی چشمے والا شخص ایک کمرے سے نکلا اور نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اندر پہنچ کر ویٹر نے خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سر کچھ چاہیے؟“

”نو..... تھوڑی دیر بعد فون پر آرڈر دوں گا۔“

میں نے پرس سے ٹپ کے پیسے نکال کر دیئے۔ وہ سلام کر کے چلا گیا۔ اب مجھے نیچے جا کر گیٹ کے باہر کھڑے سفیر کو اشارہ کرنا تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے کمرے تک آجائے۔ اسی خیال سے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ خود ہی رک گیا۔ مجھے خیال آ گیا تھا کہ سفیر کو وائچ ٹرانسمیٹر پر کال کر کے اپنے کمرے کا نمبر بتا دینا چاہیے۔ اب تک وہ بھی باہر کھڑا انتظار کر رہا ہوگا یا پھر کمرہ حاصل کر کے آرام کر رہا ہوگا۔ اس خیال سے میں نے ہاتھ روم کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ہاتھ روم میں جا کر میں نے گھڑی کی چابی کو باہر کھینچا جو اڑیل کی طرح لمبا ہو گیا تھا پھر میں نے کال کرنے کی کوشش کی مگر اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جلدی سے چابی کو پھر سے اندر کیا اور باہر نکل آیا۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

”کون؟“ میں نے پوچھا

”سرایک منٹ کے لیے دروازہ کھولیں۔“ باہر سے آواز آئی۔

ویٹر ہوگا، سوچ کر میں نے دروازے کی چٹختی گرا دی۔

باہر وہی عینک والا شخص کھڑا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تکلیف کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔“

آپ کے ساتھی آئے نہیں؟“

”جی نہیں۔“

”بس میں دو منٹ لوں گا۔“ کہہ کر وہ زبردستی اندر آ گیا پھر بولا۔ ”جناب آپ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں

گئے؟“

”شناختی کارڈ گاڑی میں رہ گیا ہے۔ میرا ساتھی آتا ہی ہوگا میرا نام پتا آپ نے رجسٹر میں دیکھ لیا ہوگا۔“

”وہ پتا غلط ہے آپ نے جو بلاک نمبر لکھا ہے۔ وہ اس علاقے میں ہے ہی نہیں۔ کراچی میں ہر جگہ بلاک

نمبر نہیں کہیں سیکٹر تو کہیں صرف نمبر چلتا ہے جس علاقے کا نام لکھا ہے وہاں سیکٹر نمبر ہے۔“

میرادل دھک سے رہ گیا پھر بھی خود کو مضبوط قوت ارادی والا ظاہر کرنے کے لیے کہا۔ ”نہیں جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مگر آپ ہیں کون؟“

”میرا تعلق محکمہ خفیہ سے ہے۔“ اس نے کہا۔

”مگر آپ مجھ پر کس قسم کا شک کر رہے ہیں۔“

”شک نہیں یقین ہے۔ تم شہباز کے ساتھیوں میں سے ہو جلدی بتا دو وہ کہاں ہے؟“

”کس شہباز کی بات کر رہے ہیں، میں کسی شہباز کو نہیں جانتا؟“

”ابھی جان جاؤ گے سیدھے کھڑے رہو۔“ کہہ کر اس نے جھٹکے سے ریوالور نکال لیا۔ اب میں بے بس ہو چکا تھا۔

”دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے دوسرا حکم دیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھادیئے تھے مگر نظریں نو وارد پر جمی ہوئی تھیں۔ میں کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھا۔ نو وارد نے بائیں ہاتھ سے ریسیور اٹھا کر ٹیبل پر رکھا اور اسی ہاتھ سے نمبر ملانے لگا۔ نمبر ملا کر اس نے بائیں ہاتھ سے ہی ریسیور اٹھا لیا اور ماؤتھ پیس میں بولا۔ ”سر میں امجد بول رہا ہوں، ہوٹل میں ایک مشکوک آدمی نظر آیا ہے۔ اس کے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں ہے۔ جی ہاں مگر وہ اکیلا ہے۔ شاید ساتھی کسی دوسرے ہوٹل میں چلا گیا ہوگا۔۔۔۔۔ نہیں ابھی تک اس نے کچھ نہیں قبول کیا ہے۔ ٹھیک ہے میں شیم کا انتظار کر لوں گا۔“ پھر اس نے رابطہ منقطع کر کے مجھ سے کہا۔ ”دیکھو مسٹر شرافت سے سیدھی طرح بتا دو شہباز کہاں ہے؟“

”میں نے کہا ناں کہ میں کسی شہباز کو نہیں جانتا۔“

”میرا ساتھی آجائے پھر میں ہیڈ کوارٹر لے جا کر پوچھوں گا۔“ اس نے رعونت سے کہا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس ہوٹل میں اس طرح غنڈہ گردی ہوتی ہے تو میں یہاں کبھی نہ آتا۔“

”تم کسی بھی ہوٹل میں جاتے میرے آدمی تلاش کر لیتے۔ یہاں ہر ہوٹل میں ہمارے آدمی کھڑے ہیں

ایک ایک مسافر کو چیک کر رہے ہیں۔“

”تم میری بات پر یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں ایک سیدھا سادا بزنس مین ہوں۔“

”اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ تو میں یقین کر لوں گا۔“

”کیا ڈرائیونگ لائسنس سے کام نہیں چلے گا۔“

”ہاں وہی دکھاؤ۔“

”میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہے کہو تو دکھاؤں۔“

”خبردار“ وہ غرایا۔ ”کوٹ میں ہاتھ مت ڈالنا۔“

وہ ریوالور اٹھائے آگے بڑھا پھر اس نے میرے کوٹ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ میں نے ہاتھ دکھا دیا۔

میرے مقابل کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ریوالور کی نال سینے پر لگی رہنے کے باوجود میں رسک

لے لوں گا جیسے ہی اس نے میرے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا میں نے گھٹنا چلا دیا تھا۔ نپا تلا وار اس کے پیٹ

کے نچلے حصے پر پڑا تھا اس نازک حصے پر چوٹ لگتے ہی وہ درد سے کراہتا ہوا بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے اس کے ریوالتور پر ہاتھ مارا۔ ریوالتور ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ سکا تھا کہ میں نے پوری قوت سے اس کے سر پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیخ کر گر پڑا تھا۔ میں نے موقع ضائع نہیں کیا اور ریوالتور پر چھینٹا تھا۔ میں ریوالتور اٹھا کر پلٹا ہی تھا کہ اس شخص نے سنبھل کر مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی۔ میرے ہاتھ سے ریوالتور چھوٹ گیا تھا۔ اس شخص نے مجھے دبوچنے کی بھرپور کوشش کی مگر میں نے اس کے جبرے پر مکارسید کر دیا تھا۔ وہ کراہتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا تو میں نے اچھل کر اس کے پیٹ پر ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ شخص درد سے ڈکراتا ہوا دونوں ہاتھ سے پیٹ دبائے جھکا ہی تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ایک اور گھونسا دے مارا۔ وہ سیدھا ہوا اور پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا جا کر اگر جلد ہی سنبھل گیا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔

میں نے پھرتی سے دونوں بازو دراز کر کے اسے ہاتھوں پر روکا اور دوسرے ہی لمحے اس کی ناک پر مکارسید کر دیا وہ شخص درد سے بلبلاتا ہوا اور پیچھے ہٹتے ہوئے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر پھر چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک اسی لمحے دروازہ کھلا اور دوڑنے کے انداز میں ایک اسکائی بلیوسوٹ والا شخص اندر آیا۔ اس نے اندر کا منظر دیکھتے ہی فوراً اپنی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ میں نے اپنے مقابل کو دبوچا اور اسے گھما کر اس کی گردن کے گرد اپنا بازو لپیٹ دیا پھر اس کی پشت اپنے سینے سے لگا دی۔

”خبردار اسے چھوڑ دو۔“ اسکائی بلیوسوٹ والا غرایا۔

”میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس کی زندگی چاہتے ہو تو فوراً

ریوالتور پھینک دو۔“

ساتھ ہی میں نے اپنے مد مقابل کی گردن پر بازو کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی سانسیں رکنے لگی تھیں یہ دیکھ کر اسکائی سوٹ والے نے پستول پھینک دیا۔

”تم بچ کر نہیں جاسکو گے مسٹر!“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ٹھیک اسی لمحے عینک والے نے تڑپ کر اپنی کہنی سے میرے پیٹ پر وار کیا میرے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور مقابل کی گردن پر میری گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس نے تیزی سے اپنی گردن آزاد کراتے ہوئے میرے جبرے پر مکارسید کر دیا۔ میں کراہتا ہوا پیچھے ہٹا ہی تھا کہ اسکائی سوٹ والے نے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور ہم دونوں گتھم گتھا ہو کر فرش پر آ رہے۔ اسی لمحے باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ مجھ سے پٹنے والے نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا پھر اپنے ریوالتور کی طرف لپکا۔ میں نے فرش پر گرتے ہی کروٹ بدل لی تھی اور اسکائی سوٹ والے کو لالت ماری نتیجتاً وہ فرش پر لڑھک گیا۔ میں تیزی سے اس پر سوار ہو کر اس کے جبرے پر سکے رسید کرنے لگا۔ پہلا شخص جو ریوالتور اٹھا چکا تھا۔ اس نے ریوالتور مجھ پر تان لیا۔

”ہٹ جاؤ ورنہ بھیجاڑ ادوں گا۔“

میں نے دھمکی سنتے ہی اس کی جانب مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ ریوالتور والے کے حلق سے سسکاری نکلی اور اس

کے ہاتھ سے ریوالمور نکل کر دور جاگرا۔ میں نے بے ساختہ دروازے کی طرف دیکھا۔
عبداللہ ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو پستول تھا اس کی نال کافی لمبی تھی جسے دیکھ کر
ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ نال پر سالنسر لگا ہوا ہے اسی لیے اس کے پستول نے شور نہیں مچایا تھا۔ اسکا کی کلر کے سوٹ
والا بھی اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور حیرت سے عبداللہ کو دیکھ رہا تھا جس کے پستول کا رخ اس زخمی ہاتھوں والے کی
طرف تھا۔

زخمی ہاتھوں والا اپنے زخمی ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے خونخوار نظروں سے عبداللہ کو دیکھ رہا تھا۔
عبداللہ نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً ہی دو گولیاں چلائیں۔ پہلی گولی نے زخمی ہاتھ
والے کے پیروں میں کھڑکی کھول دی جس کے بعد وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ کراہتے ہوئے زمین پر گرتا چلا گیا تھا۔
اس کی چیخ سن کر اسکا کی بلوکلر کے سوٹ والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا کہ اس کی ٹانگ سے
بھی خون کا فوارہ ابل پڑا اور وہ بھی زمین پر گر کر مر چکا تھا۔

”بروقت آئے ہو!“ میں نے کہا۔

”یہ تعریفیں کرنے کا موقع نہیں جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے باہر نکلیں جس تیزی سے آپ کو گھیرا گیا ہے یہ
بتا رہا ہے کہ مرشد نے گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔“ کہہ کر وہ مڑ گیا۔

میں نے جلدی جلدی ان دونوں کی تلاشی لی۔ میں ان کا کارڈ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس ایجنسی کے لوگ

ہیں۔

”پلیز جلدی کریں۔“ عبداللہ بولا۔

ہم دونوں کمرے سے باہر نکلے اور دروازے کو کھینچ کر بند کرتے گئے۔ دروازہ خود کار نظام کے تحت لاک
ہو چکا تھا۔ اب ہم سر جھکائے ٹہلنے کے انداز میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے
تھے۔

باہر لان میں سفیر ٹہلتا ہوا نظر آ گیا۔ ہم اسے ساتھ لے کر سڑک پر آ گئے۔

”ہم تینوں کا ایک ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”مگر تم یہاں کیا
کرنے آ گئے۔ تمہیں تو وسیم کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔“
”وسیم وہ رہا۔“ کہہ کر اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہم اسی طرف بڑھنے لگے۔ چلتے چلتے میں نے سفیر سے پوچھا۔ ”تم کاؤنٹر کی طرف کیوں نہیں گئے۔ باہر
ہی کھڑے رہے؟“

”آپ کا کافی دیر تک مجھ سے رابطہ نہ کرنا مجھے شک میں مبتلا کر چکا تھا کہ میں نے عبداللہ کو دیکھا وہ جس
عجلت میں اندر داخل ہوا تھا اسے دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ آپ خطرے میں ہیں اور اس نے ٹرانسمیٹر پر آپ
سے رابطہ کیا ہے۔ یہ مدد کے لیے اندر گیا ہے۔ کچھ دیر اور تم لگا دیتے تو میں اندر جا کر ضرور کچھ کرتا عبداللہ تم بتاؤ
اندر کیا ہوا تھا؟“

عبداللہ نے قدم بڑھا کر کہا۔ ”میں کچھ خاص نہیں جانتا بس اتنا علم ہے کہ انہوں نے مجھے اندر بلایا میں

اندر پہنچا تو یہ ایک دشمن سے بھڑے ہوئے تھے میں نے اپنا رول ادا کیا اس شخص کو موت کے گھاٹ اتارا اور انہیں باہر لے آیا۔“

”مگر تم دوسرے ہوئل نہ جا کر یہاں کیوں آ گئے؟“ میں نے پوچھا۔

عبداللہ نے بتایا کہ میں نے جس ٹیکسی کو پکڑا تھا وہ کچھ دور جا کر ہی بند ہو گئی تھی۔ کچھ دیر میں اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا مگر جب زیادہ دیر ہونے لگی تو میں نے اکتا کر دوسری ٹیکسی لے لی تھی۔ ابھی میں اس ٹیکسی میں بیٹھا ہی تھا کہ وائچ ٹرانسمیٹر پر دوبارہ کال آ گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک بار جب میں ٹیکسی والے کو کام کرتے دیکھ رہا تھا تو سگنل ملا تھا لیکن فوراً ہی سگنل بند ہو گیا تھا۔ اس بار سگنل ملا تو میں نے ڈرائیور کی نظریں بچا کر ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔

ٹرانسمیٹر آن ہوتے ہی میں گویا اچھل پڑا۔ مجھے کسی سے باتیں کرتے ہوئے آپ کی آواز سنائی دی۔ سوال جواب سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ خطرے میں گھر چکے ہیں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ”ہری آپ جلدی چلو مجھے فوراً ہوئل ایکسی لینسی لے چلو۔“

”اگر آپ پہلے بتا دیتے تو میں دوسری طرف سے آپ کو وہیں پہنچا دیتا۔“ ڈرائیور نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

اگلے سگنل سے ٹیکسی سیدھے ہاتھ پر مڑ گئی۔ دس منٹ بعد ٹیکسی ہوئل کے گیٹ پر رکی اور میں جھٹکے سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میں نے ٹیکسی والے کے ہاتھ پر سوکانوٹ رکھا اور بھایا لیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ ہال میں پہنچا اور نارمل انداز میں چلتا ہوا ہال کے دوسری جانب واقع زینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسی لمحے میرے عقب سے اسکاٹی کلر کے سوٹ میں ایک آدمی آیا اور برابر سے گزرتا ہوا بہت تیزی کے ساتھ زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کی تیزی پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ جب میں زینوں کے پاس پہنچا تو وہ اسکاٹی بلیو سوٹ والا زینے پر چڑھ چکا تھا۔

میں نے بھی اپنی رفتار بڑھادی۔ میں فرسٹ فلور پر پہنچا تو مجھے وہ شخص نظر نہ آیا میں مزید اوپر چڑھتا چلا گیا کیونکہ اوپر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔

میں نے رسیونگ وائچ پر کمرے کا نمبر سن لیا تھا فلور بھی معلوم ہو چکا تھا اسی لیے میں سیکنڈ فلور پر آیا تھا۔ جب میں سیکنڈ فلور پر پہنچا تو وہ گلیار خالی پڑا تھا۔ ابھی میں اس گلیارے میں بڑھ ہی رہا تھا کہ مجھے ہلکی دبی دبی سی چیخ سنائی دی۔ اور میں نے اس دروازے کو تھوڑا سا کھول کر اندر دیکھا۔ سامنے ہی آپ نظر آئے اور میں نے کھیل کو ختم کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ یہ تھی میری پوری سرگزشت۔ اب آپ بتائیں کہ آپ ان کے چنگل میں کیسے پھنس گئے؟“

”وہ مجھ سے خفیہ ایجنسی کا بندہ بن کر ملا تھا مگر میں نے جب تلاشی لی تو اس کے پاس سے کوئی کارڈ وغیرہ نہیں ملا۔ مزید بات یہ ہے کہ اس کی گردن میں ایک تعویذ تھا میں نے اسے اس لیے کھول لیا تھا کہ اگر وہ کسی ایجنسی کا ہوگا تو اس میں کوئی خاص چیز ہو سکتی ہے مگر وہ تعویذ منسکرت میں تھا جس کے معنی ہیں کہ وہ ہندو تھا اور اپنے مذہب پر اندھا اعتماد کرنے والا۔“

”یعنی دشمن نے ہر طرف جال پھیلا رکھا ہے۔ بار بار ہم سے ہندو ہی ٹکرا رہے ہیں۔ اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس عورت تک جلد سے جلد پہنچ کر اپنا ٹاسک پورا کیا جائے۔ وہ کس لالچ میں مرشد کو خرید رہی ہے۔ مرشد سے وہ کیا کام لینا چاہ رہی ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے۔“

”مگر وہ عورت ملے گی کہاں؟“ عبداللہ نے تجسس آمیز سوال کیا۔

”بہت آسان سوال ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم نے ایک مہرے کو ابھی تک چھیڑا نہیں ہے اسی

سے معلوم ہوگا۔“

”کون سا مہرہ؟“ عبداللہ نے سوال کیا۔

”سفارت خانے کا افسروسیم کے بندے نے جس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ شمینہ نامی لڑکی سے ملنے جاتا رہا ہے۔ جس کی ریکی سفیر کر چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ہر روز صبح صبح جاگنگ کرنے پارک میں آتا ہے۔ وہیں اسے گھیر لیں گے۔“

”صبح تو ہو رہی ہے اور یہی وقت ہوتا ہے جب لوگ جاگنگ کرنے نکلتے ہیں۔“

”تو پھر دیر کیسی، نکل چلتے ہیں۔“

”چلو۔“ کہہ کر میں نے ایک اونگھتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم لوگ

سفارت خانے کے سامنے والے پارک میں پہنچ گئے۔

اتفاق کی بات ہے جس وقت ہم تینوں اس اوپن پارک میں داخل ہوئے وہ افسر ایک بیچ پر بیٹھا نظر آگیا۔ سفیر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”وہ بیٹھا ہے۔“

میں نے اچنتی سی نظر اس پر ڈالی پھر بولا۔ ”وقت زیادہ نہ ہو جائے اس لیے جلد اپنا کام دکھانا ہے۔ تم ایسا کرو کسی گاڑی کا انتظام کرو ہم اسے کسی دیرانے میں لے چلتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔“ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اتنی دیر میں افسر اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے پھر سے دوڑ لگانی شروع کر دی تھی۔ میں اور عبداللہ بھی آہستہ آہستہ جاگنگ کے انداز میں دوڑ رہے تھے۔ تبھی ہمیں سفیر نظر آیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ کامیاب لوٹا ہے۔ اس لیے میں نے سرگوشی میں عبداللہ سے کہا۔ ”قتل موذی قبل ایذا۔“

عبداللہ نے اشارہ سمجھ لیا اور کہا۔ ”اب میرا کمال دیکھیں آپ اپنی رفتار سست رکھنا۔“ پھر اس نے کمال کی اداکاری دکھائی۔ اور جاگنگ کرتے کرتے اس افسر پر گرا تو وہ ”اوہ سوری“ کہہ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ عبداللہ اپنا سینہ مسلتے ہوئے کراہ رہا تھا۔ افسر نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اتنی دیر میں، میں ان تک پہنچ گیا تھا۔ میں بھی رک کر دیکھنے لگا۔

”ینگ مین ذرا سا سہارا دو لگتا ہے ہارٹ ایک ہوا ہے۔“ افسر نے کہا۔

”ادھر میری گاڑی کھڑی ہے۔ آپ آئیں میں انہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں میرے پاس وقت کم ہے، مجھے جانا ضروری ہے تم ہی پہنچا دو۔“ وہ بولا۔

”کوئی بات نہیں گاڑی تک پہنچانے کے لیے تو آپ سہارا دے دیں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ کہہ کر اس نے سفیر کے بائیں بازو کو اپنے سر سے گزار کر کندھے پر رکھ لیا۔ دوسری طرف میں نے وزن سنبھالا اور ہم دونوں اسے اٹھائے ہوئے پارک کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ سفیر نے دور سے دیکھا۔ افسر کو ساتھ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی وہ سمجھ گیا کہ میں نے بڑی خوبصورتی سے اسے گھیرا ہے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس گاڑی کی طرف بڑھنے لگا جس کی پچھلی سیٹ پر اس نے اس کار کے مالک کو بے ہوش کر کے اس طرح بٹھا دیا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو۔ کار کے پاس پہنچ کر وہ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ افسر اور میں عبداللہ کو سہارا دے کر باہر لائے۔

میں نے سفیر کو دیکھ لیا تھا۔ ہم اسی طرف بڑھنے لگے۔ کار کے نزدیک پہنچنے تک میں نے بائیں ہاتھ سے عبداللہ کو تھام رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ سے میں نے دروازہ کھولا۔ افسر اسے لٹانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ سفیر نے آگے بڑھ کر اس کی کمر پر ریوالور کی نال رکھ دی اور غراتی آواز میں بولا۔ ”چپ چاپ اندر بیٹھ جاؤ۔“ افسر نے جھٹکے سے کھڑا ہونا چاہا تھا مگر سفیر نے اتنی مضبوطی سے اس کے گلے کو پکڑا تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکا۔ عبداللہ نے بھی دیر نہیں کی اور دوسری طرف سے اس کی کمر میں اپنا پستول لگا دیا تھا۔

”پیارے دوست خاموشی سے اندر بیٹھ جاؤ ورنہ انجام موت ہے۔“ سفیر نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ مجبور ہو چکا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اندر بیٹھ گیا۔ سفیر نے بھی سائلنسر لگا ریوالور نکال لیا تھا۔ افسر ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ پر ہم تینوں گویا ٹھونس دیئے گئے تھے کیونکہ پہلے سے بھی ایک شخص وہاں بیٹھا ہوا تھا یعنی کار کا مالک۔

ڈرائیونگ سیٹ پر عبداللہ تھا۔ اسے ایک ایک راستہ معلوم تھا اس لیے وہ بغیر کچھ پوچھے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہم لوگ شہر سے باہر آئے۔ اب ویران علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ پتھر لیے راستے پر اچھلتی کودتی کار آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک جگہ اس نے گاڑی روک لی۔ پھر نیچے اتر کر بولا۔ ”مسٹر سیدھے سادے جو کچھ پوچھا جائے بتا دو ورنہ تمہاری لاش کو بھی سفارت خانے والے ترس جائیں گے۔“

”کک، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔
 ”صرف اتنا بتا دو کہ اس مشن کے لیے کتنے افراد یہاں آئے ہیں اور مشن ہے کیا؟“
 اس نے چونک کر عبداللہ کو دیکھا پھر لرزتی آواز میں پوچھا۔ ”تم..... تم لوگ کون ہو؟“
 ”ہم خدائی فوجدار ہیں جو پوچھا جا رہا ہے وہ بتاؤ۔“
 ”میں..... میں کسی مشن سے واقف نہیں ہوں۔“

”جھوٹ مت بولو ورنہ انجام اتنا برا ہوگا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم دشمن کو مارنے کے قائل نہیں ہیں کیونکہ مرنے والا کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ ہم اذیت دے دے کر جوابات وصول کرتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کس طرح جواب دینا پسند کرو گے۔ ابھی نہایت آسانی سے یا ایذا سہہ کر؟“ عبداللہ نے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر کہا اس کے لہجے سے سفاکی مترشح تھی۔

”میں نے کہا میں کسی مشن وشن سے واقف نہیں ہوں۔“

”اچھا تمہاری مرضی مت بتاؤ..... بھائی سفیر ذرا انہیں اپنی سوئی کا کمال تو دکھاؤ۔“

عبداللہ کا جملہ ختم ہونے سے پہلے سفیر نے انجکشن جیب سے نکالا اور نیڈل کو پھرتی سے اس کے بازو پر مار کر نکال لیا۔ ”دہ“ ”سی“ کر کے رہ گیا۔

”یہ نمونہ ہے..... یہ سوئی چھونے کا ماسٹر ہے۔ ایک سیکنڈ میں تین بار سوئی چھوتتا ہے۔ یہ پیروں سے شروع کرتا ہے اور پیشانی تک لے جاتا ہے۔ اس راہ میں آنکھیں بھی آتی ہیں۔“ عبداللہ نے نہایت سفاک لہجے میں کہا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو، تم مجھے مارنا چاہتے ہو مار دو مگر یاد رکھنا میں سفارتی اہلکار ہوں۔ میری حکومت تمہارے وزیر اعظم سے جواب طلب کرے گی۔“

”ہم نے پہلے ہی کہا ناں ہم جان سے نہیں مارتے سکا سکا کر زندہ رکھتے ہیں انسان خود اپنی موت مانگنے لگتا ہے۔“ عبداللہ نے جواب دیا پھر سفیر کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ایسا کرو نیچے سے شروع کرو، آنکھ پر آ کر رک جانا۔ پھر سے شروع ہو جاؤ۔“

سفیر نے نیڈل اٹھایا اور اس کا ہاتھ بلند ہوا اور سلائی مشین کی طرح چلنے لگا ایک منٹ میں تمیں سے پینتیس بار اس نے سوئی چھوئی کہ افریچنا۔

”میں..... میں بتاتا ہوں۔“

سفیر کا ہاتھ رک گیا۔

”کل چار افراد آئے تھے تین مرد اور ایک عورت۔ سوائے عورت کے سب مارے گئے۔“

”اس عورت کا نام کیا ہے؟“

”گیتا بھار دواج لیکن وہ کسی مسلمان خاتون کے نام پر زندگی گزار رہی ہے شمینہ کے نام سے مشہور ہے۔“

”کہاں ملے گی؟“

”وہ اسلام آباد میں ہوگی۔“

”اسلام آباد میں کس طرف؟“ اس نے سوال کیا

”ٹرائینگل پارک کے پاس ایک دو منزلہ بنگلا ہے۔ وہ بنگلا ایک بہت بڑے تاجر کا ہے مگر خود اسے پتا نہیں ہے کہ اس بنگلے میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے مرشد نے کرائے پر لے کر ہمیں دے رکھا ہے اور ہم اسے بطور ہیڈ کوارٹر استعمال کرتے ہیں اور اسے ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں ایک خفیہ تہ خانہ بھی ہے اور اس تہ خانے کو ہم بطور اسپیشل گیٹ روم استعمال کرتے ہیں ہمارے مرکزی عہدیدار جب بھی آتے ہیں اسی میں ٹھہرتے ہیں گیتا بھی اس میں ٹھہری ہوئی ہے۔“

”لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ وہ کتنے دنوں سے وہاں ٹھہری ہوئی ہے؟“

”تقریباً ایک سال ہو چکا ہے مگر زیادہ تر وہ دورے پر رہتی ہے کیونکہ پورا نیٹ ورک اس کی ذمہ داری ہے وہی اس مشن کی انچارج ہے۔“

”معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ اب ایسا کرو کہ تم سو جاؤ موت کی نیند میں کھو جاؤ۔“ کہہ کر عبداللہ نے اس کی کپٹی پر نال رکھ کر دبا دیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز ہوئی اور سائلنسر لگے ریوالور کی گولی اس کے

دماغ میں اترتی چلی گئی۔ خون کا فوارہ سا چھل کر نکلا اور خود عبداللہ کے چہرے کو بھگو گیا۔

عبداللہ نے اس کی لاش کو کھینچ کر کار سے باہر نکالا اور پہاڑیوں کے درمیان پھینک آیا۔ کیونکہ اگر ہم اسے زندہ چھوڑ دیتے تو اس کی حکومت واویلا مچاتی۔ اب اگر لاش ملی بھی تو ہماری حکومت خود پوچھے گی کہ وہ اس ویرانے میں کیا کرنے گیا تھا۔

”بھائی ان صاحب کو بھی یہیں کہیں آرام کرنے کی اجازت دے دو۔“ میں نے گاڑی کے مالک کی طرف اشارہ کیا جو بے ہوشی کے عالم میں گاڑی میں پڑا ہوا تھا۔

”کیا ہمیشہ کے لیے؟“ عبداللہ نے پستول کو پھر باہر نکال لیا۔

”نہیں صرف کچھ دیر کے لیے۔“

عبداللہ نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اسے بھی باہر نکال لیا اور وہیں ایک بڑے سے پتھر پر لٹا کر اس کی کینٹی پر ریوالتور کے دستے سے ایک اور وار کر دیا تاکہ وہ مزید کچھ دیر بے ہوش رہ سکے پھر ہم شہر کی طرف لوٹ چلے۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد عبداللہ نے پوچھا۔ ”اب ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”ایسا کرتے ہیں سیدھے اسی بنگلے پر چلتے ہیں۔“ میں نے کہا

”لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ وہاں سکیورٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ کنٹونمنٹ ایریا جیسے انتظامات ہیں کل پچاس ساٹھ بنگلے ہوں گے۔ اس کے گرد چار دیواری ہے۔ گیٹ پر چیک پوسٹ ہے جس میں مسلح پہریدار ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اندر جانے والوں کو چیک پوسٹ پر رک اپنی شناخت کرانی ہوتی ہے۔ گارڈ بتائے گئے بنگلے پر فون سے کنفرم کرتا ہے کنفرم ہو جانے کے بعد وہ وزیٹر کو پاس اشو کرتا ہے جب تک تصدیق نہ ہو اندر جانے نہیں دیا جاتا رات کے وقت چار دیواری کے ساتھ ساتھ جیپ پر اڈنڈ لگایا جاتا ہے تاکہ کوئی چھلانگ لگا کر اندر نہ گھسے اور دیوار پھانڈنے کی کوشش نہ کر سکے۔“

”یاد رکھو کتنی بھی ٹائٹ سکیورٹی کیوں نہ ہو اس میں کہیں نہ کہیں کوئی شگاف ضرور ہوتا ہے۔“

”اچھی بات ہے میں شگاف تلاش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر عبداللہ نے کار کا رخ منزل کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیا۔ مگر تیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس نے کار روک دی اور کار سے نیچے اتر گیا پھر آگے بڑھنے لگا۔ بطور دم چھلا میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ گیٹ پر پہنچا پھر رک کر خود ہی بولا۔ ”کار کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا اتنی مشکل سے اسے گیراج پہنچا کر آ رہا ہوں۔“ وہ اس طرح سے بول رہا تھا جیسے گارڈ سے اس کی بڑی اچھی دوستی ہے۔

”ارے تم چپ کیوں ہو، صوفی صاحب دکھائی نہیں دے رہے۔ کہیں گئے ہیں کیا؟“ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ واج مینوں میں ایسے بہت سے ہوتے ہیں جن کی داڑھیاں ہوتی ہیں ان میں بھی ایک نہ ایک شخص کی داڑھی ضرور ہوگی۔

”آج ان کا آف ہے۔“ گارڈ نے جواب دیا۔

”اچھا اچھا! ہاں ایک اچھی فلم لایا ہوں۔ دیکھنا ہو تو میرے بنگلے پر آ جانا۔ اچھا چلتا ہوں۔“ کہہ کر وہ

مجھے کھینچتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ واج مین اب بھی ہمیں دیکھ رہا ہے کیونکہ اس کی آنکھوں میں تیرتے استعجاب کو میں نے بھی محسوس کر لیا تھا وہ شاید اس منحنے میں تھا کہ یہ صاحب کس بنگلے میں رہتے ہیں۔ اگر باہر کا کوئی ہوتا تو پاس مانگتا۔

عبداللہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک بنگلا نظر آیا۔ اس بنگلے کا لان خشک پتوں سے اٹا ہوا تھا۔ یقیناً یہ بنگلا خالی ہے۔ میں نے سوچا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ سوچتا ہوا کہ اگر کہیں اور ٹیلیفون ملا تو یہ بنگلا چھپنے کے لیے بہت بہتر رہے گا۔

کچھ اور آگے بڑھنے کے بعد مجھے ٹرائینگل پارک نظر آ گیا وہ تین کونے کا پارک تھا شاید اسی لیے ٹرائینگل پارک کہتے تھے۔ اس پارک کے ارد گرد کے بنگلوں کا میں نے جائزہ لیا۔ سامنے ہی وہ دو منزلہ بنگلا نظر آ گیا۔ اس بنگلے کی جانب بڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس میں کیسے داخل ہوا جاسکتا ہے کیونکہ باہر بیٹھا چوکیدار نظر آرہا تھا۔ ابھی میری نظر اس کے برابر والے بنگلے پر پڑی اس بنگلے کی حالت زار اچھی نہ تھی۔ عبداللہ اسی بنگلے کی طرف بڑھتا چلا گیا پھر دروازے پر پہنچ کر اس نے نیل بجائی اندر کہیں دور گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ پرانے انداز کی ہے کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑی بی نظیر آئیں۔ میں نے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پڑھ لی تھی جس پر میجر اکرام اللہ بنگش لکھا تھا اسی مناسبت سے عبداللہ نے بڑی بی کو سلام کر کے کہا۔ ”کرنل فرخ کا بیٹا ہوں کراچی والے فرخ۔ انہوں نے مجھے میجر اکرام سے ملنے کو کہا تھا۔“

”مگر بیٹا میجر اکرام کا تو چھ ماہ پہلے انتقال ہو گیا میں ان کی بیوہ ہوں۔ آؤ اندر آ جاؤ۔“ ہم اندر آ گئے۔ ڈرائنگ روم کے صوفے بھی انتہائی پرانے ڈیزائن کے تھے ایسے صوفے اب شاید ہی نظر آتے ہوں ہم اس جہازی ساز کے صوفے پر بیٹھ گئے۔ بڑی بی بھی بیٹھ چکی تھیں۔ ہم بھی خاموش تھے ابھی بڑی بی بولیں۔ ”تمہارا کیا خیال ہے چائے پی جائے۔“

”اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو..... بلکہ رہنے دیں۔ میں ہوٹل سے نکلتے وقت پی کر نکلتا تھا۔“

”لیکن بیٹا کرنل فرخ کس رجمنٹ کے تھے مجھے ان کے دوستوں میں ایسا ایک نام بھی نہیں معلوم۔“

عبداللہ اندر ہی اندر گھبرا اٹھا جس کا عکس اس کے چہرے سے جھلک اٹھا تھا کیونکہ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خود بنگش کس رجمنٹ کے تھے۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ ”میرے ابو جب لاہور چھاؤنی میں تھے تو.....“

”سنو بیٹے۔“ بڑی بی جملہ کاٹ کر بولیں۔ ”ٹھہرو میں چائے بنا لیتی ہوں۔ دراصل نوکرانی بڑی کام چور تھی۔ میں نے اسے نکال باہر کیا ہے۔ نئی ملنے تک مجھے خود ہی اپنے ہاتھوں سے کام کرنا ہے۔“ کہہ کر وہ صوفے کے ہینڈل کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئیں۔

”رہنے دیں آنٹی دراصل میرے انکل بھی میرے ساتھ آئے ہیں کچھ دیر بعد وہ مجھے لینے آ جائیں گے۔“

”کوئی بات نہیں میں دوبارہ بنالوں گی۔“ کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔ وہ ادھر گئیں اور عبداللہ انھیں کر باتھ روم میں چلا گیا۔ اس نے واش بیسن کا نل کھول دیا پھر اس نے واج ٹرائسمیٹر پر رابطہ کیا۔ دوسری

جانب سے فوراً کال ریسیو کر لی گئی۔ ”ہیلو میں برابر والے بنگلے میں ہوں۔ میجر بنگش کے بنگلے میں۔ میں نے بڑی بی کو بتا دیا ہے کہ میرے چچا احمد طاہر آرہے ہیں۔“

”جی اچھا، ہم آرہے ہیں.....“ کہہ کر اس نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا
باتھ روم سے نکل کر اس نے صوفے پر خود کو گرالیا تبھی بڑی بی چائے کا کپ لیے ہوئے داخل ہوئیں۔
”لو بیٹا چائے پیو۔“

چائے کا میں نے پہلا سپ لیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ بڑی بی فون کی طرف بڑھیں تو عبداللہ نے کہا۔
”شاید میرے انکل ہوں۔“ پھر اس نے ریسیور اٹھا لیا دوسری جانب سکیورٹی گارڈ تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ کے مہمان آئے ہیں۔“

”ہاں ہاں احمد طاہر نام کے ایک صاحب آنے والے ہیں۔“ عبداللہ بولا۔

”لیکن جناب ان کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں میں ضمانت لے رہا ہوں۔“

بڑی بی بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھیں جلدی سے ریسیور لے کر ماؤتھ پیس میں بولیں۔ ”ہاں احمد طاہر کو بھیج دو۔“

کچھ دیر بعد وسیم اور سفیر اندر آ گئے۔ ان دونوں کو بھی بڑی بی نے چائے لا کر دی پھر بولیں۔ ”آپ لوگ کھانا کھا کر جانا، میں بنا رہی ہوں۔“

”جب آپ ضد کر رہی ہیں تو یہی سہی۔“

بڑی بی ہمیں بٹھا کر کچن کی طرف جا رہی تھیں کہ عبداللہ نے کہا۔ ”آئی اگر آپ اجازت دیں تو ہم گھوم پھر کر خود ہی عمارت کو دیکھ لیں۔“

”کیوں عمارت میں ایسی کیا خوبی نظر آ گئی؟“

”ایک جگہ بیٹھے بیٹھے بوریت ہوگی یہی سوچ کر میں نے کہا۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔“

اجازت ملتے ہی ہم تینوں چھت پر پہنچے اور ٹہلتے ہوئے کن انکھیوں سے برابر والی بلڈنگ کا جائزہ لینے لگے بلڈنگ کی دیوار خاصی نیچی تھی اسے با آسانی پار کیا جاسکتا تھا۔

”یہاں سے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

”ہاں یہی مناسب ہے کچھ اور اندھیرا پھیلنے دو۔“ کہہ کر ہم واپسی کے لیے مڑ گئے۔

ہم لوگ نیچے آئے تو بڑی بی کچن کے بجائے بیڈ پر لیٹی تھیں۔

”کیا ہوا آئی؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”سر چکرانے لگا تھا۔ بھی بڑھاپے سے زیادہ بڑی اور بیماری کون سی ہوگی؟“ بڑی بی نے نقاہت بھری

آواز میں کہا۔

”میرے پاس دوا ہے کہیں تو میں دے دوں؟“ سفیر نے کہا۔ ”ابھی آپ ترانائی محسوس کریں گی۔ میں

خود بھی استعمال کرتا ہوں۔“ کہہ کر سفیر نے جیب سے پرس نکالا اور پرس میں رکھی دو گولیاں بڑھادیں۔
بڑی بی نے گولیاں لے لیں۔

”اب آپ کچھ دیر کے لیے لیٹ جائیں۔“

عبداللہ نے کہا اور باہر نکل آیا دوسرے کمرے میں پہنچ کر بولا۔ ”بڑی بی کو تو میں نیند کی گولیاں دے آیا ہوں۔ ان کی طرف سے تو اب کوئی خطرہ نہیں ہے آؤ باہر چلتے ہیں۔“

ہم سب باہر لان میں آئے۔ شام رات میں بدل چکی تھی۔ اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ لان میں ایک ٹمٹماتا سا بلب جل رہا تھا۔ ہم نے برابر والی عمارت کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی سنائے کا راج تھا۔ عبداللہ نے لان میں پڑی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی لا کر دیوار کے سہارے کھڑی کی پھر اس پر چڑھ کر اس نے دیوار کی منڈیر پکڑ لی اور دونوں ہاتھوں پر وزن ڈال کر اٹھتا چلا گیا اور پھرتی سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا اس کے پیچھے سفیر میں اور وسیم بھی اندر کود گئے۔

ہم چاروں ایک کے بعد ایک کودے تھے۔ جہاں پیر زمین سے مس ہوئے تھے بس وہیں کے ہو رہے۔ سینوں کو زمین سے چپکائے سینے کے بل لیٹے رہے اور گھڑی کی سوئی کھسکتی رہی پھر ہمیں اندازہ ہو گیا کہ گیٹ پر بیٹھا چوکیدار اپنی جگہ اونگھ رہا ہے یا اٹنا غفیل ہو چکا ہے یوں بھی بنگلوں کے گرد جیسا سخت انتظام تھا جتنی کڑی سیوریج تھی ایسے میں تو پرندے کو بھی پر مارتے خوف آتا ہوگا۔

اب ہم تینوں نے سانپ کی نقل شروع کر دی سینے کے بل زمین پر ریٹگئے لگے۔ ریٹگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پھولوں کی کیاریوں کے درمیان سے ہو کر اس مقام پر پہنچنے جہاں سے برآمدہ شروع ہو جاتا تھا۔ برآمدہ کچھ اونچا تھا سب سے پہلے عبداللہ اچھل کر اوپر چڑھا پھر ہم تینوں۔

ہم برآمدے کے پکے فرش پر بھی ریٹگئے لگے۔ ریٹگتے ہوئے دروازے پر پہنچے پھر اسے کھول کر اندر داخل ہوئے۔

وہ کمرہ ہال نما تھا۔ اس میں صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے اس کمرے کو پار کیا اور ایک دوسرے کمرے میں آ گئے۔ اس کمرے میں ایک بیڈ بچھا تھا اس پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ لیٹی ہوئی ہستی پر نظر پڑتے ہی ہم تینوں بری طرح چونک گئے۔ چونکنے کی بات ہی تھی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سے یوں دشمنوں کے کچھار میں ملاقات ہوگی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ہمیں اس دن بس میں ملی تھی اور اس کے ساتھی کے پاس سے ڈرگ برآمد ہوا تھا اس نے بھی ہم تینوں کو دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر حیرت ابھر آئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے حیرت بھری آواز میں کہا تھا۔ ”تم..... تم لوگ یہاں تک کیسے پہنچے؟“

”اپنے پیروں سے چل کر۔“ وسیم نے کہا۔

”آ تو گئے ہو مگر اب زندہ واپس نہیں جاسکو گے۔“ اس نے ہم تینوں کو مخاطب کر کے کہا۔

”اب میں سمجھا تم ہی ثمنینہ ہو۔“ سفیر بولا۔

”جو بھی سمجھ لو۔“ وہ مسکرا کر بولی ساتھ ہی ساتھ اس نے نیچے کے نیچے سے چھوٹا سا ریوٹور نکال لیا۔ اب

تک وہ صرف انگریزی میں باتیں کر رہی تھی اور کسی اہل زبان کی طرح انگریزی بول رہی تھی۔

”اس کھلونے کو نیچے رکھ دو۔“ میں نے سمجھانا چاہا۔

”تا کہ تم لوگ مجھے زیر کر لو۔“

”زیر تو تم ہو چکی ہو۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”تمہارا چوکیدار مارا جا چکا ہے اور پوری عمارت ہمارے آدمیوں

کے زرخے میں ہے۔“

”بالکل غلط اس عمارت کے تمام دروازے خود کار ہیں ہر دروازے پر کیمرا نصب ہے تم لوگوں کی پوری

فلم بن چکی ہے۔“

”اچھی بات ہے پورے پاکستان میں نمائش کے لیے پیش کر دینا۔“ عبداللہ نے کہا اس نے صرف اسی پر

اکتفا نہ کیا بلکہ اسے باتوں میں لگا کر اس نے چھلانگ لگائی تھی چھلانگ اس طرح کی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکی۔ وہ اس

کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہوا دوسری جانب کود گیا تھا۔

پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا بے عقلی ہوتی۔ وسیم نے موقع

ضائع نہ کیا اور آگے بڑھ کر اس کے بوائے کٹ بالوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ بیڈ پر کافی آگے تک کھسک

آئی۔ وسیم نے اس کی قوت کا غلط اندازہ لگایا تھا وہ لمحے بھر میں سنبھل گئی تھی۔ اس نے خود کو گیند کی طرح اچھالا تھا

اور حیرت انگیز کمال کے ساتھ وہ بیڈ سے نیچے اتر گئی تھی پھر اس نے جسم کو موڑ کر ایک زبردست قسم کی اچھال بھری

تھی۔ اس جمپ کے ساتھ وہ وسیم کے پیچھے آ گئی تھی۔ پیچھے آتے ہی اس نے وسیم کے گلے میں ہاتھ ڈال کر

نیچلا کر لگادیا تھا یہ سب کچھ لمحے بھر میں ہو گیا تھا پھر وہ غراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”خبردار اب اگر کسی نے مجھ پر

حملہ کیا تو میں اس کی گردن توڑ دوں گی۔“

اس کا لاک اتنا سخت تھا کہ وسیم کی آنکھیں حلقوں سے ابھرنے لگی تھیں سانس رکنے لگی تھی اور چہرہ سرخ

ہو گیا تھا۔ وسیم نے گلا چھڑانے کے لیے اپنے انداز سے کوشش کی۔ اپنا ہاتھ اوپر لے جا کر اس کے ہاتھ کو پکڑنے

کی کوشش کی لیکن ہاتھ بہک گیا۔

کچھ بھی ہو، وہ عورت تھی نادانستگی میں وسیم نے ہاتھ چلایا تھا کہ اس کا ہاتھ اس کے جسم پر دباؤ کا باعث

بن گیا نتیجہ اس کا ذہن منتشر ہو گیا۔ بس یہی ایک لمحہ وسیم کے کام آ گیا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے بھی وہی

حرکت کی، ساتھ ہی ساتھ جسم کو جھٹکا دیا تو وہ جھٹک کر دور جا گری۔ وہ دوبارہ اس پر جھپٹی مگر راستے ہی میں، میں

نے اسے روک لیا۔ روکنے کے لیے میں نے صرف اپنا پیر بڑھایا تھا کہ وہ پیروں سے الجھ کر گر گئی۔ اس کے گرتے

ہی عبداللہ نے اسے فٹ بال بنا دیا۔ ایک کے بعد ایک کئی کلک جمادیئے۔ ایسی زبردست کلک کہ سیمنٹ کی دیوار

پر پڑتی تو وہ چٹخ جاتی۔ وہ تو پھر ایک عورت تھی اپنی چیخوں کو نہ روک سکی۔ سر پھٹ گیا تھا اور اس سے خون رسنے لگا

تھا۔

عبداللہ نے اسی پر بس نہ کیا کسی ریلر کی طرح پھرتی سے اسے اٹھایا اور ہوا میں اچھال کر گھٹنا کھڑا کر کے

خود بیٹھ گیا۔ وہ سیدھی اس کے ٹخنے پر گری، اس کی تیز چیخ گونجی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ عبداللہ نے وقت ضائع

کیے بغیر پیڈل فین کے تار کو جھٹکا مار کر توڑا اسی الیکٹرک وائر سے اسے باندھ دیا پھر اسے سفیر کی مدد سے پکھے

سے لٹکا دیا۔ یہ سب کچھ بمشکل دس منٹ میں اس نے کر دکھایا تھا۔

ہم اب اسے ہوش میں لانے کی ترکیب کر رہے تھے تاکہ ضروری معلومات حاصل کی جاسکیں۔
 ”میں ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں ویسے مجھے قوی امید ہے کہ یہ بنگلا پوری طرح خالی ہے پھر بھی دیکھ لینے
 میں کیا حرج ہے۔“ کہہ کر عبداللہ باہر نکل گیا۔

اس کے باہر جاتے ہی میں نے جگ میں بھرے پانی کو اس کے چہرے پر انڈیل دیا پانی کے پڑتے ہی
 وہ ہوش میں آگئی اور آنکھیں جھپکا کر بولی۔ ”یہ..... تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔“
 ”ہم نے برا کب کیا ہے۔ ہم جو کرتے ہیں اچھا ہی کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں بی بی، اب ذرا
 ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنا شروع ہو جاؤ۔ تم کون ہو کیا کرنا چاہتی تھیں، مرشد سے کیا کام لے رہی تھیں۔“
 ”اگر مجھ سے کچھ اگلا سکتے ہو تو اگلا لو۔“ اس نے چیلنج کیا۔

”دیکھو بی بی میں عورتوں کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں۔ لیکن میرا یہ دوست.....“ میرا اشارہ وسیم کی
 طرف تھا۔ ”عورتوں سے نمٹنا خوب جانتا ہے۔ تم نے اسے جتنی سزا دی ہے یہ اس کا بدلہ سود سمیت لے گا۔“
 ”میں اذیت سہنے میں ثانی نہیں رکھتی۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کر لو مگر میری زبان نہیں کھلوا پاؤ گے۔“ اس نے
 ہمیں کھلا چیلنج دے دیا تھا۔

عبداللہ کو جو ابھی ابھی لوٹا تھا اسے میں نے اشارہ کیا۔ وہ الیکٹرک وائر کو بل دے کر دوہرا کرتے ہوئے
 اس کے قریب پہنچا اور نہایت سرعت سے اس نے تار کا ایک سرا اس کے پیروں سے لپیٹا اور پھر دوسرے سرے کو
 چھت میں لٹکتے سٹکے پر پھینک کر اسے کھینچنے لگا۔ وسیم بھی اس کی مدد کو بڑھ آیا۔ چند منٹ میں وہ سٹکے سے الٹی لٹکی
 ہوئی تھی۔ الٹا لٹکنا آسان نہیں لیکن اس کے چہرے پر ذرا بھی کرب نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے الٹا لٹکنا
 اس کے لیے ایک عام سی بات ہے۔

”وسیم تمہارے پاس سرنج ہے نا۔ اسے نکال کر آؤ..... تبھی یہ کھلے گی۔“ میں نے وسیم کو اشارہ دیا کہ وہ
 پرانا حربہ آزمائے۔

وسیم جیب سے سرنج نکال ہی رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔ ”یہ بے چاری کچھ بھی بتا نہیں پائے گی۔ مجھ
 سے پوچھ لو جو پوچھنا ہے۔“

میں نے پھرتی سے مڑتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تم بھی اس کھیل میں شامل ہو۔“
 مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ یہ وہی بڑی بی بی تھی جو کچھ دیر قبل کس طرح کمر تھا مے کراہ رہی تھی اور اب اس طرح
 سینہ تانے کھڑی تھی کہ جیسے مینا مردانی ہو جو کشتی میں مردوں کو بھی ہرا دیتی تھی۔

”تم نے یہی سمجھا ہو گا کہ ایک بڑھیا عورت کو بے وقوف بنا دو گے۔ میری کامیابی کی وجہ بھی یہی ہے کہ
 مجھے بڑھیا دیکھ کوئی مجھ پر شک نہیں کرتا۔ اپنے اسی بڑھاپے کا سہارا لے کر میں نے بنگش کو دھوکا دیا اور اس کے گھر
 پر قبضہ کیے بیٹھی ہوں۔ اگر اپنی اصل صورت اور عمر کے ساتھ سامنے آتی تو وہ اپنے گھر میں گھسنے بھی نہیں دیتا۔ اس
 لیے اس کے بچ کے ایک کرنل کی ماں بن کر اس سے ملی کہ اب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ وقت پر پنشن ملتی نہیں
 ہے۔ فاتے کی نوبت آگئی ہے، مجھے سہارا دے دو۔ اس سیدھے سادھے شخص نے مجھے گھر میں ٹھہرا لیا۔ آس
 پاس کے دو ایک گھر میں جا کر میں نے خود کو بنگش کی بہن بتایا اور پھر بنگش کو دنیا سے چلتا کر دیا۔ پاس پڑوس والے

بھی شک نہ کر سکے۔“

”یہ مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“

”اس لیے کہ تم سمجھ سکو کہ میں معمولی بڑھیا نہیں ہوں۔ اور یہ بھی سن لو میں ہی گیتا ہوں اور میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا لیکن مغالطہ میں تھی کہ اس وقت تم بالکل خاموش تھے جب کہ یہ لڑکا بول رہا تھا۔“ اس کا اشارہ عبداللہ کی طرف تھا۔ ”تمہارے رہتے یہ کیوں گائیڈ کر رہا ہے۔ اسی سوال نے مجھے الجھا دیا تھا۔ ورنہ میں اسی وقت تمہیں گھیر لیتی۔“

”اب تو یقین آ گیا نا۔“

”بالکل، اس لیے اب تم تینوں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے پستول کو لہراتے ہوئے کہا۔ اور روبی کی طرف بڑھی، شاید وہ اسے آزاد کرانا چاہتی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان خاصہ فاصلہ تھا۔ اگر میں اس پر جمپ لگاتا بھی تو اس تک پہنچ نہیں پاتا۔ وہ فوراً فائر کر دیتی۔ میں کیا کروں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وسیم نے داؤ چلا دیا۔ جیسے ہی اس کی پیٹھ دسم کی طرف ہوئی اس نے فلائنگ کلک چلا دی۔ وہ اڑتی ہوئی روبی پر گری۔ وسیم نے ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔ اپنی جگہ سے اچھلا اور اس پر جا گرا۔ مگر رکا نہیں۔ اس کے پستول پر ہاتھ مارتا ہوا دور چلا گیا۔ ایسے وقت میں میرے تمام ساتھی المٹ رہتے ہیں اس کا ثبوت بھی فوراً مل گیا۔ عبداللہ نے ساتھ ہی ساتھ چھلانگ لگائی تھی اور اس پر جا گرا تھا۔ اس نے اس کی گردن میں آرم لاک لگا دیا تھا۔

”وسیم، تارکا دوسرا ٹکڑا بھی اٹھا لاؤ۔“ وہ چیخ کر بولا۔ مگر اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ پتا نہیں اس نے ایسا کون سا داؤ آزما یا تھا کہ عبداللہ اڑتا ہوا اس سے دو تین ہاتھ کی دوری پر جا گرا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ وسیم نے اسے سر سے ٹکر ماری اور وہ عبداللہ کے قریب جا گری۔ عبداللہ شاید اسی انتظار میں تھا کہ اس نے اس کے سر پر پوری طاقت سے بوٹ کی ٹھوک ماری۔ وہ پھسلتی ہوئی میری طرف آئی۔ میں نے بھی دیر نہیں کی۔ اس کے سر پر ایک اور ٹھوک لگا دی۔ اگر وہ کھڑی حالت میں ہوتی تو میں کینٹی پر مارتا لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ اس کے سر اٹھانے کا انتظار کرتا۔ وہ دوبارہ سے پھسلتی ہوئی وسیم کی طرف گئی۔ وسیم نے بھی دیر نہیں کیا اور اس کے سر پر ایک اور ٹھوک ماری۔ اس عورت میں پتا نہیں کتنی قوت برداشت تھی کہ وہ اتنی زبردست ٹھوکروں کو سر پر جھیل گئی تھی اور ہوش میں بھی تھی۔ اس کی جگہ کوئی عام عورت ہوتی تو ایک ہی ٹھوک میں بے ہوش ہو چکی ہوتی۔

اس بار جب وہ میرے قریب پھسلتی ہوئی آئی تو میں نے دیر نہیں کی اور اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دینے کی کوشش کی مگر یہ کوشش ناکام گئی کیوں کہ اس کا پورا چونڈا میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ یعنی کہ اس نے وگ لگا رکھا تھا۔ اسے موقع مل گیا تھا اور وہ جمپ لگا کر کھڑی ہو گئی تھی کہ وسیم نے وہیں سے چھلانگ لگائی اور اسے گرا دیا۔ وہ کچھ اس طرح گری تھی کہ اس کا چہرہ فرش سے ٹکرایا تھا۔ ادھر وہ گری تھی کہ عبداللہ نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ ایک قد آور مرد کسی عورت کی کمر پر گرے یہ اس عورت کے برداشت سے باہر کی بات ہے۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

اتنی دیر سے وہ تین تین مردوں سے مقابلہ کر رہی تھی۔ اب تک اس کے منہ سے آہ تک نہیں نکلی تھی لیکن

عبداللہ کے وزن نے اس کی چیخ نکال دی۔ کچھ بھی ہو وہ عورت تھی۔ اس نے کتنی ہی ٹریننگ لے کر اپنے جسم کو کتنا ہی سخت کیوں نہ بنالیا ہو لیکن عورت پھر عورت ہوتی ہے۔ کتنی ہی قوی کیوں نا بن جائے مگر جسم کی ساخت میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں کر سکتی۔ اس کا جسم نازکی لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس وقت بھی شاید کسی نازک حصے پر چوٹ لگی تھی کہ وہ تڑپ اٹھی تھی۔ لیکن عبداللہ نے اس پر بھی بس نہیں کیا۔ ایک بار اور اچھال بھری اور اس کے جسم پر پھر سے کودا۔ یہ چوٹ بھی وہ برداشت نہ کر سکی اور اس کی چیخ پھر نکل گئی۔ وسیم جو تار کا ٹکڑا اٹھا لایا تھا اسے اس نے پھرتی سے اس کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ اسے کھینچتا کہ گیتا نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس کے گلے میں ایک لاکٹ لٹک رہا تھا جسے اس نے داہنے ہاتھ سے اوپر اٹھایا اور منہ میں رکھ کر چبا گئی۔

اس نے یہ حرکت اتنی سرعت سے کی تھی کہ میں بھی سمجھ نہ سکا۔ میری آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں اسی لیے میں نے چہرے پر آیا تغیر فوراً دیکھ لیا۔ ایک لمحے میں اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ آنے لگا تھا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اس لاکٹ میں سائنائیڈ ہوگا۔ ٹامیل ٹائیگر نامی دہشت گرد تنظیم کے ممبر اپنے گلے میں تعویذ کی طرح سائنائیڈ کپسول پہنے رہتے ہیں اور جب پکڑے جاتے ہیں تو اسے منہ میں رکھ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

وسیم اور عبداللہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ میں نے کہا۔ ”خس کم جہاں پاک۔ واقعی یہ کوئی بڑی چیز تھی۔ ہم اس سے کچھ اگلا نہ لیں اس ڈر سے اس نے جان دے دی۔“

”وہ مر گئی تو کیا ہوا، یہ تو ابھی زندہ ہے۔“ کہہ کر وسیم روپی کی طرف بڑھا۔

روپی اسے اپنی طرف آتا دیکھ بولی۔ ”جو پوچھنا ہے پوچھو میں جواب دوں گی۔“

شاید وہ گیتا کی موت سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ یہی ہماری کامیابی تھی۔ کسی عورت پر تشدد کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ اگر گیتا خطرناک ثابت نہ ہوتی تو ایک دو ٹھڑے مار کر اسے باند دیتا لیکن وہ تو ہمارے موت کا سامان کرنے لگی تھی۔ اس کا تیور بتا گیا تھا کہ وہ ہماری جان کے درپے ہے اگر ہم نے اس پر قابو نہ پایا تو وہ ہمیں قتل کر دے گی۔ اسی لیے وسیم اور عبداللہ بھی جذبہ رحم سے عاری بن گئے تھے۔

روپی نے خود ہی تعاون کی پیش کش کی تو میں نے وسیم کو اشارے سے روکا اور روپی سے کہا۔ ”اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کس کے لیے کام کر رہی ہو۔“

”میرا نام روپی نہیں جو زفائین ہے اور میں امریکن ہوں۔ ہمارا تعلق ”شی“ سے ہے۔ یہ مافیا سے بھی بڑی تنظیم ہے۔ مافیا والے غنڈہ گردی اور منشیات فروشی کا کاروبار کرتے ہیں لیکن ہم ان سے بھی اونچا کام کرتے ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے ملکوں کی حکومت گراتے اور بناتے ہیں۔ انہیں بلیک میل کرتے ہیں۔ لڑاتے ہیں۔ بڑی حکومتیں ہماری خدمات حاصل کرتی ہیں اور ہم ان کے مفاد کی جنگ بھی لڑتے ہیں۔“ وہ بول رہی تھی۔ اور میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اس لیے کہ مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے ملک میں شی گھس آئی ہے۔ شی کے بارے میں، میں نے کئی آرٹیکل مختلف میگزین میں پڑھ چکا تھا۔ ان کے کام کے بارے میں بھی معلوم تھا۔ واقعی وہ ایک ٹریڈ اینڈ بزنس تھی۔ دیکھنے میں دھان پان، مگر اندر سے اتنی مضبوط کہ اتنی دیر پنکھے سے بندھی لٹکی تھی مگر اس کی پیشانی پر شکن نہ تھی۔ وہ رک رک کر بتا رہی تھی۔ ”در اصل اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر ملک

میں سپر پاورز کا عمل دخل رہتا ہے اس وقت دنیا کے نقشے پر دو ہی ملک ایسے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ واحد سپر پاور بن کر رہیں۔ اس سلسلے میں سازشوں کا جال تیار ہوتا رہتا ہے۔ دونوں ممالک کے سپر برین اس سلسلے میں سازشیں بٹتے رہتے ہیں جن پر عمل کرانے کی ذمہ داری ان کے ایجنٹوں کی ہوتی ہے۔ یہ ایجنٹ ہر ملک کی اہم ہستیوں کے گرد گھیرا ڈالے رہتے ہیں۔ اس ملک میں بھی ہیں، جس طرح یہ دونوں سپر پاورز تمام ترقی پذیر ممالک میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنا چاہتی ہیں یہاں بھی یہی چاہ رہی ہیں۔ ”وہ نہایت نپے تلے انداز میں بول رہی تھی۔“ ”دونوں بڑی طاقتوں کے سیاسی نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یوں کہ ہر ملک میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو برسر اقتدار ہوں یا اقتدار سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو کسی نہ کسی نظریے سے اثر ضرور قبول کرتے ہیں۔ یہ فطری بات ہے کہ ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسرے کو بھی اپنا ہم خیال بنالے یا بہ الفاظ دیگر اس کی فکر کا رخ اپنے نظریے کی طرف موڑ دے۔ ملک کی خارجہ پالیسی اسی ایک سوال کے گرد گھومتی ہے ہم لوگ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں جس قوت نے ہماری خدمات حاصل کر لیں ہم اسی ملک کے لیے کام کرتے ہیں۔“

”شی کو یہاں آنے کا ٹاسک کس ملک نے دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈیوڈ شانے ہمیں بلایا تھا لیکن وہ پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ ہم واپسی کے لیے تیاری کر رہے تھے کہ گیتا سے ہمارا رابطہ ہو گیا۔ ہمارے ممبر ضرورت پڑنے پر اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اکیلے بھی کوئی کام کوئی مہم سر کر لیتے ہیں۔ لیکن تب جب اوپر والے اجازت دے دیں۔ میں نے اوپر والوں سے اجازت لے لی تھی اس لیے باقی لوگوں کو تو بھیج دیا لیکن خود رک گئی اور گیتا کے ساتھ مل کر اس کے لیے کام کرنے لگی۔“ وہ عام انداز میں بول رہی تھی۔

”وسیم اسے اتار دو۔“ میں نے اس پر ترس کھا کر کہا۔

وسیم اور عبداللہ نے اسے نیچے اتار دیا مگر ہاتھ پیروں کے بندھن نہیں کھولے۔ وہ بندھی ہی رہی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ”ہماری راہ میں کیوں آئی تھیں؟“

”گیتا سے ہمیں یہ ٹاسک ملا تھا کہ آپ کو تلاش کیا جائے۔ اور ہم نے آپ کو ڈھونڈ لیا۔ بس میں بھی گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر آپ گرفتار ہو جاتے تو میں رقم دے کر آپ کو چھڑا لیتی اور اپنے ساتھ لاتی لیکن وہ ڈراما کامیاب نہ ہو سکا۔ گیتا کے مشورے سے ہم نے بیک وقت تین محاذ کھولے تھے۔ اس میں دوسرا محاذ آپ کو یہاں سے آؤٹ کرا کے بھارت بھیجنے کا تھا تاکہ آپ کو وہاں مروادیا جائے آپ کی لاش ملتی تو پوری دنیا کی میڈیا گڑے مردے اکھاڑنے لگتی۔ ہندوستانی خوب واویلا مچاتے اور پورا الزام پاکستانی حکومت پر ڈال کر بدنام کیا جاتا کہ اس دہشت گرد کو پاکستان نے بھیجا ہے۔ اس طرح پاکستانی حکومت کو بلیک میل کیا جاتا۔“

یہ بھارتیوں کی فطرت کا حصہ ہے۔ سانپ ڈسنا بھول سکتا ہے؟

”بی بی اب یہ بھی بتا دو کہ مرشد اور گیتا کے درمیان کس قسم کا معاہدہ تھا؟“

”پوری بات کا مجھے علم نہیں، میں تو صرف تمہیں پھانسنے کے لیے رکی ہوئی تھی۔ مرشد کو جب بھی رقم کی ضرورت ہوتی میں وہ اسے پہنچاتی اس لیے کہ گیتا الگ رہ کر کام کر رہی تھی۔ تمہارے ہاں کی ایجنسیوں کو الجھانے

کے لیے ہی اس نے مجھے رکھا تھا کہ اس کے ملک پر الزام نہ آئے۔“

”وہ مرشد سے کیا کام لے رہی تھی؟“

”مرشد کو اس ملک کی سب سے بڑی روحانی ہستی بنا کر پیش کرتی پھر اس کے مریدوں کی تعداد اتنی بڑھا دیتی کہ اس کے اشارے پر اس ملک کا نظام چلتا۔“

”وہ خود کہاں چھپا بیٹھا ہے؟“

”مجھ سے آخری ملاقات.....“ ابھی وہ کچھ اور کہتی کہ کمرے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور روہی کے سینے میں سوراخ ہو گیا۔ میں باہر کی طرف بھاگا وسم و سفیر بھی باہر کی طرف لپکے۔

وہ کون ہے، یہ راز ہی رہ گیا۔ ہم نے بنگلے کا کونا کونا چھان لیا مگر فار کرنے والا نہیں ملا اور ہم سب تھک ہار کر کمرے میں لوٹ آئے۔

اس کی لاش کو دیکھتے ہوئے عبداللہ بولا۔ ”اب کیا پروگرام ہے؟“

”یہاں سے نکل چلو۔ مرشد کو ڈھونڈنے کے لیے پھر سے جال پھیلا نا پڑے گا۔ اس لیے کہ یہ مہرہ تو ضائع ہو گیا۔ مجھے اس کی باتوں پر بھی یقین نہیں۔ یہ غیر ملکی ضرورت تھی لیکن ہندوستانی عملداری میں گوا، ڈیمین ڈیو وغیرہ بھی ہے۔ وہاں پر نگلی بڑی تعداد میں بسے ہوئے ہیں۔ ان کے چہرے مہرے بھی انگریزوں جیسے ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ہو سکتی ہے۔ ہمیں غلط راہ پر ڈالنے کے لیے اس نے شی والی کہانی سنا دی کیونکہ ٹرینڈ تھی۔ ایسے لوگ مرتے مرتے بھی کام دکھا جاتے ہیں تاکہ دشمن غلط سمت میں چلنے لگے!“

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ کمرے میں موبائل نیون کی آواز گونج اٹھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر آواز کا مخرج سمجھ میں آ گیا۔ وہ آواز بیڈ کے سرہانے سے آرہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر تکیہ ہٹھایا تو نیچے سے موبائل نکل آیا۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ مرشد کا نام چمک رہا تھا۔ میں نے وسم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر کال رسیو کرنے کے لیے انگلی سے دباؤ ڈالا۔ دوسری جانب مرشد ہی تھا۔ وہ اپنی رو میں کہتا چلا گیا۔ ”تم ابھی اور اسی وقت، شہر والے بنگلے پر پہنچو میں وہیں ہوں۔“

قسمت نے ایک بار پھر ساتھ دے دیا تھا۔ گویا مرشد کی بد قسمتی نے اس کی زبانی پتا کھلوا دیا تھا۔

میں نے جواب دیئے بغیر کال کاٹ دی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس لیے میں نے بھی اسی وقت چھاپا مارنے کی ٹھان لی۔ شہر والا بنگلا وہی تھا جو کبھی اس کے بھائی کے تصرف میں تھا۔ اس کا اس بنگلے پر ہونا یہی ثابت کر رہا تھا کہ اس نے بھائی کے بچوں کو وہاں سے چلتا کر دیا ہے۔ یوں بھی وہاں ہوگا اس بات پر کسی کو یقین نہ آتا اس لیے کہ اس نے اپنی بیٹی اور بھائی کے بیٹے کے ساتھ جو کچھ کیا تھا یہ ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کے کھلے دشمن بن چکے تھے۔ اس لیے اس کا وہاں جانا ناممکن بات تھی۔ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

”فورا چلو۔ مرشد کا پتا لگ گیا ہے۔“ کہہ کر میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

مجھے دروازے کی جانب بڑھتے دیکھ وسم نے کہا۔ ”او بھائی پہلے منہ ہاتھ دھو لیں۔ بال اس طرح بکھرے ہوئے ہیں جیسے بالوں میں بم پھٹا ہو۔“

میں نے اس کا کہا پورا کیا۔ وسیم اور عبداللہ نے بھی منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کر لی تھی۔ اب ہم ہر طرح سے ایک شریف شہری نظر آ رہے تھے۔ ٹہلتے ہوئے اس بنگلے سے نکلے اور مرکزی دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

گیٹ پر وہی چوکیدار مستعد بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ ہم آرام سے باہر آ گئے۔ ہماری گاڑی زیادہ دور نہیں تھی۔ ٹہلتے ہوئے اس میں جا بیٹھے اور واپس بنگلے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں میں نے وسیم سے کہا۔ ”تم اپنے بندوں کو بلا لو۔ لوکیشن یاد ہے نا؟ مرشد کے بھائی کا بنگلا۔ وہ وہیں چھپا ہوا ہے؟“

”ہاں مجھے لوکیشن یاد ہے۔“ کہہ کر وہ اپنے بندوں کو بلانے کے لیے کال کرنے لگا۔ ”بنگلے میں پہنچ کر سفیر سے مل کر سوچیں گے کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔ اس لیے کہ آج نہیں تو کبھی نہیں۔“ میں نے کہا تھا کہ عبداللہ نے بریک دبا دیا۔ یکا یک بریک دبنے سے میں آگے کی جانب جھک گیا۔ اگر ہاتھ آگے نہ بڑھا کر سہارا لیتا تو میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا جاتا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا کیونکہ عبداللہ کی ہنسی جو سنائی دے گئی تھی۔

”آپ سفیر سے ملنے کی سوچ رہے ہیں اور وہ آپ کے پیچھے بڑے آرام سے چل رہا ہے۔“ عبداللہ کے کہنے پر میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ واقعی اس کی کار میرے پیچھے ہی تھی۔ پتا نہیں کب سے وہ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”بڑے بڑے ہوٹلوں میں تو اکثر چائے پیتے ہو ایسا کرو پارک کے پاس جو چائے والے کاٹھیا ہے اس پر روک لینا۔ آج ہم سڑک چھاپ چائے کا مزہ لیں گے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا اور کچھ آگے جاتے ہی اس نے کار روک دی۔ سامنے ایک چائے کا ٹھیلہ لگا ہوا تھا۔ لوگ ادھر ادھر پارک کی منڈیروں پر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ میں نے کار سے سر باہر نکال کر کہا۔ ”لالہ چار چائے بناؤ۔ اسٹیشل دودھ پتی۔ ایسا کہ دل خوش ہو جائے۔“ اتنی دیر میں سفیر بھی کار سے اتر کر میرے پاس چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کہا۔ ”یہ تعاقب کا بھوت کب سے سوار ہو گیا؟“

”تعاقب..... نہیں تو۔ میں یوں ہی گزر رہا تھا کہ آپ کی کار نظر آ گئی اور میں پیچھے پیچھے چلنے لگا کہ جہاں آپ رکیں گے وہاں میں بھی رک کر اگلے پروگرام کے بارے میں پوچھ لوں گا۔“ سفیر نے کہا۔ ”آج ہم یہ سوچ کر نکلے ہیں کہ ہم نہیں یا مرشد نہیں۔ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے یہ میں نے جان لیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ کہاں ہے؟“

”شہر والے بنگلے میں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ارے واہ..... لگتا ہے دونوں خاندان میں مصالحت ہو گئی ہے۔“

”مصالحت ہونا قرین قیاس بھی نہیں۔ اس لیے کہ مرشد کس قماش کا ہے۔ یہ تم سب جانتے ہو۔ اس نے

انہیں بزدل قوت بھگا دیا ہوگا اور اب اس بنگلے پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔“ چائے کا سپ لے کر میں نے کہا۔

”یہاں بیٹھنے کی سمجھ نہیں آئی؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”ہمارے لوگ جمع ہو جائیں تب ہی ہم اس بنگلے کا رخ کریں گے۔“

”کیا سب یہاں آئیں گے؟“

”نہیں سب اسی بنگلے کا رخ کریں گے۔ ان کو وقت دینے کے لیے میں یہاں رکا ہوں۔ ایک اہم بات

اور ہے۔ سفیر کا ایک بندہ اپنے بنگلے پر گیا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے وہ جیکٹ لا رہا ہے جس پر گولیاں اثر نہیں کرتیں۔ وہ یہیں آئے گا اسی لیے رکا ہوں۔“ میں نے ہنس کر اسے مطمئن کرنا چاہا۔

میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ سفیر کے موبائل پر کال آگئی۔ اس نے ادھر کی آواز سن کر کہا۔ ”اسی سڑک پر آگے ایک چائے کی دکان ہے۔ وہیں آ جاؤ۔ ہم پارک کے باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔“

سفیر نے موبائل بند کر کے مجھ سے کہا۔ ”وہ بس پہنچنے ہی والا ہے۔“

”تو پھر چائے ختم کر کے ہم بھی چل دیں گے۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ ایک کار آ کر رکی۔ اس میں سے

سفیر کے تین بندے باہر آئے۔ تینوں نے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پیکٹ اٹھا رکھے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان پیکٹوں میں جیکٹ ہے۔ اسے ہم یہاں کھڑے کھڑے پہن نہیں سکتے تھے اس لیے میں نے کہا۔ ”انہیں واپس کار میں ہی رکھ دو۔“

وہ تینوں کار کی طرف مڑ گئے۔ ہم سب بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ کار کی طرف چلتے ہوئے میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”تم نے غور کیا، مرشد کو ایسے لوگوں کا سہارا مل گیا ہے جو الیکٹرونک آلات کا صحیح استعمال کرنا جانتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اس نے خانقاہ میں جس قسم کا نظام لگا رکھا ہے وہ عقل حیران کرنے والا تھا۔ اب جہاں اس نے شیلٹر لے رکھا ہے۔ وہاں بھی ایسا ہی نظام بنا رکھا ہوگا۔ اس لیے ہمیں ہر طرح سے ہوشیار ہو کر اسے لگا کرنا ہے۔“

”جی ہاں اس کا اندازہ مجھے ہے۔“

”تم مانی کو کال کرو۔ اس سے کہو کہ وہ آن لائن رہے۔ ہو سکتا ہے کہ انٹرنیٹ کا کوئی مسئلہ ہو تو اس سے حل کرا سکوں۔ خانقاہ کی طرح وہاں بھی کوئی الیکٹرونک گھڑاک پھیلا ہوا ہو۔“

عبداللہ نے موبائل پر کسی کا نمبر ملایا۔ شاید وہ مانی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب سے نظریں ہٹا کر دیگر لوگوں کو دیکھا۔ وہ سب اپنی اپنی کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم چاروں کے علاوہ سفیر اور وسیم و عبداللہ کے لوگ بھی تھے۔ ایک چھوٹی سی پارٹی بن چکی تھی۔ میں نے کار میں داخل ہوتے ہوئے سیٹ پر رکھے ہتھیاروں پر نظر ڈالی اچھی خاصی تعداد میں اسلحہ رکھا تھا۔ میں نے ہنستے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بھائی میاں، یہ اتنا کچھ لے آئے ہو کیا کسی ملک پر چڑھائی کرنا ہے؟“

وسیم نے اپنی کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا۔ ”اتنا ہی میری گاڑی میں بھی ہے۔“

”اور اگر راستے میں چیک پوائنٹ آ گیا پھر کیا کرو گے؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”آج کل پولیس

والے اسنیپ چیکنگ پر زور دے رہے ہیں۔“

”تب کی تب دیکھی جائے گی۔ احتیاطاً لے لیا ہے۔ بدشگونی نہ کریں۔ ہم بخیر و عافیت مرشد تک پہنچ

جائیں گے اور اس وقت اس کی ضرورت پڑے گی۔“ وہ بھی ہنستے ہوئے بولا اور کار آگے بڑھالے گیا۔ ہم سب تین گاڑیوں میں سوار تھے۔ ایک ہماری، ہم سے آگے دسیم کی کار تھی اور میرے پیچھے سفیر اور عبداللہ والی۔ یہ چھوٹا سا قافلہ مرشد کے بنگلے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

ہم ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ یکا یک میری کار میں ایک آواز گونجی۔ ”خوش آمدید میرے پیارے دشمن خوش آمدید۔“

اس آواز کو سنتے ہی میں ہی نہیں۔ کار میں سوار سب کے سب ہوشیار ہو گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ہر ایک کی متلاشی نظروں میں ایک ہی سوال تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی۔ تبھی وہ آواز پھر سنائی دی۔ ”شہباز تم غلط سمت میں بڑھ رہے ہو۔ میں بھائی کے بنگلے میں نہیں ہوں۔ وہ فون میں نے خود کیا تھا، صرف مغالطہ پھیلانے کے لیے۔ تم کیا مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو کہ میں کال کر کے بغیر جانے کہ کون ہے دوسری طرف، اپنے بارے میں بتانا شروع کر دوں..... نہیں میرے پیارے دشمن، وہ میرا ڈراما تھا۔ میں نے تم پر نظر رکھ رکھی تھی۔ اگر میں چاہتا تو تمہیں گیتا کے گھر میں ہی گھیر لیتا۔ تمہاری کار بھی بگڑ ہے۔ اس شہر میں جہاں بھی جاؤ گے میری نظروں میں رہو گے، سگنل مجھے ملتا رہے گا۔ میں خود گیتا سے تنگ آ گیا تھا سی لیے ڈھیل دی کہ تم اسے ختم کر دو اور وہی ہوا۔ اس گھر میں جو کچھ ہوا وہ میں نے سی سی ٹی کیمرے سے دیکھا۔ اب میں نے تمہاری عقل سے بھی اوپر کی ترقی کر لی ہے۔ اس لیے یہی کہوں گا کہ تم پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ایک نئی طاقت بن کر سامنے آ رہا ہوں۔ مجھے سہارا دینے والے ایک نہیں کئی بڑی طاقتیں ہیں اگر تم میرے ساتھ شامل ہو گئے تو سمجھ لو دنیا کے طاقتور ترین آدمی کہلاؤ گے۔“

”میں نے یہی دیکھا اور پڑھا ہے کہ اچھائی کے ساتھ ایک اور طاقت ہے جو برائی کی طاقت کہلاتی ہے اور وہ شیطان کی غلام کہلاتی ہے۔ کیا تم شیطان ہو؟“

”شیطان ہا ہا ہا..... جب میں خانقاہ میں بیٹھتا تھا اور سب کے سامنے اللہ اللہ کرتا تھا اس وقت بھی میں شیطان کی پرستش کرتا تھا لیکن اب میں اس سے بھی آگے بڑھ چکا ہوں۔ بولو میرا ساتھ دو گے یا میں اسی وقت اس کار کو یہیں سے بیٹھے بیٹھے تباہ کر دوں؟“

اس کی یہ دھمکی مجھے الجھا گئی۔ اگر یہ کار بگڑ ہے۔ اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو وہ دیکھ رہا ہے تو اس کے لیے اس کار کو دھماکے سے اڑا دینا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ اس نے کار میں کیمرہ وغیرہ لگاتے ہوئے دھماکا خیز مواد بھی رکھ دیا ہوگا، اب میں کیا کروں۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے پھر کہا۔ ”مجھے جواب ابھی چاہیے۔ جلد بولو؟“

میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا اور ٹوٹے بکھرے لہجے میں کہا۔ ”پہلے میں بالمشافہ تم سے ملوں گا۔ میری کچھ شرائط ہیں انہیں تم نے مان لیا تو میں تمہارا ساتھ دینے پر غور کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں راستہ بتا رہا ہوں۔ اس پر چلنا شروع کر دو۔ مجھ تک پہنچ جاؤ گے۔“

”نہیں میں اس گاڑی کو استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ تم اپنی گاڑی بھیجو۔ میں اپنے دوستوں کو واپس بھیج رہا

ہوں۔“

”ہاں یہ بہتر ہے۔ میں کنوئیں بھیج رہا ہوں۔ اسی جگہ ٹھہرے رہو۔“

آواز آنا بند ہوئی تو میں کار سے اتر گیا۔ جیسے ہی مرشد کی آواز سنائی دی تھی ڈرائیور نے کار سائیڈ پر لگا دی تھی۔ مجھے رکے دیکھ سب رک گئے تھے۔ میں نے نیچے اترتے ہی اشارے سے سب کو قریب آنے کا کہا اور خود اس کار سے دور ہوتا چلا گیا۔ سڑک سے نیچے اتر کر میں کھڑا ہو گیا تھا۔ سفیر، وسیم، عبداللہ بھی نزدیک آ گئے تب میں نے انہیں صورت حال بتائی اور کہا۔ ”اس وقت تم سب دور ہٹ جاؤ جیسے میں اکیلا ہوں لیکن فاصلہ رکھ کر کوئی ایک تعاقب کرے گا۔ باقی سب رابطے میں رہیں گے مگر پیچھے نہیں آئیں گے۔ ہو سکتا ہے ہماری تمام گاڑیاں بگڑ ہوں۔ اب تم سب بکھر جاؤ۔“

انہیں سمجھا کر میں واپس اپنی کار میں جا بیٹھا۔ وہ سب اپنی اپنی کار میں بیٹھ کر آگے بڑھ گئے۔ میرے ساتھ جو لوگ تھے میں نے انہیں بھی بھیج دیا۔ اب میں اس کار میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ بمشکل دس منٹ گزرے تھے کہ ایک سیاہ رنگ کی وین آ کر رکی اور اس سے دو بندے اترے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ریوالور تھے۔ ان میں سے ایک نے آکر کہا۔ ”ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔“

میں نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ ”میں تو کب سے تمہارا منتظر تھا، چلو کہاں چلنا ہے؟“

”اس وین میں بیٹھ جائیں۔“ اس نے جواب میں کہا۔

میں نے ایک نظر اس وین پر ڈالی۔ اس سیاہ وین کے شیشے بھی کالے تھے۔ ابھی اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کا دروازہ کھل گیا اور میں خود ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بعد میں دو لوگ اور آ کر بیٹھ گئے اور وین چل پڑی۔ کس راستے پر ہم بڑھ رہے ہیں اس کا کچھ پتا نہ تھا۔ میں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی نہ کوئی تعاقب میں ہو گا۔ اس وجہ سے بھی میں مطمئن تھا کہ عقب سے میری گدی پر کسی نے پستول کا دستہ مارا اور میں چکر اکر الٹ گیا پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟

جب ہوش آیا تو میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ مجھے ایک موٹی زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے برابر میں عبداللہ، وسیم اور سفیر بھی کھڑے تھے لیکن اس حالت میں کہ تمام کے تمام زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے، بالکل کسی ملبوساتی فلم کا منظر تھا۔ سب کے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے کیونکہ زنجیر کا سراچھت میں لگے کنڈے سے منسلک تھا۔ اس ہال نما کمرے کا ماحول بھی عجیب سا تھا۔ اس کمرے کی ہر چیز سیاہ تھی۔ درود دیوار سیاہ، فرنیچر و پردے سیاہ، چھت اور فرش بھی سیاہ۔ بالکل سامنے زمین سے دو ڈھائی فٹ اونچا چبوترہ انما اسٹیج تھا جس پر نصف دائرے میں آٹھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ درمیانی کرسی جو نسبتاً اونچی تھی۔ صرف وہی خالی تھی۔ باقی سب پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب نئے چہرے تھے۔ اس سے پہلے میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ کمرے میں چبھتا ہوا سنانا تھا۔ ایسا سنانا کہ سوئی بھی گرے تو آواز گونج جائے۔ میرے تمام ساتھی خاموش تھے مگر چہرے پر خوف کی علامت نہیں تھی۔ وہ سب ہوش میں تھے اور سب کی نگاہیں اسٹیج کی طرف تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی ڈراما شروع ہونے والا ہو یا کوئی فلم دکھائی جائے گی، جس کے وہ سب منتظر ہیں۔ اور واقعی اسٹیج کے عقبی دیوار پر روشنی پڑی اور وہ دیوار چمکنے لگی۔ اس دیوار پر ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ مرشد کی تصویر۔ چمکتی دیوار پر تصویر اور بھی چمکنے لگی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ساز بجنے کی آواز گونجنے لگی۔ ایسی مدھر آواز تھی کہ ہاتھوں میں نیند اتر آئے۔ ایسی میٹھی دھن میں نے پہلی بار سنی تھی۔ پلکیں بوجھل ہونے لگی

تھیں کہ ایک چھنا کا سا ہوا۔ جاز پر رول کی چوٹ پڑی تھی۔ اسٹیج پر بیٹھے تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ ادب سے سب نے ہاتھ باندھ لیے تھے۔ تبھی دیوار درمیان سے شق ہوئی اور ایک ہیولہ سا باہر آیا۔ اس کے پیچھے تیز روشنی تھی۔ اس لیے چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ روشن دیوار اور عقب میں سرچ لائٹ۔ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ باہر آنے والا اپنے تلے قدم اٹھاتا ہوا خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

عقب کی دیوار برابر ہو گئی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی آنا بند ہوئی تو اس شخص کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے پر پھیلی خباثت دکھائی دینے لگی۔ وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ تن بدن میں آگ لگا رہی تھی۔

اس نے سفید سوٹ پہن رکھا تھا۔ میچ کرتی ٹائی بھی باندھ رکھی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے جتنی بار دیکھا تھا تو وہ اسلامی پوشاک میں نظر آیا تھا۔ لمبی عبا۔ سر پر جناح کیپ یا پگڑی۔ مٹھی بھر داڑھی۔ لیکن اس وقت اس کے چہرے پر داڑھی بھی نہیں تھی۔ وہ کلین شیو تھا۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ بولا۔ ”کیا آنکھوں سے نکلنے کا ارادہ ہے؟“

”میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگ کس طرح ایک چہرے پر کئی چہرے سجالیتے ہیں۔“

”یہی تو عقلمندی کی نشانی ہے۔ ہمارے جیسے لوگ دوہری زندگی نہ جنیں تو گولیوں کا نشانہ بن جائیں۔ میرے جو مرید ہیں وہ مجھے کسی بھی لباس میں دیکھیں ان کا اعتقاد برقرار رہے گا۔ وہ مجھے اسی طرح تعظیم دیں گے اس لیے کہ انہیں اور کسی چیز سے مطلب نہیں ہے۔ میں ان کے لیے جو حکم جاری کروں گا وہ اسے پورا ضرور کریں گے۔“

”میں ٹھہرا سیدھا سادہ آدمی، ایسی چالاکی کہاں سے حاصل کروں۔“ میں نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”ایسا شخص جو پنج وقتہ نمازیں پڑھتا ہو، شرعی انداز میں زندگی گزارتا ہو، ڈھیروں مریدوں کا پیر ہو وہ ایک لمحے میں اپنی داڑھی تک منڈا دے گا۔ اسی لیے میں حیرت میں ہوں۔“

”ابھی تم نے دیکھا کیا ہے۔ اب میں وہ نہیں رہا جسے یہ فکر ہو کہ کہیں مجھ سے کوئی گدی نہ چھین لے۔ اب مجھے گدی کی بھی پروا نہیں۔ اس لیے کہ اب میں پورے ملک کا مالک بننے والا ہوں۔“ اس نے سانس لی پھر بولا۔ ”میرے ساتھ مل جاؤ گے تو زندگی سنور جائے گی۔“ وہ کچھ اور کہتا کہ رک گیا۔ اس نے کلائی اٹھا کر اپنی گھڑی کو دیکھا۔ گھڑی دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک تناؤ سا آ گیا۔ پھر اس نے اپنی داہنی جانب بیٹھے شخص کی طرف دیکھا۔ اس تیز روشنی میں اس کے چہرے پہ چھائی غصے کی جھلک چھپ نہ سکی اس نے تندہی سے ایک شخص سے کہا۔ ”تم نے ان لوگوں کی تلاشی لی؟“

”یس سر۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”پھر سے تلاشی لو۔“ مرشد کا لہجہ تپا ہوا تھا۔ ”ان میں سے کسی کے پاس الیکٹرونک ڈیوائس ہے جو رک

رک کر سگنل نشر کر رہا ہے۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہمارے قریب آ کر بولا۔ ”شہباز کی بھی تلاشی لینی ہے؟“

”نہیں ایسا نہ کرنا کیونکہ.....“ وسیم جو اتنی دیر سے خاموش تھا بول اٹھا لیکن اس کا جملہ مرشد کی ڈانٹ نے

پورا ہونے نہیں دیا۔ وہ چیخ کر بولا تھا۔

”وسیم میں تمہاری فطرت سے واقف ہوں۔ بالکل خاموش رہو۔ تم بول کر ذہن بٹانا چاہتے ہو۔“
”لوجی میں خاموش ہو جاتا ہوں۔“ وسیم نے کہا۔

وہ شخص ہر ایک کی تلاشی لینے لگا۔ نہایت باریک بینی سے وہ تلاشی لے رہا تھا۔ ایک ایک کی تلاشی لینے کے بعد بولا۔ ”ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی ہے۔“ وہ پریشان کن نظروں سے مرشد کی طرف دیکھ رہا تھا اور مرشد اپنی گھڑی کی طرف۔

”ابھی بھی سگنل نشر ہو رہے ہیں۔“ مرشد نے کڑے لہجے میں کہا۔

”تم خواہ خواہ اس بے چارے کو پریشان کر رہے ہو۔ میں خود بتائے دیتا ہوں کہ وہ ڈیوائس کس کے پاس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن شرط ہے کہ سب کے ہاتھ کھول دو۔ یہ بھی انسان ہیں۔ خون کی روانی رک رہی ہو گی۔“

”ان کے ہاتھ پیر کھول دو لیکن کڑی نظر رکھو۔“ مرشد نے کہا۔ ابھی اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم سب کے بندھے ہوئے ہاتھ پیر آزاد ہو گئے۔ شاید ان زنجیروں کو آپریٹ کہیں اور سے کیا جا رہا تھا اور لاک کرنے کا سسٹم بھی کہیں اور سے تھا۔

زنجیر کا لاک کھلتے ہی سب اپنی اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہو گئے۔ اور ہاتھ پیر ہلا کر خون کی روانی درست کرنے لگے۔

میں نے مرشد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ ساری زندگی اس ڈیوائس کو ڈھونڈ نہیں پائے گا۔ مجھ سے سنو۔“
وہاں بیٹھے تمام لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرے کوٹ کا اوپر والا بٹن ’بٹن نہیں ٹرانس میٹر ہے۔ اس کمرے میں جتنی باتیں ہوئی ہیں وہ سب میرے دوست دور بیٹھے سن رہے ہیں۔“

میرا جملہ ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ شخص لپکا اور میرے بٹن کو کھینچ کر توڑ لیا۔ پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔

”ادھر لاؤ۔“ مرشد نے ہتھیلی پھیلا دی۔

اس شخص نے وہ بٹن اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر ہاتھ جیب کی طرف لے گیا۔ جیب کی طرف جاتے اس کے ہاتھ کو سب نے دیکھا لیکن جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا پستول تھا۔ اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔ میں مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ گولی میرے سینے میں اتارے گا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں لیکن جب دھماکا ہوا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری تلاشی لینے والا شخص سینہ پکڑے ٹوٹی ہوئی عمارت کی طرح سلوموشن میں گر رہا تھا۔ مرشد نے دوبارہ ٹریگر دبا دوسرا دھماکا ہوا۔ وہ گولی بھی اسی کے سینے میں دھنسی۔ مرشد نے پستول کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں غلطی کو معاف کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ ایک چھوٹی سی غلطی بنیاد ہلا دیتی ہے۔ میرے نزدیک لا پرواہی سب سے بڑی غلطی ہے۔ لا پرواہی کا نتیجہ ہے کہ تمہارے پاس ٹرانسمیٹر رہ گیا۔ اب کوئی دوسرا

ایسی غلطی نہیں کرے۔ یہی پیغام دینے کے لیے میں نے اسے شوٹ کیا ہے۔“
وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ رک کر اس نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ جس طرح دھیرے دھیرے سرچ لائٹ گھومتی ہے اسی طرح اس کا سر گھوم رہا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کرسیوں پر بیٹھے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ ”جانتے ہو میں نے یہ میٹنگ کال کیوں کی ہے؟“
”جب تم خود بولنے پر آمادہ ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بولتے رہو۔“

”اس کی واحد وجہ تم خود ہو۔ تمہارے ایسا بہادر بندہ جب شہید ہونے لگے تو آس پاس بڑے آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ تم نے آدھی زندگی مجھ سے لڑتے ہوئے گزار دی اور اب بھی میرے ساتھ شامل ہونے پر تیار نہیں ہو اس لیے تمہاری موت بھی شاندار ہونا چاہیے۔ میں یہاں تمہاری شاندار موت کا نظارہ کرنے آیا ہوں۔“
”موت۔ تم مجھے موت دو گے؟ تم سے بڑا بے وقوف میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر تمہارے پاس عقل ہے تو سوچو کہ میں اتنی آسانی سے تمہارے پاس کیوں آ گیا جب کہ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔ کیا مجھ جیسا آدمی اتنی آسانی سے موت کے پھندے میں خود پیر رکھ سکتا ہے۔ تم اپنے جال میں خود پھنس چکے ہو۔“ ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دھماکا سا ہوا۔ دھماکا ہوتے ہی مرشد نے اسلج کے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ دیوار پھر سے شق ہوئی اور وہ اس میں غائب ہو گیا۔ اور دیوار پھر سے برابر ہو گئی تھی۔

دھائیں؟ دھائیں؟ یکے بعد دیگر کئی دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے اتنے شدید تھے کہ دور و نزدیک کی عمارتیں لرز اٹھیں۔ خود مجھے بھی قدموں تلے لرزہ محسوس ہوا تھا۔ دھماکے باہر ہوئے تھے اور بھگدڑ اندر مچی تھی۔ کرسیوں پر بیٹھے لوگ دروازوں کی طرف دوڑے تھے۔ میرے ساتھی بھی ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے کہ میں نے کہا۔ ”کوئی باہر نکل نہ پائے۔“

میری آواز کی گونج ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ سفیر، وسیم، عبداللہ فرار ہونے کی کوشش کرنے والوں پر پل پڑے تھے۔ ایک ایک نے دو دو تین تین سنبھال لیا تھا لیکن ان میں سے صرف ایک ایسا تھا جو ٹرینڈ لڑکا نظر آیا، باقی سب ریت کی دیوار ثابت ہوئے ایک کے بعد ایک گرتے چلے گئے۔ ان سے منٹ کروسیم نے کہا۔

”لگتا ہے کہ شمشاد نے کام دکھا دیا۔ مجھ پر حملہ ہونے سے چند منٹ پہلے شمشاد قریب تھا۔ اس نے کار سے دور ہوتے ہوئے کہا تھا۔ میں ایک ضروری کام سے الگ ہو رہا ہوں۔“

ہال نما کمرے میں یہاں سے وہاں تک وہ سب پڑے تھے لیکن مرشد ان میں شامل نہیں تھا جب کہ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ اب یہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ”اب ہمیں باہر نکلنا چاہیے۔“ کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر ہمیں بھی دشمن سمجھ لیں۔“

”اسلج کی عقبی دیوار کو توڑ دو۔“

اتنا کہتے ہی سفیر اور وسیم نے کرسیوں سے اس دیوار پر ہلہ بول دیا۔

”میرے بھائی دیوار نما دروازہ کھولنے کے لیے ادھر بھی کوئی مٹن وغیرہ ہوگا۔“

میری بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ دیوار کا جائزہ لینے لگے۔ بلاخر ایک کڑی انہیں مل گئی جسے کھینچے ہی دیوار شق ہوئی اور ہم دوسرے طرف پہنچ گئے۔

ہم افراق فری میں باہر آئے۔ اور دوسری سڑک کی طرف بڑھے اس لیے کہ سامنے والی سڑک پر دو جیپ کھڑی تھیں۔ اس میں بیٹھے ہوئے افراد دستی بم پھینک رہے تھے۔ وہ عمارت جو چند لمحے پہلے اپنی مثال آپ تھی مٹی کے گھروندے کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ بلے میں دب کر کتنے لوگ مرے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ فائر بریگیڈ اور پولیس کی گاڑیاں پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ دونوں جیپ انہیں آتا دیکھ کر وہاں سے چل دیں۔

تماش بینوں نے بھیڑ لگا دی تھی انہی کے درمیان میں ہم بھی کھڑے تھے۔ میرے برابر میں وسیم اور سفیر تھے۔ ہم سب کی نظریں بلے پر جمی ہوئی تھیں۔

ہم سب ایک ٹک ادھر ہی دیکھ رہے تھے کہ سفیر نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ”جلدی ہری آپ وہ بھاگ رہا ہے۔“

”کہاں؟ کس طرف۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹھیں۔“ اس نے وہاں کھڑی ایک کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کہا۔ ”یہ کار عبد اللہ کی ہے۔“

میں پھرتی سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”وسیم سے کہو کہ وہ عبد اللہ کے آدمیوں کو لے کر گھر چلا جائے۔“ کہہ کر اس نے ایک سفید کار کے پیچھے اپنی کار لگا دی۔ اس کار میں کون ہے میں دیکھ نہیں پایا تھا۔ جو بھی تھا وہ اکیلا تھا اسے کار ڈرائیو کرتے میں نے دیکھ لیا تھا۔“

”اس کار میں کون ہے؟“

”آپ نے غور نہیں کیا، وہ مرشد ہے۔“ سفید کار اب نسبتاً دیران علاقے میں پہنچ چکی تھی تبھی میری نظر بیک ویو مرر پر پڑی ہمارے پیچھے ایک پولیس وین تھی۔ ”سفیر ہمارے پیچھے پولیس وین لگی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اب اگر وزیر اعظم بھی آجائیں تو بھی میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سانپ نظر آ جائے تو اسے مار دینا ہی عقلمندی ہے۔ پولیس وین کو میں نے بہت پہلے ہی دیکھ لیا تھا“ سفیر نے جواب دے کر رفتار مزید بڑھا دی۔ کار ہوا میں اڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سڑکیں ہمواری میں بے مثال تھیں اگر ادب دکھا بڑسڑکیں ہوتیں تو یقیناً اب تک حادثہ ہو چکا ہوتا۔

”کار کی رفتار تیز ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں میں بھی دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے غور کیا۔ کرسی پر جتنے لوگ بیٹھے تھے ان میں کوئی ایک بھی نہیں بچا۔“

”ہاں، میں نے بھی دیکھا ہے۔ وہ سب گرینیڈ سے نہیں مرے۔ کوئی ان کو چین چین کر گولیاں مار رہا تھا۔ وہاں اتنی بھیڑ تھی کہ پستول بردار نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ صرف ایک بار ایک پولیس انسپکٹر کو گولی چلاتے دیکھا تھا۔“ میں نے کہا اور پیچھے مڑ کر دیکھا پولیس وین کے پائیدان پر انسپکٹر کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے پھر فائر کیا اور سفید کار کا دھیل دھما کے سے پھٹ گیا۔ کار لہرائی اور پھر رک گئی کیونکہ ساتھ ہی ساتھ ایک اور دھماکا ہوا تھا۔

انسپکٹر نے موبائل دین روک دی تھی اور اتر کر مرشد کی گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ ”تمہارا یہ وائٹ سوٹ جتنا سفید ہے کردار اتنا ہی کالا ہے ایسے آدمی کو زندہ نہیں چھوڑا جاسکتا۔“ انسپکٹر نے کار میں بیٹھے مرشد سے کہا۔

”بے وقوف انسپکٹر میں تمہیں سپینڈ کرادوں گا تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔“ اندر بیٹھے مرشد نے کہا۔

”تم مجھے قانون کی دھمکی دے رہے ہو لو میں نے قانون کی وردی اتار دی۔“ کہہ کر اس نے شرٹ اتار پھینکی۔ ”اب میں سول ڈریس میں ہوں۔ میں تجھے اسی لباس میں سزا دوں گا تیرے آدمیوں نے میرا گھر اجاڑا تھا۔ تب سے میں تیری تلاش میں تھا۔ آج موقع ملا ہے تو تجھے زندہ کیسے چھوڑ دوں۔“ کہہ کر اس نے سفید سوٹ میں ملبوس مرشد کے داہنے پیر میں گولی ماری۔

مرشد کو اندازہ نہ تھا کہ انسپکٹر فائر کر دے گا۔ مرشد بھی چونکا تھا۔ اس نے بھی جوابی فائر کیا۔ گولی انسپکٹر کے شانے کو چھوتی ہوئی گزری۔

”اب میں تجھے گرفتار کروں گا اور حوالات اس وقت تک رکھوں گا جب تک تو مر نہیں جاتا۔ تو اذیت میں تڑپے گا اور مجھے چین ملے گا۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”شہباز پولیس کی نظروں میں تم بھی مجرم ہو اور تم ہمہ وقت میری نظروں میں تھے۔ تمہیں میں نے جان بوجھ کر موقع دیا۔ اب ایک اور موقع دے رہا ہوں تم یہاں سے بھاگ جاؤ، ورنہ.....“

اس نے پھر فائر کیا۔ اس بار اس نے مرشد کے شانے میں گولی ماری تھی۔

بھیڑ جمع ہو رہی تھی۔ جو کام مجھے کرنا تھا وہ اس انسپکٹر نے کر دیا تھا۔ اب میرا وہاں رکنا بے معنی تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”کارری درس کرو۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے دور ہٹ جانا ہے۔“

وہاں سے ہم واپس اسی بنگلے میں آئے جہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ بنگلا اب گیسٹ ہاؤس جیسا بن چکا تھا۔ وسیم، سفیر اور عبداللہ کے آدمی مختلف کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس لیے بنگلے پر پہنچنے کے بعد میں نے سب سے پہلے ریاست خان کو بلایا۔ دو چار ادھر کی ادھر باتوں کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”تم نے وطن کی خاطر بہت کچھ کیا۔ وطن کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں اب یہ بتا رہی ہوں کہ ہمارا تعلق وطن کی کسی ایجنسی سے نہیں ہے۔ ہم نجی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ اتفاق ہے کہ اس جنگ میں ملک دشمن طاقتیں بھی آتی چلی گئیں اور جنگ کا نقشہ بدل گیا۔“

”اچھا آپ لوگ آئی ایس آئی کے اہلکار نہیں ہیں؟“ ریاست خان کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں، ہم عام سے شہری ہیں لیکن محبت وطن ہیں، جب وطن پر بات آئی تو ہم فوج کی طرح سینہ سپر ہو گئے اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ وطن کی سلامتی پر جب بات آتی ہے تو ہر شہری پر فرض ہو جاتا ہے کہ وطن دشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جائے۔ ہم نے یہی کیا ہے۔ صرف ہم نے نہیں تم نے بھی یہی کیا۔ تم بھی وطن کی ہی محبت میں ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔ وطن کو تمہاری ضرورت ہے۔ اپنے ماضی کو بھلا کر تم کوئی نیا کاروبار کرو۔ ہم سب دو ایک دن میں اس ملک کو چھوڑ رہے ہیں۔“

”اگر مناسب سمجھیں تو اپنے ساتھ ہمیں بھی لے لیں۔“

”ہم کہاں جائیں گے اس کا خود ہمیں بھی پتا نہیں۔ تمہارا فون نمبر میرے پاس ہے۔ اگر کہیں سکون ملا تو بلا لیں گے۔ فی الحال تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ گلگت چلے جاؤ اور وہیں کوئی مناسب سا کام کرو۔“

ریاست خان آبدیدہ ہو گیا تھا مگر اسے جانا پڑا۔ اسی طرح وسیم سفیر اور عبداللہ نے بھی اپنے اپنے آدمیوں کے واپس بھیج دیا۔ ان الجھنوں سے فرصت پا کر جب ہم چاروں یعنی وسیم، سفیر، عبداللہ اور میں اکٹھے بیٹھے تو مرشد کا ذکر آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”اس کہادت پر آج یقین آیا ہے کہ ماہر تیراک ہمیشہ اتھلے پانی میں ڈوبتا ہے۔ مرشد نے خود کو بہت طاقت ور بنا لیا تھا۔ کرنل صاحب جنہوں نے ایک بار پہلے بھی میری مدد کی تھی۔ ان کا کچھ دیر پہلے فون آیا تھا وہ بتا رہے تھے کہ وہ لوگ بھی مرشد کی نگرانی کر رہے تھے۔ خبر تھی کہ مرشد وطن دشمنوں سے مل گیا ہے۔ انہی کی ایماء پر انسپکٹر نے اپنا بدلہ لیا ہے۔ اس دن انسپکٹر ہی نہیں وہاں کئی ایسے افراد تھے جو مرشد سے بدلہ لینا چاہتے تھے اور سب نے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا۔ اس گھر سے چھ ایسی لاشیں نکلی ہیں جو دشمن ملک کے ایجنٹ تھے۔ کہیں یہ مسئلہ عالمی نہ بن جائے اس لیے خبروں میں آنے نہیں دیا ہے۔ انہوں نے بھی مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں وطن چھوڑ دوں اس لیے کہ عدالت میں کیس ہے اور مرشد مارا گیا ہے۔ کہیں کوئی اس کا ہمدرد ہمیں نہ ٹھنچ لے۔“

”اب کیا کرنا ہے۔“ وسیم نے پوچھا۔

”ٹھہرو بتاتا ہوں۔“ کہہ کر میں نے گھر فون کیا۔ بابا کو ساری بات بتا کر کہا۔ ”ہم نے یہ جنگ جیت تولی ہے لیکن اب یہاں رہنا ہمارے لیے مناسب نہیں اس لیے فیصلہ کیا ہے کہ ہم وطن سے دور جا کر نئی زندگی شروع کریں گے۔“

”یہ تمہارا فیصلہ ہے۔ ایک فیصلہ ہم نے بھی کیا ہے اس لیے تم جتنی جلد ممکن ہو گھر آ جاؤ تمہاری ماں تمہاری منتظر ہے۔“ بابا نے اتنا کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔

ہم لوگ اسی دن گھر کے لیے نکل گئے۔ اس لیے کہ بابا نے گول مول بات کر کے مجھے الجھا دیا تھا وہاں پہنچے تو حویلی میں خوب رونق تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ صوبی بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ پہنچی ہوئی تھی خوب رونق لگی تھی میری نظریں سویرا کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ پتا نہیں کہاں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس ظالمانہ برتاؤ کی وجہ اس وقت سامنے آئی جب رات بابا نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ اماں پہلے سے وہاں موجود تھیں بابا نے ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد کہا۔ ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے، سویرا سے بھی پوچھ لیا۔ تم جہاں جانا چاہتے ہو جا سکتے ہو لیکن اب سویرا تمہارے ہی ساتھ رہے گی۔ صبح نکاح پڑھا دیا جائے گا۔“

بابا کی زبان سے اپنے دل کی بات سن کر میں خوشی سے نہال ہو گیا لیکن زبان سے صرف ایک جملہ کہا۔

”جیسی آپ کی مرضی!“

”ہاں تمہارے ساتھ ایک نکاح اور بھی ہوگا۔ عبداللہ اور بانو کا نکاح۔ کیوں کہ عبداللہ کو بھی ایک سہارے

کی ضرورت ہے۔ وہ اور بانو ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں یہی بہتر ہے۔“

بابا کی اجازت پا کر میں خوشی سے باہر والے کمرے میں آیا تو وہاں کا ماحول ہی کچھ اور تھا سب مل کر عبداللہ کو چھیڑ رہے تھے اس لیے کہ مونا کے ذریعہ یہ خبر باہر آ گئی تھی جسے سفیر نے براڈ کاسٹ کر دیا تھا۔ عبداللہ

اس طرح شرمارہا تھا جیسے وہ خود دلہن ہو۔ مجھے دیکھتے ہی سفیر اور وسیم نے مشترکہ نعرہ لگایا۔ ”ایک اور دولہا بابو آگئے۔“

وہ رات ایسے گزر گئی جیسے برف تپتی دوپہر میں سورج کی تپش سے پکھل جائے۔ نکاح کے دوسرے ہی دن سفیر نے فون پر دینی کے لیے سب کے ٹکٹ کنفرم کرا لیے۔ مانی نے پہلے ہی ایک پوری عمارت کرائے پر حاصل کر لی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب ہم سب ایک جگہ ایک خاندان کی طرح رہیں گے۔

سامیرا کے خیمہ کے پاس پہنچا تو پہلے سے زیادہ پہرے دار موجود تھے۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر مجھے پہچانتے تھے اس لیے سب نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر تعظیم دی۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ سامیرا کو خبر دے کہ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ وہ اندر خبر دیتا کہ سامیرا خود ہی دروازے پر آگئی۔ اس نے کہا۔ ”تمہیں اندر آنے کی اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں، اندر آ جاؤ۔“

میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ خیمے میں زیادہ تر آرائشی سامان ریٹائٹ کے خیمے کا بچا ہوا تھا۔ اب وہ خیمہ کسی ملکہ کا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک مسند سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے مجھے سامنے بچھی کر سیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔

میں خیمے کا جائزہ لیتے ہوئے بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی کہ میں نے کہا۔ ”آپ کو فتح مبارک۔“ ”یہ فتح میری نہیں ہمارے عوم کی ہے۔ ان دبے کچلے عوام کی جو عرصہ دراز سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اور اس فتح کے لیے ہم سب تمہارے ممنون ہیں۔ اگر تم لوگوں کی مدد نہ ہوتی تو شاید یہ فتح اتنی آسانی سے حاصل نہ ہوتی۔“ سامیرا نے سنجیدہ لہجے میں اقرار کیا۔

”ہمارا مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ مالک کل جو چاہتا ہے وہی ہوتا۔ اس دنیا کے مالک نے آپ کو فتح دلانا چاہی اور فتح مل گئی۔ ہم تو صرف ایک ذریعہ بنے۔ آپ کے سپاہیوں نے بھی جس طرح قربانیاں دی ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ بے شک بہادروں کی ملکہ ہیں۔“

”ان باتوں کو چھوڑو میں نے کس لیے بلایا ہے وہ بتا دوں۔“ کہہ کر اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور دکھاتے ہوئے کہا۔ ”میرے ایک خاص مخبر نے خبر دی ہے کہ پجاری آئی زور ایک گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ دو باہر کے آدمی بھی ہیں۔“

”ہمیں فوراً اس کے خلاف کوئی قدم اٹھالینا چاہیے ورنہ آگے چل کر وہ ہمارے لیے خطرہ ثابت ہوگا۔“ ”بہت بہتر لیکن ہم کون سا قدم اٹھائیں؟“ سامیرا نے سوال کیا۔ ”اس لیے کہ ہمارے مخبر نے خبر دی ہے کہ وہ ایک کمرے میں بند ہو گیا ہے۔ باہر سے اس کا کوئی رابطہ بھی نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے وہ کسی امداد کا منتظر ہو۔ صبح ہونے میں اب دیر بھی نہیں ہے۔ آپ نے آرگون میں داخلے کا کیا سوچا ہے؟“

”پو پھننے کے ساتھ ہم کوچ کریں گے۔ سورج کی پہلی کرن ہم آرگون میں دیکھیں گے۔“

”تو پھر آپ سپاہیوں کو تیاری کا حکم دے دیں۔“

”حکم جاری ہو چکا ہے۔ آرگون میں داخلے کے وقت تم میرے ساتھ رہو گے۔“

”جی بہتر۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اب ذرا میں اپنے ساتھیوں کو بھی یہ خبر دے

دوں کہ وہ چلنے کی تیاری کر لیں۔“

سامیرا کے خیمے سے نکلا تو سپاہیوں میں وہی تازگی، فتح کی سرشاری محسوس کی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ لاشیں اب تک جمع کی جا رہی تھیں۔ میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا اس طرف بڑھتا جا رہا تھا جہاں میں نے وسیم سفیر اور عبداللہ کو چھوڑا تھا۔

وہ سب اب تک اسی طرح زمین پر بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سفیر نے چوٹ کی۔ ”لو جناب لیڈی، کفر تشریف لے آئے۔ ذرا اپنی دنیا میں پہنچنے دو۔ یہ ساری رپورٹ میں نے سویرا باجی کو نہ دی تو کہنا..... بہت پھنے خاں بنتے ہیں نا۔“

میں نے ان کے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ”یہ ساری باتیں بعد میں کر لینا لیکن اب تیاری کر لو۔ ہمیں پو پھننے سے پہلے آرگون میں داخل ہونا ہے اور وہاں ہمارا دشمن ہماری تاک میں بیٹھا ہے۔“

”کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔“

”کیا ڈیوڈ شا کا سراغ مل گیا؟“ وسیم نے پوچھا۔

”ڈیوڈ شا کا نہیں لیکن بڑے پجاری آئی زور کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ ایک گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں جن کے بارے میں اطلاع دینے والے نے کہا ہے کہ وہ باہر کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ڈیوڈ شا ہو۔ کیونکہ وہی پجاری کے ساتھ معبد سے نکلا تھا۔“

”پھر دیر کس بات کی ہے..... چلو دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔“ وسیم نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرا ارادہ بھی یہی تھا لیکن سامیرا کا کہنا ہے کہ پہلے آرگون پر حکومت حاصل کر لی جائے۔ اگر ابھی چھیڑا تو کوئی پریشانی بھی کھڑی ہو سکتی ہے۔ جب وہ کچھ کرتے ہیں تو سنبھال لیا جائے گا۔ پہلے انہیں چھیڑنا مناسب نہیں۔“

”جو حکم ہم تو تابعدار ہیں۔“ وسیم نے سرخم کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

آسمان پر صبح کا ذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سپاہیوں میں جوش و خروش صاف نظر آ رہا تھا جب کہ ابھی وہ ایک خونی جنگ سے فارغ ہوئے تھے۔ کتنے ہی ان کے ساتھی جان کی بازی ہار چکے تھے۔ کتنے ہی ساتھی زخمی پڑے تھے لیکن آرگون پر اپنا پرچم لہرانے کی چاہ میں وہ سب خوشی سے سرشار تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اندر داخل ہوتے ہی ایک اور جنگ نہ شروع ہو جائے اس لیے کہ تہر کی گلیوں میں صرف چھاپا مار جنگ ہو سکتی ہے۔ پجاری آئی زور کم سپاہیوں سے بھی چھاپا مار جنگ لڑ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ڈیوڈ شا ہے۔ وہ ایسی ہی شیطانی حرکت بتا سکتا ہے۔ شاید اسی لیے پجاری آرام سے بیٹھا ہے۔ ایسے ہی خیالات میں گھرا میں سامیرا کی فوج کو صف بندی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔ اتنے چپ چپ کیوں ہو..... کوئی خاص خطرہ محسوس کر رہے ہو کیا؟“ سفیر کی نظروں سے میری خاموشی چھپ نہ سکی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہیں شہر کے اندر چھاپا مار جنگ نہ شروع ہو جائے۔ اس سے ناحق لوگ مارے جائیں گے۔“

”ایسا ہو سکتا ہے۔ ڈیوڈ شا جیسا شاطر جب شہر میں موجود ہو تو ایسا ہونا بعید نہیں۔ وہ ایسا ہی چاہے گا کہ عوام کو ڈھال بنا کر کامیابی حاصل کر لے۔“ سفیر بھی فکر میں ڈوب گیا۔ ”اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم ان کے داخلے سے پہلے شہر میں داخل ہو جائیں۔“

”لیکن سامیرا نے منع کیا ہے۔ اگر ہم اس کے مشورے کو ٹھکرا کر شہر میں داخل ہوتے ہیں تو وہ برا مان سکتی ہے۔“

”اور اگر وہاں کوئی ایسی بات ہوگئی۔ بے قصور شہری لپیٹ میں آتے ہیں تو ان کا خون کس کی گردن پر ہو گا؟“ سفیر نے پتے کی بات کی۔

شہر میں جیسے ہی سامیرا کی فوج داخل ہوتی ہے اور عوام اس کے استقبال کے لیے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آتے ہیں اور اس وقت ڈیوڈ شا کوئی حرکت کرے گا تو بے حساب لوگ مارے جائیں گے۔ کیونکہ ڈیوڈ شا کے پاس آتش ہتھیار ہے۔ گولا بارود کا ذخیرہ ہے۔ بھیڑ میں ایک بھی گولا پھنسا کسی نے مشین گن چلا دی تو سینکڑوں کی تعداد میں لوگ مارے جائیں گے۔ اب میں کچھ زیادہ ہی ایکسائٹڈ ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ سامیرا کی بات مانوں یا سفیر کے کہے پر عمل کروں۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے بگل پھونکنے کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ سامیرا نے قدم بڑھا دیئے ہیں۔ میں نے سفیر کی طرف دیکھا اور پھر عبد اللہ کا ہاتھ پکڑ کر دیم سے کہا۔ ”انشا جی اٹھو اب کوچ کرو۔“

”بڑے شعر یاد آرہے ہیں۔ ہاں ہاں کیوں نہ یاد آئیں گے۔ جانے کا وقت جو آ رہا ہے۔ بجنی سے کیا وعدہ جو نبھانا ہے۔“ سفیر نے اپنی گن اٹھاتے ہوئے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔

سفیدی سحر نمودار ہو چکی تھی۔ اس ہلکی روشنی میں دور تک پھیلی سامیرا کی فوج نظر آرہی تھی۔ اب ان لوگوں نے بڑے بڑے پرچم بھی پھیلا لیے تھے۔ آگے آگے سوار دستہ تھا اس کے پیچھے سامیرا کی سواری اور اس کے پیچھے پیدل دستے۔ سب کے سب نہایت نظم و نسق کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہم تینوں بھی اس فوج کا حصہ بن کر آگے بڑھنے لگے۔ تبھی میری نظر ایک ایسے دستے پر پڑی جس میں کئی چہرے شناسا نظر آئے۔ سب سے آگے ایزارٹ تھا۔ اس کی داہنی جانب شاٹ اور ایمار تھے۔ پیچھے مارٹ اور رائیون، ساتھ میں ایرٹ بھی تھا۔ گویا وہ تمام لوگ جو میرے ساتھ شہر میں خدمت انجام دے رہے تھے لگتا تھا کہ سب کے سب جنگ کے میدان میں آگئے تھے۔ میں ان کی جانب بڑھا۔ جیسے ہی ان کی نظریں مجھ پر پڑی ان کے قدم ردھم سے الگ ہو گئے۔ میں نے اشارے سے ان کو اپنے قریب آنے کو کہا۔

ایک ایک کر کے وہ سب دستے سے باہر آ گئے۔ میں نے ایرٹ سے پوچھا۔ ”اب تک کہاں تھے؟“

”میرے کچھ اپنے بھی وطن کے نام پر مارے گئے ہیں۔ میں ان کو الگ کر رہا تھا۔ بھلے ہی وہ دشمن بن کر

آئے تھے مگر میرے اپنے تھے۔ اس لیے ان کی لاشوں کو بے حرمتی سے بچالیا۔“ اس کی آواز میں ایک کک تھی۔ وہ غمگین تھا۔ لیکن اپنے حصے کی جنگ میں وہ پیچھے نہیں رہا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”رو بیر سے ملاقات ہوئی؟“

”ہاں اسے دیکھا تھا لیکن بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔“

”میں سامیرا سے بات کروں گا۔ وہ تم دونوں کو اہم منصب دے کر اپنے قریب رکھے گی۔“

”اب ملکہ عالیہ ہمیں اس قابل سمجھیں گی؟ کیا وہ ہماری قربانیوں کو یاد رکھیں گی؟“ ایرٹ کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”کیوں نہیں.....“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”وہ تم دونوں کو عزیز رکھتی ہیں۔“

”آپ کی ان سے اس معاملے میں کوئی بات ہوئی ہے؟“

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اور اسے حوصلہ دینے کے لیے کہا۔ ”ہاں ہاں ہوئی ہے۔ میں اپنی دنیا

میں جانے سے قبل تم دونوں کو ایک کردوں گا تاکہ تم لوگ ہنسی خوشی زندگی گزارتے رہو۔“

”کیا رو بیر راضی ہوگی؟“ ایرٹ کے چہرے پر ایک خوشی کی جھلک آگئی۔ یہ تو اس کے دل کی بات تھی جو

میں نے کہی تھی۔

”سامیرا کا حکم وہ کیسے ٹال سکتی ہے۔ میں نے سامیرا سے کہہ دیا ہے کہ وہ رو بیر کو راضی کرے۔“

”اگر ایسا ہو گیا تو میں زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔ رو بیر میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں اس سے

کتنا پیار کرنے لگا ہوں یہ میں آپ کو کیسے بتاؤں۔“

”مجھے اندازہ ہے۔“ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہماری باتوں میں اب تک کسی نے دخل نہیں دیا تھا۔ میرے ساتھی تو اس اجنبی زبان کو سمجھ نہیں رہے تھے

اس لیے خاموش تھے لیکن باقی سب اس لیے چپ تھے کہ حد ادب کا سوال تھا۔ میرے خاموش ہونے کے کافی دیر

تک کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن جب میں ایک قدم آگے بڑھا تو رائیون نے ایرٹ کو چھیڑا۔ ”ایسی خوشی کی خبر سن کر

بھی تم غمگین ہو۔ آرگون پہنچ کر دعوت کرنی ہوگی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... اگر شہباز صاحب نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا تو میں سب کی دعوت ہی نہیں۔

سب کے لباس کا بھی وعدہ ہے۔“

”لباس کی اب کسے فکر۔“ رائیون بولا۔ ”میں تو ملکہ عالیہ سے کہہ کر شعبہ ملبوسات کا افسر بن جاؤں گا۔“

”مجھے بھی یہی امید ہے کہ ملکہ عالیہ ہم سب کو اپنی پسند کا شعبہ دیں گی۔ میں فوج کی افسری کو ترجیح

دوں گا۔“ مارٹ نے گفتگو میں حصہ لیا۔

وہ سب اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ میں نے دخل دینا مناسب نہیں سمجھا اور سفیر کی طرف دیکھ کر

پوچھا۔ ”تم کیوں اس طرح سے منہ پھاڑے دیکھ رہے ہو۔“

”میں سوچ رہا ہوں تم کتنی زبانیں جانتے ہو۔ انگلش، فرنچ، جرمن۔ عربی تھوڑا بہت نیپالی اور یہ والی

گٹ گٹ غناک..... ایسا لگتا ہے جیسے کسی ٹین کے ڈبے میں کنکریاں بھر کر بجایا جا رہا ہے۔ یہ کتنے دنوں میں

سیکھی؟“

”یقین کرو صرف ایک دن میں آگئی تھی۔“

”واہ..... ایسا کون سا استدلال گیا تھا جس نے اتنی مشکل زبان ایک دن میں سکھادی۔“

”اس استاد کا نام برف والا ہے۔ یقین کرو جب میں اس وادی میں آیا تو ایک لفظ بھی نہیں سمجھ رہا تھا کہ برف والے نے اپنی کارسازی سے میرے دماغ میں الفاظ بھر دیئے اور میں ان کی باتیں سمجھنے لگا لیکن بول اب بھی نہیں پاتا جس طرح میں ان کی بات سمجھ لیتا ہوں اسی طرح ان میں سے کچھ کو یہ قوت ملی ہے کہ وہ میری باتیں سمجھ لیتے ہیں اور ایسے کتنی کے لوگ ہیں۔“

ابھی میں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ایک سپاہی میرے قریب آیا اور بولا۔ ”آرگون میں تمہارے لیے ایک بڑی خوش خبری منتظر ہے۔“

”کون سی خوش خبری؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھ سے کچھ کہا؟ کون سی خوش خبری۔“ اس سپاہی نے تعجب بھرے انداز میں پوچھا۔

اب حیرت کا جھٹکا مجھے لگنا تھا کہ ابھی اس نے خود ہی کہا کہ آرگون میں میرے لیے خوش خبری ہے پھر خود ہی کہہ رہا ہے کہ کون سی خوش خبری؟ میں جھلا کر کوئی جواب دیتا کہ میرے ذہن میں ایک نام گونجا، برف والا۔ اس سے پہلے بھی تو وہ اپنا پیغام کسی نہ کسی ذریعہ سے بھیج دیا کرتا تھا۔ کبھی کسی بچے سے اور کبھی ساتھ کھڑے کسی بندے کی زبان سے کہلو اچکا تھا۔ میں سمجھ گیا اس لیے اسے دستے کے اندر جانے کا اشارہ کر کے سفیر کی طرف مڑ گیا۔

”سپاہی کیا کہہ رہا تھا کہ تمہارے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی؟“ سفیر نے پوچھا۔

”یہ برف والا بھی نا، عجیب ہے۔ اپنا پیغام ایسے بھیجتا ہے کہ عقل حیران رہ جائے۔ اسی کا پیغام تھا کہ آرگون میں ہمارے لیے ایک خوش خبری منتظر ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہو۔ کوئی خوش خبری منتظر ہو۔“

”یہ بات تو ہے کہ اب تک اس کی ایک بات بھی غلط نہیں ہوئی ہے۔ اب اس بات کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔

باتوں کے درمیان وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا اور ہم آرگان کے مرکزی گیٹ پر پہنچ گئے تھے۔ فسیل میں بنے اس دروازے سے اب تک ہم ایک بار بھی نہیں گزرے تھے۔ اس سے قبل جتنی بار بھی داخل ہوئے تھے تو چور دروازے سے اور باہر بھی آئے تھے تو دوسرے دروازے سے۔ اس دروازے پر پہرا زیادہ ہوتا تھا لیکن آج یہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے اور اندر تک سامیرا کے سپاہی مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ میدان سے فرار ہونے والے بہت سے سپاہی شہر میں پناہ گزیں ہیں۔ میں نے سامیرا کی طرف بڑھنا چاہا تھا کہ اسے ہدایت دے سکوں لیکن اس سے پہلے ہی سامیرا کا نقارچی بڑے سے بھونپو سے اعلان کرتا نظر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب اس شہر کی مالکہ سامیرا ہے۔ آرگون کے تخت کی اصل وارث۔ اس نے ایک طویل جدوجہد کے بعد، بے مثال قربانیوں کے بعد اس سرزمین سے ظلم و جبر کا نام و نشان کلی طور پر مٹا دیا۔ اب ہر ایک کا فرض ہے کہ نئی ملکہ کو خوش آمدید کہے۔ اس کی کوششوں کو سراہے۔ امن و امان قائم کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائے لیکن جو لوگ اس سے جنگ کر چکے ہیں ان کے لیے بھی ایک پیغام ہے۔ وہ خوفزدہ نہ ہوں۔ وہ سب

بھی اسی سرزمین کے بیٹے ہیں۔ ہم سب ایک باپ کی اولاد ہیں۔ اس لیے ان کو عام معافی دی جاتی ہے۔ ان کے لیے اعلان ہے کہ وہ بھی ملک و ملت کی ترقی و خوشحالی کے لیے کوشاں ہو جائیں۔ ان سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔“

اس اعلان کا اثر بہت بہتر ثابت ہوا۔ وہ دروازہ جو ادھ کھلا تھا پوری طرح کھل گیا۔ ہم سب اندر داخل ہوئے۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک عجب منظر نظر آیا۔ سڑک کے دونوں جانب شکست خوردہ سپاہی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ان کے پیروں کے پاس ان کے ہتھیار پڑے ہوئے تھے۔ سامیرا نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان پر پھول پھینک کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا جس کا خاطر خواہ فائدہ نظر آیا۔ اب وہ بھی سامیرا کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ ہم ان کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

اب ہم محل کے سامنے تھے۔ یہ وہی محل تھا جہاں کسی عام آدمی کو آنے نہیں دیا جاتا تھا۔ محل تو محل امرا کے علاقے میں بھی کسی عام آدمی کو آنے کی اجازت نہیں تھی اور آج اسی علاقے میں ہر کوئی آ جا رہا تھا۔ اور ہر کوئی خوش تھا۔ شاد تھا۔ کسی چہرے پر خوف نہ تھا۔

سامیرا کی سواری محل کے دروازے پر رکی تھی کہ وہ اترتے اترتے رک گئی۔ میں اس کے نزدیک ہی تھا۔ میری نظر اس پر پڑی تو میں بھی چونک گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کی سرخی تھی اور وہ محل کی سیڑھیوں کے نزدیک سر جھکائے بیٹھے ایک نوجوان کو بغور دیکھ رہی تھی۔

”کون ہے یہ؟“ میں نے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔

”یہ ریٹائٹ کا بیٹا ہے۔ انا اس نام ہے۔“ سامیرا نے سانس لے کر کہا۔ ”اس نے مجھے بہت ستایا ہے۔“

”لیکن آپ نے تو عام معافی کا اعلان کر دیا ہے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اسی لیے میں خاموش ہوں ورنہ اسے ابھی قتل کروادیتی۔“

”اب کیا چاہتی ہیں۔ یہ تو خود سر جھکائے بیٹھا ہے۔“

”لیکن اس کے چہرے پر غصے کی جھلک ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

”اس سے پوچھو وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو بلا جھجک کہہ دے۔“

”کچھ کہنا ہے؟“ سامیرا نے اسے مخاطب کیا۔

اب تک میں خود ہی تمام فیصلے کرتا رہا تھا۔ اپنی مرضی سے چل رہا تھا لیکن جب سے سامیرا نے فتح حاصل کی تھی میں نے خود کو اپنے تک محدود کر لیا تھا۔ کوئی بھی فیصلہ نہیں کر رہا تھا۔ میں نہیں چاہ رہا تھا کہ سامیرا کی کسی بات سے اختلاف کروں یا اس پر اپنا فیصلہ تھوپوں۔ اسی لیے میں اسے صرف مشورہ دے رہا تھا۔ اس وقت بھی میں نے اسے بات کرنے کا مشورہ دیا اور لا تعلق ہو گیا۔ میں مڑنے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ اس نوجوان کا لہجہ عجیب سا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”سامیرا تم..... تم جو ہمارے ٹکڑوں پر پلٹی رہی۔ یہ میرے والد کی غلطی تھی کہ اس نے تمہیں صرف شہر بدر کیا۔ گردن نہیں ماری۔ اسی لیے وہ اپنی جان سے چلا گیا۔ اب بولو مجھ سے کیسا سلوک کرو گی؟“

”اناس، تمہارے لیے بھی معافی کا اعلان ہے۔“ سامیرا نے شاہی تمکنت سے جواب دیا۔ ”اب ریٹاٹ کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ہر کوئی آزاد ہے۔ تم بھی آزاد ہو۔ دوسروں کی طرح تم بھی اپنے وطن کی خدمت کرو اس کی ترقی اور خوش حالی کے لیے اپنی ذمہ داری نبھاؤ۔“

”میں کوئی بھکاری نہیں ہوں جو بھیک میں اپنا سر بچالوں۔ میں ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا ہوں۔ تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ شاہی خاندان کے لوگ زندہ گرفتار نہیں ہوتے۔ میدان جنگ میں لڑتے ہوئے جان دے دیتے ہیں۔“ اناس نے غرور بھرے انداز میں جواب دیا۔

”لیکن جنگ تو اب ختم ہو چکی ہے۔ لڑنے کا اتنا ہی شوق تھا تو میدان جنگ سے فرار کیوں ہوئے؟“

”مجھے میدان جنگ میں جانے کی اجازت ہی نہیں ملی تھی۔ مجھے بابا نے شہر کا نظم و نسق سنبھالنے کو کہا تھا۔ میں اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔ لیکن اب جب جنگ ختم ہو گئی اور میرے خاندان کو تخت سے محروم ہونا پڑا تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں موت سے جنگ کروں اور اس کا ایک طریقہ ہے جس کی خبر تمہیں بھی ہوگی۔“

”تو کیا تم مجھ سے لڑنا چاہتے ہو؟ مگر میں بتا دوں کہ میں اب ملکہ ہوں۔ اس ملک کی مالک۔ اور ملکہ یا بادشاہ کبھی بھی کسی ایک آدمی سے نہیں لڑتے۔ وہ صرف جنگ کے میدان میں لڑتے ہیں۔“

”میں ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا ہوں اس کا ثبوت میں خود دوں گا کہ بہادر کس طرح موت کو گلے لگاتے ہیں۔ یہ سورج جو ہمارا تمہارا آقا ہے، جو آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا ہے، یہ بھی آج اپنے اس غلام کی بہادری دیکھے گا۔ میں دکھاؤں گا کہ بہادر کسے کہتے ہیں۔ میں لڑتے ہوئے اپنی جان دوں گا۔ تم ایک کے بعد ایک اپنے بہادر سپاہی کو بھیجو میں اس سے اس وقت تک لڑتا رہوں گا جب تک میں مر نہیں جاتا۔ اگر خود لڑنا نہیں چاہتی تو کسی کو میرے مقابلے میں بھیجو۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے قدموں میں ایک نیزہ رکھا ہوا تھا۔ اسے اس نے اٹھالیا پھر بولا۔ ”میرا یہ نیزہ بہت سے لوگوں کا خون پی چکا ہے لیکن کئی ماہ سے پیسا ہے۔ جس کو تم بہادر سمجھتی ہو اسے بھیجو۔ اس میدان میں کسی نہ کسی کا خون بہنا ہے۔ یہ خون تمہاری تاج پوشی پر قربانی ہے۔“

”نہیں تم منتخب کرو کہ کس افسر یا سپاہی سے لڑنا چاہتے ہو۔ تمہاری خواہش پر ہی میں چلوں گی۔ جلدی بولو۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سامیرا کی سواری کے ساتھ تمام بڑے افسر چل رہے تھے۔ ہر دستے کے سردار تھے۔ وہ ان سرداروں کو نظروں سے تول رہا تھا۔ کئی ایک بار نظریں گھمانے کے بعد اس کی نظر ریٹاٹ پر ٹھہر گئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ..... اس سے میں اپنا پرانا حساب بھی چکانا چاہتا ہوں۔ اسے اپنی نیزہ زنی پر بہت ناز ہے نا۔ آج میرے نیزہ کا بھی یہ کمال دیکھ لے۔ اب کوئی ایک بچہ گا۔ میں یا یہ..... اسے میرے مقابلے میں بھیجو۔“

”تم خود ہی مرنا چاہتے ہو تو بات دیگر ہے، میں پھر منع کروں گی کہ اس سے الجھنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ نیزہ زنی میں ماہر ہے۔ اگر کوئی پرانی دشمنی ہے تو میں اسے دوستی میں بدلنے کی پیش کش کرتی ہوں۔“

”میں نے کہا نا کہ میں فقیر نہیں ہوں اور نہ مجھے خیرات میں ملی ہوئی زندگی چاہیے۔ اس نے دو سال پہلے آرگون میں چوروں کی طرح داخل ہو کر میری پسندیدہ لڑکی سے شادی کی اور اسے فرار کر کے لے گیا۔ اب اس

لڑکی کو بیوہ کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔“

سامیرا کچھ کہتی کہ میناٹ نے آگے بڑھ کر سر جھکا کر سامیرا کو تعظیم دی پھر بولا۔ ”ملکہ عالیہ، یہ عیاش و مکار میری حمیت پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا اس لیے میں اسے سبق دینے کی خاطر ایک رات چھپ کر آرگون میں داخل ہوا اور اپنی عزت کو باحفاظت لے کر آ گیا۔ اب یہ پھر میری غیرت کو لکا رہا ہے تو اس کو سبق سکھانے کی اجازت مجھے دی جائے۔ میں ابھی اس بڑبولے کو خاموش کر دیتا ہوں۔“

سامیرا نے اس کی طرف حوصلہ افزا نظروں سے دیکھا۔ میناٹ کے ہاتھ میں اس وقت بھی میرا بنایا ہوا کلہاڑا تھا۔ اس نے کلہاڑے کو گردش دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر سامیرا سے التجا یہ انداز میں کہا۔ ”مجھے اجازت دی جائے۔ میں زندگی بھر ممنون رہوں گا۔“

”اجازت ہے کیونکہ یہ اسی کی خواہش ہے۔ جب یہ مرنے کا خواہشمند ہو چکا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں پھر بھی اس سے یہی کہوں گی کہ ابھی بھی موقع ہے یہ سوچ لے۔“

”میں ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا ہوں اور اس جنگ میں مرنے کے لیے لڑنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اپنے نیزہ کو ہاتھوں میں تول کر کہا۔

ان دونوں کے درمیان مقابلہ ہو گا یہ خبر پوری فوج میں پھیل گئی تھی۔ ہر کوئی اس جنگ کو دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگا تھا۔ وہ سپاہی جو بہت پیچھے تھے وہ آگے آنے کی کوشش میں تھے۔ اگر سامیرا کی سواری وہاں نہ ہوتی تو اب تک دھکم دھکا شروع ہو چکی ہوتی۔ میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر تمام سپاہیوں کو یہ مقابلہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تو ہڑبونگ مچ سکتی ہے۔ اس لیے میں نے سامیرا کہا۔ ”پہلے تمام سپاہیوں کو میدان میں بیٹھ جانے کے لیے حکم دوتا کہ ہر کوئی بہ آسانی مقابلہ دیکھ سکے۔ درمیان میں کافی سارا حصہ خالی چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ دونوں آرام سے مقابلہ کر سکیں۔ درنوں ہی سپاہیانہ رموز سے آگاہ ہیں اس لیے آگے پیچھے نہیں گئے۔ کوئی اور زد میں نہ آ جائے اس لیے جگہ چھوڑنے کے لیے کہا ہے۔“

سامیرا نے حکم جاری کر دیا۔ تمام سپاہی اس وسیع و عریض میدان میں پھیل کر بیٹھ گئے۔ کئی کئی قطاروں میں سپاہی بیٹھے تھے۔ ایک ڈیڑھ میل قطر کا یہ میدان لوگوں سے بھر گیا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہا تھا۔ عقب میں کئی قطاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ سامیرا نے میناٹ کو اشارہ دیا۔ وہ اپنا کلہاڑا الہراتا ہوا میدان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

”کیا تم اس کھلونے سے میرے نیزہ کا مقابلہ کرو گے۔ نیزہ لے کر آؤ۔“ اناس نے چیخ کر کہا۔ کلہاڑا اس کے لیے نیا ہتھیار تھا اسی لیے وہ اس کی ہلاکت خیزی کے بارے میں زیادہ جانتا نہیں تھا۔

”یہ بھی نیزہ سے کم نہیں۔ یہ میرے اس دوست کا تحفہ ہے جس کو برف والے نے ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ یہ اسی کی بہادری کا نتیجہ ہے کہ تم آج ذلیل و خوار ہو کر میرے سامنے کھڑے ہو اور اب اس کے اسی تحفہ سے میں تمہیں موت کی وادی میں دھکیلوں گا۔“ میناٹ نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

دونوں ایک دوسرے کے زور و کھڑے ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کو اس طرح سے گھور رہے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں سے کھا جائیں گے۔ یہ مقابلہ نہیں پرانی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ دوسروں کی طرح میں بھی پوری

طرح متوجہ تھا۔ اناس نے اپنا نیزہ بلند کیا اور پھر ایک زوردار نعرہ لگا کر میناٹ پر حملہ آور ہوا۔ میناٹ پوری طرح ہوشیار تھا اس نے داہنے جانب ہٹ کر اس کا وار روکا۔ اناس اپنی رفتار کو روک نہ پایا اور دوڑتا ہوا کافی آگے چلا گیا۔ پھر وہ پلٹا اور اس نے دوبارہ وار کیا۔ اس کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ وہ جس تیزی سے پیٹیرا بدل رہا تھا یہ اس کی مہارت کا ثبوت تھا۔ میناٹ نے اب تک ایک بھی وار نہیں کیا تھا۔ وہ صرف خود کو بچا رہا تھا۔ اناس کی پھرتی دیکھ کر میں فکر میں پڑ گیا تھا کہ یہ جس طرح وار پر وار کر رہا ہے اور میناٹ کو موقع نہیں دے رہا ہے۔ کہیں یہ اپنے کہے کو سچ نہ کر دکھائے اور میناٹ کی بیوی بیواہ ہو جائے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کھٹاک کی تیز آواز گونجی اور اناس کا نیزہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ میناٹ نے پہلی بار کلہاڑا چایا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیزہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ اناس نے اپنے ہاتھ میں رہ گئے نیزے کے ڈنڈے کو پھینک کر دو حصوں میں بٹ گئے نیزے کے اس ٹکڑے کو اٹھا لیا جس کے سرے پر تیزانی تھی۔ اب اس نے داہنے ہاتھ میں اس ٹکڑے کو تھام لیا اور بائیں ہاتھ میں کمر سے بندھے سگی چاقو کو پکڑ لیا۔ مقابلہ کچھ ایسا بن چکا تھا کہ دیکھنے والے سانس لینا بھی بھول گئے تھے۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملہ کر رہا تھا اور دیکھنے والے چیخ رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ ایسا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اناس پر گویا پاگل پن چھا گیا تھا۔ وہ وار پر وار کر رہا تھا مگر دور رہ کر۔ وہ بار بار میناٹ کو نشانہ بنانا چاہتا تھا کہ میناٹ نے پیچھے ہٹ کر کلہاڑا بلند کیا اور پھر اسے گردش دیتا ہوا، پھر کی کی طرح گھومتا ہوا اناس سے دو ہاتھ کے فاصلے پر آیا اور پھر اس نے کلہاڑا چلا دیا۔ پھر جو ایک شور مچا ہوا کہ الآمان الحفیظ۔ میں نے میناٹ پر نظر ڈالی۔ وہ کلہاڑا دونوں ہاتھوں سے بلند کیے کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے قدموں میں اناس کا بے سرواळा جسم پڑا تھا۔ بڑبولا اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا بلکہ خود اس نے اپنی موت کو دعوت دے دی تھی۔ وہ مرنا چاہتا تھا، مر گیا۔ اب میدان میں میناٹ کی واہ واہ ہو رہی تھی۔ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر اس کے نام کا نعرہ لگا رہے تھے۔ سامیرا نے میناٹ کو فتح یاب دیکھ کر اس کی طرف ایک پھول پھینکا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ انعام کا حقدار ہے۔

سامیرا اب سواری سے نیچے اتر آئی تھی۔ اس نے محل کی سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے۔ اس کے ساتھ میں بھی اندر کی جانب بڑھا اور پھر ہم سب اس ہال تک جا پہنچے جہاں کبھی ریناٹ کا دربار سجا کرتا تھا۔ سامیرا نے اس تخت کو جس پر ریناٹ بیٹھ کر فیصلے کیا کرتا تھا ایک ٹھوکری پھر اونچی آواز میں بولی۔ ”یہ وہی تخت ہے جس پر بیٹھ کر اس ظالم نے ہمارے بھائی بندوں کو کیسی کیسی سزائیں دی ہیں۔ کتنے بے قصور اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ اس لیے آج سے یہ تخت یہاں نہیں رہے گا۔ میں خود آپ لوگوں تک، اپنے عوام تک خود چل کر جاؤں گی اور اگر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا تو وہیں اسی مقام پر کر دیا کروں گی۔ اب ہم سب صرف اور صرف تعمیر اور ترقی کا سوچیں گے۔“

اس کی یہ تقریر خواص کے سامنے تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ کچھ ہی دیر میں یہ باتیں عوام تک پہنچ جائیں گی اور عوام پوری طرح سامیرا کے حق میں ہو جائیں گے۔

”یہ تو پوری سیاست داں ہے۔“ مجھ سے ترجمہ سن کر عبداللہ نے سرگوشی میں کہا تو میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ سب خاموش تھے اس لیے اس کی سرگوشی دور تک سنائی دے سکتی تھی۔ سامیرا ہماری زبان جانتی تھی اس لیے وہ سن اور سمجھ سکتی تھی۔ میں اسے کچھ کہتا کہ باہر ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ محل کی

دیواریں تک لرز گئیں۔ میں باہر کی طرف بھاگا۔ میرے ساتھ سفیر اور وسیم و عبد اللہ بھی دوڑے تھے۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ ڈیوڈ شانے حملہ کر دیا ہے۔ دوڑتے ہوئے میں نے گن کو ہاتھ میں سنبھال لیا تھا۔

محل سے باہر نکل کر دیکھا۔ لوگ افراتفری میں ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں۔ وہی سپاہی جو کچھ دیر پہلے تک نہایت نظم و نسق سے صف بنائے ہوئے تھے اس وقت پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے راستہ بنا رہے تھے۔ میں نے برآمدے میں کھڑے ہو کر اطراف کا جائزہ لیا مگر میدان میں کہیں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر نہیں آیا۔ اب میں اس بھیڑ میں کسی شناسا چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے رائیون نظر آ گیا۔ میں اس کی طرف دوڑا اور اسے روکتے ہوئے پوچھا کہ یہ دھماکا ہوا کہاں ہے؟

”مجھے خود پتا نہیں ہے۔ ہم سب محل کے باہر جمع تھے اور ملکہ عالیہ کا حکم سننے کے منتظر تھے کہ یہ خوفناک آواز سنائی دی۔ اتنی خوفناک آواز میں نے اپنی زندگی میں نہیں سنی ہے۔“ اس کی آواز تک کانپ رہی تھی۔ دھماکا ان لوگوں کے لیے بالکل نئی چیز تھی اس لیے خوفزدہ ہونا تعجب خیز بات نہ تھی۔

”یہ بتاؤ وہ آواز آئی کس طرف سے تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس طرف سے جہاں تاجروں کے گھر ہیں۔“ رائیون نے اشارے سے بتایا۔

اس کا اشارہ شہر کی جانب تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے دشمن کی کارستانی ہے۔ اگر چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ دھماکا کہاں ہوا ہے۔“ رائیون کو کچھ حوصلہ ملا تو وہ مطمئن ہو گیا اور میرے ساتھ شہر کی جانب دوڑنے لگا۔ میرے تینوں ساتھی اپنی اپنی گن سنبھالے میرے ساتھ تھے۔

ہم سب دوڑتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں بھی خوف کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ لوگ گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آ گئے تھے۔ عورتیں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ میں نے رائیون سے کہا کہ وہ ان سے پوچھے کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔

رائیون نے ایک کے بعد ایک کئی آدمیوں سے پوچھا مگر کوئی بھی صحیح جگہ کی نشاندہی نہ کر سکا۔ سب نے صرف آواز سنی تھی۔ اتنے سویرے عام طور سے لوگ گھروں سے باہر نہیں نکلتے پھر ریٹا کی شکست اور سامیرا کی آمد کی وجہ سے جو ہر جوش تھے وہ محل کے سامنے پہنچ گئے تھے اور جو عام سے لوگ تھے وہ گھروں میں سو رہے تھے اسی وجہ سے کوئی بتا نہیں پا رہا تھا کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔

ہم بڑھتے بڑھتے فصیل تک آ پہنچے تھے کہ میری نظر فصیل پر کھڑے سپاہی کی طرف گئی۔ وہ ہتھیلی کا چھجہ بنائے مغرب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے رائیون سے کہا۔ ”تم اوپر جا کر پوچھو، وہ کیا دیکھ رہا ہے؟“

”یہ تو سانا یا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ ابھی پتا کر کے آتا ہوں۔“ رائیون دوڑتا ہوا سیڑھیوں کی طرف

چلا گیا۔ وہاں بھی ایک سپاہی کھڑا تھا۔ اس سے وہ کچھ بولا اور پھر سیڑھیوں سے اوپر چلا گیا۔

میں نیچے کھڑا اس سپاہی کو ہی دیکھ رہا تھا کہ اس کے برابر آ کر رائیون کھڑا ہو گیا۔ اس نے سپاہی سے کچھ پوچھا پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگا۔ ادھر اسے کوئی اہم بات نظر آئی تھی کیونکہ اس نے جھک کر مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی شاید نیچے آنے کے لیے مڑ گیا۔

میں نے سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہاں کھڑا سا ہی سامیرا کی فوج کا تھا اس لیے اس نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر تعظیم دی۔ میں نے بھی جوا با سر جھکا دیا۔ پھر اوپر کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ رائیون اوپر سے اترتا ہوا آگیا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی کہا۔ ”دھماکے کی جگہ نظر آگئی ہے۔ پہلے باغ میں دھماکا ہوا ہے۔ وہاں سے اب تک دھواں اٹھ رہا ہے۔“

”تو پھر اوپر جانے کا فائدہ۔ ایسا کرو ہیں چلتے ہیں۔“ کہہ کر میں نے سیڑھیاں اترنا شروع کر دیا۔ وہ

بھی میرے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔

فصیل سے باہر آکر ہم تیز تیز قدموں سے باغ کی جانب چلنے لگے۔ وہ باغ شہر سے کافی فاصلے پر تھا۔ ہم اسی جانب چل رہے تھے۔ عام دنوں میں یقیناً اس وقت تک مزدور اپنے کام پر جانے کے لیے نکل جاتے ہوں گے لیکن حالات کی وجہ سے اس وقت اور بھر جانے والا راستہ سسنا پڑا تھا۔ راستے کے دونوں جناب جھاڑیاں تھیں۔ ان میں کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن ہم بے خطر آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے باغ نزدیک آ رہا تھا ہوا میں پھیلی بارود کی بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ پیڑوں کی آڑ ہونے کی وجہ سے میں مقام کا صحیح اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔ تاہی کس قدر ہوئی ہے یہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم اس باغ کے قریب پہنچ ہی گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ مقام نظر آ گیا جہاں پر دھماکا ہوا تھا۔ وہ ایک جھونپڑی تھی۔ کافی بڑی جھونپڑی جو یقیناً پہرے داروں کے تصرف میں رہتی ہوگی۔ آگ کی لپیٹ میں آکر راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔ آس پاس کے پیڑ بھی جھلس گئے تھے۔ کافی دور تک تاہی کے آثار پھیلے ہوئے تھے۔ کئی بلند اور تناور درخت بھی جھلے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں بارود کا ذخیرہ تھا جس میں کسی طرح آگ لگ گئی تھی۔ میں کچھ اور نزدیک پہنچا تھا کہ ٹھنک گیا۔ اس جلی ہوئی جھونپڑی سے کافی دور ایک بڑے سے پیڑ کے نیچے ایک شخص لیٹا ہوا نظر آیا۔ اس کا لبادہ بتا رہا تھا کہ وہ مقامی ہے۔ میں اس کی طرف بڑھا تھا کہ رک جانا پڑا۔ میں تو اس بندے کی طرف بڑھ رہا تھا اور رائیون اس جھونپڑی کو قریب سے دیکھنے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ ”رک جاؤ..... ہو سکتا ہے کوئی گولا یا بارود سے بنی کوئی چیز ابھی آگ سے محفوظ ہو اور وہ پھٹ جائے۔ ابھی ادھر نہ جاؤ۔“

میری ہدایت پر وہ رک گیا۔ اس نے اٹھے پیر پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ میرے قریب آکر بولا۔ ”آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

”حقیقت بتائی ہے۔ پتا نہیں اس جھونپڑی میں کون ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے پاس کتنا آتشیں اسلحہ تھا۔ کس قسم کے ہتھیار تھے۔ سنا تو یہی ہے کہ ڈیوڈ مشاپنے ساتھ بہت سارا اسلحہ لے کر آیا ہے پھر اس نے ہوائی جہاز ذریعہ بھی گولا بارود منگوایا ہے۔ اس نے جن لوگوں کو بلایا ہے ان میں بارود ایکسپلٹ بھی ہوں گے، لگتا ہے انہیں میں سے کوئی یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور کچھ تیار کر رہا ہوگا کہ بارود میں آگ لگ گئی۔“

”اس جھونپڑی میں کون رہ رہا تھا اس کا پتا ابھی چل جاتا ہے۔“ اس نے بھی اس زخمی شخص کو دیکھ لیا تھا۔

پیڑ کے نیچے پڑا تھا۔

اس شخص کے نزدیک پہنچ کر میں نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ چل رہی تھی۔ لیکن وہ بری طرح زخمی تھا۔

کے جسم میں جا بجا زخم تھے۔ وہ پھلنی ہو رہا تھا۔ جہاں پر وہ گرا ہوا تھا وہ جگہ خون سے بھر گئی تھی۔ گویا اس کے جسم سے کافی سارا خون بہہ چکا ہے۔ گوکہ زخم چھوٹے چھوٹے تھے مگر بہت سارے تھے۔ میں نے رائیون سے کہا۔ ”دیکھو اگر کہیں سے پانی مل سکے تو اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کروں۔“

”وہ رہا اس کا چھاگل۔“ رائیون نے قریب کی جھاڑیوں میں گرے ہوئے چھوٹے مشکیزہ کی طرف اشارہ کیا۔ یقیناً یہ چھاگل اسی کا ہوگا جو چھٹک کر دور جا پڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے منہ پر بندھا تمہ کھول کر چلو میں پانی نکالا اور اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ دو تین بار کی کوشش سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ رائیون نے سوال کیا۔ ”کیا تم اس جگہ پر تعینات ہو؟“

”ہاں یہاں کی حفاظت کرنا میرے فرض میں شامل ہے۔ میں مزدوروں کا حساب رکھتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اس جھونپڑی میں کون رہ رہا تھا؟“

”اس میں بیمار کا ایک دوست اپنے ساتھیوں کے ساتھ کل سے ٹھہرا ہوا تھا۔ بیمار نے بتایا تھا کہ یہ ریٹ کا خاص دوست ہے جو وادی کے باہر سے آیا ہے، اس کے پاس ریٹ کی خاص مہر بھی تھی جس کی وجہ سے ہم اس کی خاطر داری کرنے پر مجبور تھے تاکہ ہمارا بادشاہ ہم سے خوش رہے۔“

”یہ بیمار کون ہے۔ یہ نام تو پہلی بار سن رہا ہوں۔“ میں نے رائیون سے پوچھا۔

”بیمار وزیر کا بیٹا تھا جو شہر پندی میں کسی سے کم نہ تھا۔“ پھر وہ زخمی کی طرف مڑ کر بولا۔ ”تمہیں علم ہے ریٹ کو شکست ہو گئی ہے اور سامیرا کو حکومت مل گئی ہے۔“

”سنا تھا کہ جنگ کے لیے ریٹ میدان میں جا پہنچا ہے اور جلد ہی سامیرا کو شکست دے کر فتنہ کو ختم کرے گا۔“

”وہ مارا گیا۔ اس کی فوج پسا ہو گئی ہے۔ زیادہ تر سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اب وہ سامیرا کو تخت پر بٹھانے والے ہیں۔“

”اگر ایسا ہو گیا ہے تو بہت اچھا ہے کہ سامیرا اپنے باپ کی طرح لوگوں کی خدمت کرے گی۔ ظلم و ستم کے دن ختم ہو جائیں گے۔“

”اس سے یہ پوچھو کہ یہاں جو رہ رہا تھا وہ کیسا تھا۔“ میں نے رائیون سے کہا۔ اس نے میرا سوال دوہرایا تو زخمی نے جواب دیا:

”ایک شخص بہت موٹا اور طاقتور تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ باسو کے بارے میں بتا رہا ہے۔ اگر وہ یہاں تھا تو اس کے معنی ہیں کہ ڈیوڈ شا بھی یہیں کہیں روپوش ہوگا۔ ”اور کون کون تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”اس طاقتور کے ساتھ ایک گنجا بھی تھا اور ایک نوجوان۔ لیکن رات میں ایک دوہرے بدن کا خوب گورا سا آدمی آیا جسے دیکھ کر سب کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر مجھے وہاں سے ہٹا دیا کہ تم باہر جا کر بیٹھو۔ میں ساری رات یہیں بیٹھا تھا کہ صبح کے وقت زوردار آواز ہوئی پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔ آپ نے پانی چھیننا تو آنکھ کھلی۔“

اس کی باتوں سے میں الجھ گیا تھا۔ اگر اس کی بات سچ تھی تو ڈیوڈ شا بھی رات اسی جھوپڑی میں تھا۔ اسے شاید خبر ہو گئی تھی کہ ریٹا کو شکست ہو چکی ہے اسی لیے وہ بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ گولا بارود تیار کر رہا ہوگا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر رہا ہوگا کہ دھماکا ہو گیا۔ اگر یہ بات صحیح تھی تو دوسروں کے لیے دنیا کو جہنم بنانے والا اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ انسان بھی کتنا بھولا ہے کہ وہ اپنی موت کو نال نہیں سکتا اور دنیا سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔ جھوپڑی کی آگ بہت حد تک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے ان کے باقیات کی تلاش شروع کر دی۔ میں ایک بڑی سی لکڑی سے راکھ کو ادھر ادھر کر رہا تھا کہ میری نظر سامنے والی جھاڑیوں پر پڑی۔ وہاں بھی کسی کا جسم نظر آ رہا تھا۔ قریب جا کر دیکھا۔ وہ لاش باسوکی تھی۔ گو کہ اس جسم پر سر نہیں تھا پھر بھی جسم سے اندازہ ہو گیا کہ وہ لاش اسی کی ہے۔ اب مجھے ڈیوڈ شا کی تلاش تھی۔ جب وہ یہاں تھا تو یقینی طور پر ڈیوڈ شا بھی یہیں ہوگا۔ اس کی تلاش میں، میں خطرے میں کود گیا۔ اس جھوپڑی کے اندر پہنچ گیا۔ اندر چار لوگوں کی ٹکڑوں میں بی سوختہ لاشیں نظر آ گئیں۔ لیکن ان میں ڈیوڈ شا کی لاش نہیں تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ دھماکے سے کچھ دیر قبل عقبی طرف سے باہر نکل گیا ہو۔ وہ قسمت کا بہت تیز تھا۔ ہر بار موت کو بہ آسانی شکست دے دیتا تھا۔ شاید اس بار بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ یوں بھی شیطان کے پجاریوں کو برائی کے دیوتاؤں کو اللہ تعالیٰ کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے دیتا ہے۔ اس لیے کہ جہنم میں ہر کوئی اپنے حصے کی آگ لے کر جائے گا۔ جو جتنے برے کاموں میں ڈوبا ہوا ہوگا اس کی آگ بھی تیز ہوگی۔ وہ اچھی طرح جل سکے اسی کا یہ انتظام ہے۔

میں فکر میں ڈوبا ہوا راکھ کے ڈھیر کو پھلانگتا ہوا باہر آیا۔ رائیون کھڑا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ ”لگتا ہے ڈیوڈ شا فرار ہو گیا۔ اب یہی ڈر ہے کہ کہیں وہ آئی زور سے نل جائے۔“

”سامیرا کی فتح کے بعد آئی زور کی مسند باقی نہیں رہی۔ اگر سامیرا ہی اسے اس کا منصب دے دے تو بات دیگر ہے۔“

”میں نے غور کیا ہے کہ معبد کے بڑے پجاری یعنی آئی زور کے اختیارات ریٹا سے زیادہ تھے۔“

”یہ بات غلط نہیں ہے لیکن یہاں کے قانون کے مطابق اگر کوئی شہنشاہ کو شکست دے دے تو معبد میں تبدیلی کا اسے اختیار ہوگا۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے باغ کے دروازے پر پہنچے تھے کہ قریب کی جھاڑیوں میں مجھے ایک کٹا ہوا سر نظر آیا اور میں تیزی سے اس کے قریب پہنچا۔ وہ سر ڈیوڈ شا کا تھا۔ لگتا ہے کہ وہ دھماکے کے وقت قریب ہی تھا اس لیے اس کا سر اچھل کر دور جا گرا۔ میں نے کبھی کسی کی لاش کی بے حرمتی نہیں کی لیکن اس شخص کو دیکھ کر بھی مجھے رحم نہ آیا۔ اس نے کس طرح سازشوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ یہ میں بھولا نہیں تھا۔ اس شخص کو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔ میں بے حس سا بنا دہاں سے نکل پڑا۔ اب مجھے جانے کی جلدی پڑ گئی تھی۔ میرے تقریباً تمام کام انجام پا گئے تھے۔ اب صرف اپنے ساتھیوں کو اور راجا صاحب کو ساتھ لینا تھا اور پھر پاکستان پہنچ کر اپنے اولین دشمن سے دودو ہاتھ کرنا تھا جس کی وجہ سے میری زندگی سے چین و سکون ختم ہوا تھا۔

وہاں سے ہم فیصل کے پاس آئے تو سفیر اور وسم کو منتظر پایا۔

”کہاں چلے گئے تھے۔ ہم کب سے آپ لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“ وسم نے شکوہ کیا۔

”اپنے سب سے بڑے دشمن کا آخری دیدار کرنے گیا تھا۔“

”کیا مرشد یہاں بھی پہنچ گیا۔ کیونکہ ڈیوڈ شا تو پہلے سے ہی موجود ہے۔“

”مرشد نہیں..... ڈیوڈ شا۔ اس نے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔ اس کی لاش دیکھ کر آ رہا ہوں۔“

”ارے واہ..... اس کی لاش کہاں ہے۔ میں اس کے سر سے فٹ بال کھیلوں گا۔“

”دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے، ہوئے، بجاوی مر جانا۔ مرنے کے بعد کسی کو برا نہ کہو۔ وہ اپنے انجام کو

پہنچ گیا۔ اگر زندہ ہوتا تو ہزار قسم کی سازشیں رچاتا۔ ان معصوم لوگوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا۔ اس لیے

جو ہوا اچھا ہوا۔ اب چلو سامیرا سے مل کر راجا صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ اب ہمیں اپنا وطن بہت یاد آ رہا ہے۔“

”وطن یا سویرا کی یاد ستا رہی ہے۔“ سفیر نے چٹکی لی۔

”اچھا سمجھ گیا تم میرے منہ سے کہلوانا چاہو گے کہ میں مونا سے کہوں کہ اس اندھیری وادی میں بھی یہ

تمہیں یاد کرتا رہا۔“

”میں سادی سے گواہی دلا دوں گا کہ بات سچ ہے۔“ وسیم نے خود ہی اپنا نام یاد دلایا۔

سفیر جواب میں کچھ کہتا کہ میں نے روک دیا۔ ”ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ مذاق بعد میں بھی ہو

سکتا ہے۔ ابھی یہاں سے نکلنے کا ذہن بناؤ..... آتے وقت کن دشواریوں سے آئے ہو گے یاد کرو۔ اب پھر وہی

سفر درپیش ہے۔“

”آپ ساتھ ہیں تو ہمیں فکر کی ضرورت کیا ہے۔ بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔“ وسیم نے ہنستے

ہوئے جواب دیا۔

باتوں کے درمیان پتا بھی نہیں چلا اور ہم محل کے سامنے پہنچ گئے۔ اب تک وہاں اسی طرح لوگ جمع تھے۔

ہنسی ٹھٹھول ہو رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے ہوتا ہوا اندر کی

جانب بڑھا۔ دروازے پر پہرے دار موجود تھے۔ ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں نیزے بھی تھے اور ترکش و کمان

بھی لیکن انہوں نے مجھے یا میرے ساتھیوں سے کچھ نہ کہا اور نہ روکنے کی کوشش کی بلکہ سر جھکا کر تعظیم دی۔ اس کا

مطلب تھا کہ وہ ہمیں پہچانتے تھے۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ بڑے ہال نما کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے یہاں کا

ایک ایک کمر یاد تھا اس لیے میں بلا جھجک اندر بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر میں اس کمرے میں جا پہنچا جہاں سامیرا اپنی

فوج کے افسران کے ساتھ بیٹھی مشاورت کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

”جی ہاں۔ اگر اجازت ہو تو میں قلعہ تک جانا چاہتا ہوں۔ راجا صاحب سے ملنا ضروری ہے۔“

”ڈیوڈ شا کا کیا بنا؟“

”ڈیوڈ شا اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اس کی لاش ٹکڑوں میں دیکھ آئی ہوں۔ کچھ دیر پہلے جو دھماکا سنا گیا تھا

وہ اس جگہ ہوا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔“

”اوہ..... یہ کیسے ہوا؟“

”شاید وہ بارودی ہتھیار ادھر ادھر کر رہا ہوگا جو آپس میں ٹکرا گئے یا گرمی سے پھٹ گئے۔ وہ جگہ گڑھے

میں بدل گئی ہے۔ جھوپڑی راکھ کا ڈھیر بن گئی ہے۔ اس کے جتنے بھی ساتھی تھے سب کے چیتھرے اڑ گئے۔ میں نے چار لاشیں گنی ہیں۔“

”گویا اب ایسا کوئی دشمن بچا نہیں ہے جو خطرہ بنے؟“

”نہیں ابھی معبد کا بڑا پجاری آئی زور..... اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ایک گھر میں محصور ہو کر بیٹھا

ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا؟“

”آپ ہی نے بتایا تھا کہ خبر مصدقہ ہے۔“

”یوں بھی اب میں یہاں کی ملکہ ہوں۔ میں نے ملک فتح کر لیا ہے۔ ہمارا قانون ہے کہ فاتح اپنی مرضی

کا پجاری رکھ سکتا ہے۔ یعنی میں اسے اس کے عہدے سے ہٹا سکتی ہوں۔“

”یہ بعد کی بات ہے میں قلعہ کی طرف جانا چاہتا ہوں کیونکہ راجا صاحب سے ملاقات کرنا ضروری ہو گیا

ہے۔“

”اگر ابھی جانا چاہتے ہو تو میں سواری کا انتظام کر دیتی ہوں لیکن تم تھکے ہوئے ہو اتنا فاصلہ کیسے طے کرو

گے۔“ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”شام تک میں بھی قلعہ پہنچ رہی ہوں۔ بس کچھ انتظامات کرنے ہیں۔ اگر رک جاؤ تو

ساتھ چلتے ہیں۔“

”نہیں، اب مجھ سے راجا صاحب سے دوری برداشت نہیں ہو رہی۔ پھر ان سے چند اہم امور پر تبادلہ

خیال بھی کرنا ہے۔“

”میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔“ کہہ کر سامیرا نے اپنے قریب بیٹھے ایک آدمی سے کچھ کہا اور وہ اٹھ کر

باہر نکل گیا۔ تب وہ مجھ سے بولی۔ ”وہ سواری کا انتظام کرنے گیا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو جمع کر لو۔“

”سب ساتھ ہیں۔“ پھر میں نے تعظیمی انداز میں سر جھکا کر کہا۔ ”مجھے اجازت دیں۔ میں باہر کھڑا

ہوں۔“

”رات میں ملاقات ہوگی۔“

اجازت ملتے ہی میں باہر نکل گیا۔ سفیر، وسم اور عبداللہ کو ساتھ لے کر میں اس جانب بڑھا جہاں شاہی

سواریاں کھڑی کی جاتی تھیں۔

میرا اندازہ صحیح نکلا۔ سامیرا نے جسے بھیجا تھا وہ وہاں کھڑا ایک رتھ نما گاڑی کو تیار کر رہا تھا۔ میں نے اس

کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ ”کیا اسی پر جانا ہے؟“

”جی ہاں بس یہ ابھی تیار ہو جائے گی۔“

اس نے صحیح کہا تھا بمشکل آدھے گھنٹے میں وہ سواری تیار ہو گئی۔ کوچوان نے ہمیں اندر بیٹھنے کا اشارہ د

اور ہم سب قلعہ کی جانب چل پڑے۔ یہ وہی شہر تھا جس میں ہم چوروں کی طرح خفیہ دروازے سے داخل ہوئے

تھے اور آج عزت کے ساتھ شاہی سواری پر ہم اس شہر سے باہر نکل رہے تھے۔ سواری تیز رفتاری سے قلعہ ک

جانب بڑھتی جا رہی تھی۔ باغوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہم اس جانب بڑھتے جا رہے تھے جہاں کبھی

ہرے بھرے کھیت ہوا کرتے تھے اور سامیرا کی حفاظت کے لیے میں نے اس کھڑی فصل کو آگ لگا دی تھی۔ وہ اب میدان سا نظر آ رہا تھا۔ ہم اس کے درمیان سے گزرتے ہوئے قلعہ کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ فاصلہ سمٹتا جا رہا تھا۔ پھر وہ میدان آگیا جہاں گزشتہ دن خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ اس میدان جنگ کو عبور کر کے ہم قلعہ کے بہت نزدیک پہنچ گئے۔

قلعہ کا علاقہ ویران سا نظر آ رہا تھا اس لیے کہ یہاں کے زیادہ تر مکین آرگون گئے ہوئے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے، یہاں رہ رہے لوگ اصل میں وہیں کے رہائشی تھے جو ریٹائٹ کے ظلم و ستم سے گھبرا کر یہاں چلے آئے تھے اور ان کے لیے شہر کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ یہاں کا کوئی فرد اگر وہاں پکڑا جاتا تو اسے سزا دی جاتی تھی اس لیے کوئی ادھر جاتا ہی نہیں تھا۔ جتنے بھی لوگ یہاں تھے ان سب کے رشتے دار وہاں تھے۔ اب موقع ملا تو وہ سب دوڑے چلے گئے تھے۔ ایک وقت تھا کہ مجھے بھی قلعہ سے زبردستی باہر نکال دیا گیا تھا۔ مجھ پر پابندی لگا دی گئی تھی کہ میں یہاں لوٹ کر نہیں آ سکتا ہوں۔ وہ دن وہ مصائب یاد آئے تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی کہ دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

ابھی میں خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ سواری رک گئی۔ میرے اترنے سے پہلے دوسری جانب سے سفیر اتر ا پھر وسیم۔ میرے بعد میری طرف سے عبداللہ اترے۔ ہم سب خاموشی سے اندر کی طرف بڑھے۔ اتنے دنوں بعد راجا صاحب سے ملاقات ہونی تھی۔ ان سے کیا کہوں گا؟ ان کے محل سے مجھے جس طرح نکالا گیا اس کا گلد بھی تو میں نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کچھ راجا صاحب کے حکم سے نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی میں انہیں شرمندگی سے بچانا چاہتا تھا کہ یقیناً وہ باتیں ان کے علم میں بھی آچکی ہوں گی۔

”شہباز تم..... آخر ہماری یاد آ ہی گئی۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی یہ پہلی آواز تھی جو میں نے سنی۔

میں نے جھکی ہوئی نظروں کو اٹھا کر اس بیڈ کی طرف دیکھا جس پر راجا صاحب لیٹے ہوئے تھے۔

”جب سے میں نے سنا ہے کہ آپ آچکے ہیں میں ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ اب جا کر فرصت ملی تو

حاضری دے دی۔“

”سامیرا ابھی تک اپنے جھیلوں میں پھنسی ہوئی ہوگی؟“

”وہ شام تک آجائیں گی۔“ میں نے ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سفیر اور وسیم سامنے والی کرسیوں پر

قبضہ جما چکے تھے لیکن عبداللہ احتراماً کھڑا تھا۔ راجا صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر کہا:

”تم بھی بیٹھ جاؤ۔“ پھر میری طرف مخاطب ہوئے۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“

”اچھا کیا کہ آپ نے یہ بات چھیڑ دی۔ میں یہاں اپنی مرضی سے آیا نہیں، زبردستی بھیجا گیا تھا لیکن

یہاں آکر جو کام نمٹانے تھے وہ نمٹا لیے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ڈیوڈ شاکی لاش دیکھ لی۔“

”اسے تم نے مار دیا؟“

”نہیں جناب میں نے نہیں اس کی قسمت نے اسے دھوکا دیا ہے۔ وہ اپنے ہی بارود کا شکار ہو گیا۔“

”تو اب یہاں سے نکلنا چاہتے ہو؟“

”جی ہاں..... پاکستان میں بہت سے کام پینڈنگ پڑے ہیں۔ ان کو نمٹانا چاہتا ہوں۔“

”لیکن یہاں سے نکلو گے کیسے۔ باہر جانے کا راستہ یاد ہے؟“

”نہیں، راستہ تو آپ بتائیں گے۔“

”مجھے خود علم نہیں ہے۔ گزشتہ بار تو مجھے یہاں سے زبردستی نکال باہر کیا گیا تھا۔ اس راستے کا علم صرف

برف والے کو ہے۔ وہی تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔“

”تو کیا آپ کا ارادہ نہیں ہے؟ آپ نہیں جائیں گے؟“

”تم میرے بیٹے جیسے ہو، تم سے کیا چھپانا۔ میں نے ایک لمبی زندگی گزار دی ہے۔ اپنے حصے کے تمام

کام نمٹا دیئے ہیں۔ پھر مجھے جس موذی بیماری نے گھیر لیا ہے اس کا صحیح علاج ہمارے ہاں کہاں ہے۔ مجھے تو کہا

گیا تھا کہ اب صرف ایک ہفتہ باقی ہے لیکن یہاں آنے کے بعد یہاں کے حکیم نے ایسی جڑی بوٹیاں استعمال

کرائیں کہ اب لگتا ہی نہیں ہے کہ میں بیمار ہوں۔ رگ رگ میں اس نے قوت بھر دی ہے۔“

”گویا اب آپ باقی زندگی یہیں گزارنا چاہتے ہیں۔“

”صحیح کہا..... اب میں یہیں رہوں گا۔ وہاں میری اولادیں ہیں۔ ان سے میرا نام چلتا رہے گا۔“

راجا صاحب کی باتوں نے مجھے الجھا دیا تھا۔ برف والے سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اب ہم باہر نکلیں تو کیسے

نکلیں؟

”ایسا کرو کہ کچھ دیر آرام کر لو۔ سامیرا آجائے تو وہی کوئی راستہ نکالے گی۔“ राजا صاحب نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

اب وہاں رہنا فضول تھا میں اٹھ گیا۔ مجھے کھڑے ہوتے دیکھ راجا صاحب نے عبد اللہ سے کہا۔ ”شہباز

کا بستر برابر والے کمرے میں لگانے کا کہہ دو۔“

میں عبد اللہ کے ساتھ اس کمرے میں آ گیا۔ کافی بڑا کمرہ تھا۔ دو بڑے بڑے تخت بچھے ہوئے تھے۔ ایک

پر میں دوسرے پر وسیم اور سفیر لیٹ گئے۔

میں لیٹا تھا کہ پرسکون ہو کر لائحہ عمل بناؤں گا مگر گزشتہ رات جاگتے ہوئے گزری تھی اور گزشتہ دن میدان

جنگ کی تھکن سے بھرا تھا اس لیے خود بخود آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ میں بے خبری کی نیند میں ڈوب گیا۔

میری آنکھ کھلی تھی عبد اللہ کی پکار پر، وہ آوازیں دے رہا تھا۔ آنکھیں جھپکاتا ہوا میں اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں

مشعل کی روشنی پھیل رہی تھی گویا رات اتر آئی تھی۔

”آپ کو سامیرا نے یاد کیا ہے۔ راجا صاحب بھی موجود ہیں۔“ عبد اللہ کے کہنے پر میں پھرتی سے بستر

سے اتر اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر باہر کی طرف بڑھتے ہوئے وسیم پر نظر ڈالی، وہ دونوں اب تک

سورہے تھے۔

اس کمرے سے نکل کر میں راجا صاحب والے کمرے میں پہنچا۔ راجا صاحب بستر پر نیم دراز تھے اور

سامیرا سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”شہباز یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ تم واپس جانے

کی بات کر رہے ہو؟“

”جی ہاں..... میں کافی عرصے سے اپنوں سے دور ہوں۔ اب دل کر رہا ہے کہ ان سے ملوں۔“

”ہم بھی تو اپنے ہیں..... ہمیں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو۔ ابھی تو میری تاج پوشی بھی نہیں ہوئی۔“ سامیرا نے مسکرا کر کہا۔

”آپ میزے لیے محترم ہیں، عزیز ہیں لیکن کیا کروں وہاں میرے والدین ہیں اور میں اب ان کی جدائی برداشت نہیں کر پار ہا۔ پھر وہاں ایسے کئی کام ہیں جن کو پورا کرنا ضروری ہے۔“

”میری تو یہی خواہش تھی کہ تم کہیں نہ جاتے۔ میرے ہی پاس رہتے لیکن کیا کروں۔ تم نے والدین کا نام لے کر مجبور کر دیا ہے۔ اس لیے میں روک نہیں سکتی لیکن یہ بتا دوں کہ یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ مجھے بھی پتا نہیں۔ اس سلسلے میں اگر کچھ کر سکتے ہیں تو وہ برف کے ہاتھ والے ہیں۔ ان سے گزارش کرو شاید وہ التجاسن لیں۔“

”جب سے آیا ہوں ان سے ملاقات کہاں ہوئی۔“

”وہ وادی میں اترتے نہیں ہیں۔ وہ پہرے دار ہیں اس لیے وہیں اپنے برف کے گھر میں رہتے ہیں لیکن سنتے سب کی ہیں۔ ان تک ہم جب کوئی بات پہنچانا چاہتے ہیں تو ایک خاص مقام ہے وہاں جا کر التجا کرتے ہیں۔ وہ جگہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔“

”پھر میں کیسے وہاں پہنچوں؟“

”میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی اس لیے کہ وہ مقام کسی کو دکھانے نہیں سکتی اور نہ اس مقام کی اہمیت کے بارے میں کسی کو بتا سکتی ہوں۔ مجھے بابا نے اپنے آخری وقت بتائی تھی۔“

”تو کب لے چل رہی ہیں۔“

”وہ مقام زیادہ دور نہیں ہے۔ کچھ اندھیرا پھیل جائے تو سب کی نظر بچا کر ہم چل دیں گے۔“

”یہ میری بھی خواہش ہے کہ شہباز اپنے ادھورے کام کو جا کر پورا کر لے۔ اس لیے کہ وہ کام بھی بہت اہم ہے۔ وہ کام نمٹا کہ اس کے گھر والے سکون کی سانس لیں گے ورنہ زندگی بھرا الجھے رہیں گے۔“ راجا صاحب نے سامیرا سے میری سفارش کی۔

”آپ کہہ رہے ہیں تو میں ابھی لے کر چلتی ہوں۔“ سامیرا اسی وقت راضی ہو گئی۔

میں نے بھی سکون کی سانس لی کہ میں جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں باہر آئے۔ سفیر وغیرہ کو وہیں رکنے کا کہہ کر میں سامیرا کے ساتھ چل پڑا تھا۔

ہم دونوں جب آبادی سے نکلنے لگے تو کچھ سپاہیوں نے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن سامیرا نے منع کر دیا اور میرا ہاتھ تھام کر پہاڑ کی جانب بڑھنے لگی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ دوڑ رہی ہو۔ میں بھی تیز چل رہا تھا۔ ہم دونوں جلد ہی پہاڑ کی ترائی میں پہنچ گئے۔

سامیرا نے ادھر ادھر دیکھا پھر ایک غار کے اندر داخل ہو گئی۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ وہ غار اندر سے صاف ستھرا تھا ایسا لگتا تھا جیسے اس کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ سامیرا ایک کونے کی طرف بڑھی پھر اس نے مجھے اشارے سے بلایا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ زبان پر گویا مہر لگی تھی۔ اس کے اشارے پر میں آگے بڑھا۔ اس نے اشارے سے کونے کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونے کو کہا پھر سرگوشتی

کے انداز میں بولی۔ ”اب تم برف والے کو پکارو۔ اپنی بات کہو۔ اس کا جواب آجائے گا۔“
میں نے اس کے کہے پر عمل کیا اور نسبتاً اونچی آواز میں برف والے کو پکارنا شروع کیا۔ ایک بار، دو بار، کئی بار پکارا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اب مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ میں مزید پکارنے پر روک لگانے ہی والا تھا کہ میرے دماغ میں ایک گونج سی ہوئی اور برف والے کی مانوس آواز بازگشت کی طرح سنائی دی۔ اس نے پوچھا تھا۔ ”تم جانا چاہتے ہو؟“

”جی ہاں۔“ بے اختیار میں نے جواب دیا۔

”کب جانا چاہتے ہو؟“

”اب مجھ سے ایک لمحہ بھی یہاں رکا نہیں جا رہا ہے۔“ میرے دل کی بات زبان پر آگئی۔ ”اپنے حصے کا کام میں نے کر دیا اب مجھے اجازت دی جائے۔“
”صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آجانا۔ میں یہاں سے نکلنے کا راستہ بتا دوں گا۔“

”جی بہتر۔ میں صبح آجاؤں گا۔“ کہہ کر میں نے بند آنکھیں کھول دیں۔ سامیرا غار کے دہانے پر کھڑی تھی۔ اس نے مجھے چہرہ گھماتے دیکھ کر پوچھا.....!
”بات ہوگئی؟“

”جی ہاں۔“ کہہ کر میں نے اپنے قدم بڑھادیئے۔

○.....ختم شد.....○